جدید دور کے مسائل اور
قرآن حکیم
www.KitaboSunnat.com
ڈاکٹر ذاکر نائیک
مترجم: محمد انور
(ایم اے صحافت)

جدید دور کے مسائل اور قرآن حکیم

☆ قرآن اور بائیبل سائنس کی روشنی میں

☆ کیا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؟

☆ قرآن اور جدید سائنس

مترجم

محمد انور آرائیں

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور فون: 0333-4380927

نام کتاب: جدید دور کے مسائل اور قرآنِ حکیم

مترجم: محمد انور آرائیں

پبلشرز: اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن

اہتمام: ایم۔ایس حسین

کمپوزنگ: گل گرافکس

اشاعت: اکتوبر 2008ء

پرنٹرز: نواز پریس، لاہور

قیمت: 300 روپے

لیگل ایڈوائزر

عبدالحفیظ انصاری

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

فہرست مضامین

☆ (۱) قرآن اور بائیبل سائنس کی روشنی میں

پیش لفظ

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے انسانیت کو عطا ہونے والا مکمل ضابطہ حیات ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی کی فوز و فلاح اور آخرت میں نجات کا حق دار بننے کے لیے قرآن مجید کی تعلیمات پر رسول کریم ﷺ کی تشریحات اور تعبیرات کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری خود اس کی نازل کرنے والی ذات اقدس نے لی ہے اور ڈیڑھ ہزار برس سے قرآن اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں بغیر کسی کمی بیشی، تحریف، تبدیلی یا تغیر کے آج تک موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ یہ انسانوں کی طرف نازل کیا جانے والا آخری الہامی صحیفہ ہدایت ہے۔ نبی کریم ﷺ اس کتاب مقدس کو اپنی اُمت کے سپرد کر گئے۔ آپؐ اپنا کار رسالت کا فریضہ ادا کر کے دنیا سے پردہ فرما گئے اور اپنے خالق حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ آپؐ کے بعد صحابہ کبار، پھر تابعین، پھر تبع تابعین اور اسی طرح، محدثین، فقہا، علماء، مشائخ، صوفیا نے دینِ حق کے ابلاغ کا فریضہ جس خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے نبھایا بلکہ نبھانے کا حق ادا کیا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔

آج کے دور میں جہاں اور بہت سے اہلِ علم دینِ حق کی ترویج و اشاعت میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں وہیں برصغیر پاک و ہند کے نہایت قابل فخر سپوت ڈاکٹر ذاکر نائیک کا نام بھی اِسلام کے ترجمان کے طور پر پوری دنیا میں ایک پہچان بن چکا ہے۔ اللہ کریم نے انہیں مطالعے، علم کے استحضار، یادداشت، حافظے، دلیل، منطق اور ہمت و بردباری کے قیمتی زیوروں سے مزین و مرصع فرمایا ہے اور پورے اخلاص، دیانت اور جذبے سے کام لے کر وہ دین حق کے ابلاغ اور تفہیم و تشریح کا فریضہ نہایت احسن انداز سے ادا کر رہے ہیں۔ آج تک ان کے سینکڑوں لیکچرز، خطابات، مناظرے دنیا کے مختلف مقامات پر ہو چکے ہیں۔ Peace ٹی وی چینل دن رات کے چوبیس گھنٹے ان کی مساعی اور کاوشوں کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ان کے قرآن مجید سے متعلق تین خطابات

کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے اِس کتاب کی صورت میں معزز قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرر ہے ہیں۔ان میں ایک تو "قرآن اور بائیبل سائنس کی روشنی میں" ہے۔ ڈاکٹر موریس بوکائیے کے نام سے اہل علم خوب روشناس ہیں۔ان کی شہرہ آفاق تصنیف Bible, Quran and Science پوری دنیا میں اپنی علمی ساکھ کی وجہ سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ڈاکٹر موریس بوکائیے منصف مزاج مستشرق ہیں، انہوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کو جدید سائنسی معلومات کے مطابق پایا جب کہ بائیبل کے بیانات جدید سائنسی حقائق کا ساتھ نہیں دے سکتے۔اس بات کو انہوں نے اپنی اِس مذکورہ صدر کتاب میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ایک غیر مسلم کی طرف سے قرآن کی سچائی اور صداقت کی یہ تصدیق امریکی ڈاکٹر ولیم کیمپبیل کو اچھی نہیں لگی۔انہوں نے اپنی ایک کتاب میں ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب کا رڈ کیا۔ جب کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے امریکہ میں ان سے جا کر اسی موضوع پر مباحثہ کیا اور کامیاب رہے۔ان کا یہی مباحثہ "قرآن اور بائیبل سائنس کی روشنی میں" کے نام سے اِس کتاب میں اُردو کے قالب میں شامل ہے۔اسی طرح "کیا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے" کا ترجمہ ہے اور آخر میں "قرآن اور جدید سائنس" کا اُردو ترجمہ شامل کتاب ہے۔اِس طرح قرآن حکیم کے موضوع سے متعلقہ ان کے خطبات کو ایک جلد میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ ارباب علم ان کے قرآنی افکار اور تشریحات وتعبیرات سے ایک ہی جلد میں استفادہ کر سکیں۔ترجمے کو اپنی بساط کی حد تک سادہ، سلیس، عام فہم اور رواں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اُمید کرتا ہوں کہ اِس کاوش کو ارباب علم ضرور پسند فرمائیں گے۔دُعا ہے کہ رب کریم اِس علمی خدمت کو دین حق کے ابلاغ میں ایک مخلصانہ Contribution کے طور پر قبول فرمائے اور اِسے پڑھنے والوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔(آمین)

محمد انور آرائیں

ملت پارک لاہور

قرآن اور بائیبل سائنس کی روشنی میں

مناظرہ مابین ڈاکٹر ولیم کیمپبیل و

ڈاکٹر ذاکر نائیک

بمقام شکاگو

تقریر

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

ڈاکٹر نائیک کی مہربانی جو آئے...... یقیناً لمبی مسافت کر کے سہیل احمد اور محمد نائیک کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے اور منتظمہ کمیٹی کو خوش آمدید۔

اس کو...... ناگزیر مکالمہ قرار دینا کسی حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ہوگا۔ لیکن یہ ایک اچھی مشہوری ہے۔ آپ حاضرین کو بھی خوش آمدید۔

میں چاہون گا کہ آپ سب کو "یہسو واہ" یا "جیہوواہ" کے اسم سے خوش آمدید کہوں، جو خدائے عظیم خالق ہے اور ہم سے محبت کرتا ہے۔

میری خواہش ہوگی کہ اول الذکر الفاظ کا کروں۔ آج کی رات ہمارا یہ اجتماع الفاظ کے حوالے سے بھی ہے...... بائبل کے الفاظ اور قرآن کے الفاظ کے حوالے سے۔

جدید علم السانیات کے اسکالرز کے نزدیک کوئی لفظ، فقرہ یا جملہ وہ ہی معنی رکھتا ہے جو اس کے بولنے والے اور سننے والے فرد یا افراد کے نزدیک معنی رکھتا ہو۔

قرآن کے معاملے میں اس کے معنی وہ ہی ہوں گے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے سامعین کے نزدیک تھے۔ بائبل کے معاملے میں جو موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ اور ان کے سامعین کے نزدیک تھے۔ اس کو جانچنے کے لیے بائبل یا قرآن میں دیا گیا تمام سیاق وسباق موجود ہے۔ مزید اس صدی کی شاعری اور حروف سے بھی جانچا جا سکتا ہے۔ انجیل کے معنی میں مراد پہلی صدی عیسوی اور قرآن کے معنی ہیں۔ مطلب پہلی صدی ہجری ہے۔

اگر ہم حقیقت کی پیروی کرنے جا رہے ہیں تو الفاظ کو دیگر نئے معانی دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم حقیقت کی تلاش میں سنجیدہ ہیں تو کسی "جائز غلط بیانی" کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

میرے پاس ایک مثال موجود ہے اپنی بات کی اس کو سلائیڈ پر دیکھتے ہیں۔ بات ہے

میرے گھر میں موجود دو لغات کی ایک 1951ء اور دوسری 1991ء میں شائع ہوئی ۔ ہر دو لغات میں Pig کے پہلے معنی کسی بھی جنس کا جوان خنزیر ایک ہیں ۔ دوسرے معنی کوئی Swine یا hog جنگلی یا گھریلو Swine بھی ایک ہی ہیں تیسرے معنی Swine کا گوشت Pork بھی ایک جیسے ہیں ۔ پھر خنزیریں کی عادت و اطوار والا شخص یا جانور بھی ایک جیسے ہیں ۔ ایک شخص جو Gluttonous ہے اور اس کے نیچے Pig فولاد کے لیے کسی Pit میں دھات کا انڈیلنا بھی ہم معنی ہے ۔ لیکن یہاں پر ایک نئے معنی ہیں "پولیس آفیسر" ہم پولیس افسران کو Pig پکارتے ہیں ۔ درست لیکن سوال یہ ہے ۔

توریت میں آپ کو "Pig" "خنزیر کے گوشت کھانے کی ممانعت کی گئی ہے ۔ اور کیا میں یہ مطلب اخذ کروں کہ ہم پولیس افسران کو نہیں کھا سکتے ۔ یقیناً نہیں قرآن میں اللہ کا حکم ہے ۔ "تم خنزیر نہیں کھا سکتے ۔" کیا میں اس کا یہ ترجمہ کروں کہ "پولیس افسران نہیں کھا سکتے ؟" نہیں ۔ یہ غلط ہوگا ۔ ایسا ترجمہ احمقانہ ہونے بلکہ دروغ گوئی ہوگا ۔ محمد (ﷺ) کے نزدیک اس سے مراد پولیس افسران نہ تھا ۔ موسیٰ کے نزدیک بھی "پولیس افسران" نہ تھا ۔

ہم نئے معنی اخذ نہیں کر سکتے ۔ ہمیں پہلی صدی کے معنی ہی لینے ہوں گے ۔ جو معنی پہلی صدی عیسوی میں تھے ۔

انجیل کے معاملے میں الفاظ کے وہی معانی سامنے رکھنے چاہئیں ۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ کے معانی بھی وہ ہی ہوں گے جو پہلی صدی ہجری کے دوران میں استعمال ہوتے رہے ہیں ۔

اب دیکھتے ہیں کہ قرآن "علم جنینیات" Embryology کے بارے میں کیا کہتا ہے ۔ مشہور ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقاء کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے اور یہ کہ قرآن ہمیں ان مراحل کی خبر دیتا ہے ۔

ڈاکٹر کیتھ مورا اپنے کتابچے "انسانی علم الجنینیات کی سرخیاں" رقمطراز ہے ۔

"یوٹیرس میں جنین کے ارتقاء کے مراحل کی وضاحت پندرویں صدی تک نہیں ہوئی تھی ۔"

ہم اس دعوے کی جانچ کے لیے قرآن میں استعمال ہونے والے عربی لفظ کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن سے وابستہ تاریخی حالات کا جائزہ لیں گے ۔ آغاز کرتے ہیں عربی کے لفظ "علقہ" سے جو قرآن میں استعمال ہوا ہے ۔ قرآن میں یہ لفظ واحد عــلـقـة اور جمع "علق" دونوں صورتوں میں چھ بار استعمال ہوا ہے ۔

سورۃ قیامۃ آیت نمبر 36 تا 39 میں بیان ہے۔

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ○﴾ (القیامۃ: ۳۹-۳۶)

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک نطفہ نہ تھا حقیر پانی جو ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے، پھر اس سے دو قسمیں بنائیں۔ مرد اور عورت کی۔“

آیت نمبر 68 میں بیان ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○﴾ (المؤمن:۶۸)

وہ ہی تو ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمہیں نکالتا ہے بچے کی شکل میں پھر بڑھاتا ہے تمہیں کہ پہنچ جاؤ اپنی پوری طاقت کو۔ پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ پہنچو بڑھاپے کو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیئے کیا جاتا ہے کہ تم پہنچو اپنے مقررہ وقت تک اور اس لیئے کہ تم سمجھو حقیقت کو۔

سورۃ حج آیت نمبر 5 میں بیان ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا﴾

”اے لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کچھ شبہ ہے تو

تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی شکل میں نکال لاتے ہیں تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

اور پھر سورۂ مومنون آیات نمبر 12 تا 14۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ o﴾

"ہم نے بنایا انسان کو مٹی کے ست سے۔ پھر اسے تبدیل کیا ٹپکی ہوئی بوند میں ایک محفوظ جگہ، پھر شکل دی اس بوند کو ایک لوتھڑے کی۔ پھر بوٹی بنا دیا لوتھڑے کو، پھر ہڈیاں بنا لیں بوٹی کی، پھر چڑھایا گوشت ہڈیوں پر، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا پس بڑا ہی برکت والا ہے اللہ۔ اچھا سب کاریگروں سے۔"

اور یہاں وہ مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

نُطْفَةً نطفہ

عَلَقَةً Cpot لوتھڑا

مُضْغَةً تکہ گوشت کا

عِظٰمًا ہڈیاں

گزشتہ صدی میں لفظ ''علقہ'' کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں، دس ترجمے یہاں موجود ہیں۔ تین فرانسیسی ترجمے، پانچ انگریزی تراجم جن میں اس کو لوتھڑا یا لوتھڑے کی طرح کا...... Leach کہا گیا ہے۔ایک ترجمہ انڈونیشین زبان میں ہے جس میں سیگان پودار اڈلا ،لوتھڑا یا خون کے لوتھڑے کا نفاذ استعمال ہوا ہے اور آخری پارسی میں ہے ''خون بصفا'' خون کا لوتھڑا۔

ہر وہ قاری جو جس نے انسان افزائش نسل کا مطالعہ کیا ہے بخوبی جانتا ہے کہ تشکیل Fetus میں خون کے لوتھڑے کا کوئی مرحلہ نہیں آتا: تو یہ تو بہت ہی بڑا سائنسی مسئلہ ہے۔

لغت میں اس ''علق'' لفظ کے واحد معنی خون کا لوتھڑا یا جونک ہی ہے جو مونث واحد میں آتا ہے۔

اور شمالی افریقہ میں ہر دو الفاظ کا استعمال ہوتے ہیں میرے پاس بہت سے مریض آئے جو گلے سے بچوں کے لوتھڑے کو نکالنے کا کہہ رہے تھے۔ بہت سی عورتیں حیض شروع نہ ہونے کا بتاتیں۔میرے اس جواب پر چونکے میرے خیال میں یہ حمل ہے میں حیض کی دوائی نہیں دے سکتا تو ان کا موقف ہوتا۔''ابھی تک خون ہے۔''

گویا وہ قراان کے ان تصورات کو سمجھ رہی تھیں۔آخر میں ہمیں چاہیے کہ قرآن کی اول ترین پر بھی غور کرنا چاہیے جو مکہ میں حضرت محمد (ﷺ) پر نازل ہوئی جو سورۃ نمبر 96 کی آیات نمبر 1 اور 2 ہیں۔اور سورۃ کا نام بھی علق ہے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔آیت نمبر 1 تا 2۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o﴾

''پڑھ (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

اس شکل میں ''علق'' کے دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ لفظ ''علق'' فعلیہ اسم کے لفظ ''علاق'' سے ماخوذ ہے۔فعلیہ اسم عموی طور پر انگلش میں (Dejerant) سے ماخوذ ہے۔ (Swiming is afun)

اس لئے ہم اس کے معنی لے سکتے ہیں لٹکنا، چپکنا اور چمٹنا، لیکن اوپر بیان کئے گئے دس تراجم میں کسی میں بھی اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔

تمام نے اس آیت میں بھی لفظ ''علق'' کا ترجمہ ''لوتھڑا'' یا ''جما ہوا خون'' ہی کیا ہے۔ ان مترجمین کی تعداد اور صلاحیتوں کے باوجود فرانسیسی ڈاکٹر موریس بوکا یئے ان کے لیے سخت الفاظ

استعمال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''تحقیقی قرأی کو سب سے زیادہ گمراہ کرنے میں لفظوں کے ذخیرہ کا بڑا دخل ہے۔''

''......ایک اور چیز جو قاری کو گمراہ کر سکتی ہے، وہ لفظوں کا انتخاب ہے۔ مثلاً مترجمین کی اکثریت انسان کی پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے خون کے لوتھڑے کا ذکر کرتی ہے۔ اس کے شعبے میں مہارت یافتہ سائنسدان کے لیے اس قسم کا بیان نا قابل قبول ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افزائش سے متعلقہ قرآنی آیات کی درست تفہیم کے لیے علم اللسان کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے کام لینا کس قدر ضروری ہے۔''

گویا بالفاظِ دیگر ڈاکٹر بوکا لیئے کہنا چاہتے ہیں کہ:

''آج تک میرے سوا کسی نے بھی قرآن کا درست ترجمہ نہیں کیا۔''

ڈاکٹر بوکیلے نے ایسا ترجمہ ہونے چاہیے کہ کیسیوچ لیا جیسا وہ چاہتے ہیں۔ وہ لوتھڑے کی بجائے چپکنے والی چیز سے علق کا ترجمہ کرتے ہیں، اور اس کا مطلب جنین قرار دیتے ہیں جو (Uterus) رحم سے بچہ دانی (Placenta) کے ذریعے جڑ جاتا ہے۔ مگر آپ میں سے تمام خواتین جو کہ حاملہ ہو چکی ہیں بخوبی جانتی ہیں کہ چپکنے والی چیز ساڑھے آٹھ ماہ تک بچہ دانی Placenta میں چپکی رہتی ہے اور ''چبائے ہوئے گوشت'' میں تبدیل نہیں ہوتی۔

تیری بات جو آیات میں بیان کردہ ہے۔

''چبا ہوا گوشت ہڈیوں میں بدل جاتا ہے اور ہڈیوں پر پٹھے چڑھائے جاتے ہیں۔''

گویا معنی یہ ہوئے کہ پہلے ڈھانچہ بنتا ہے اور پھر اس پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بوکا میلے بہ خوبی جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پٹھے اور ہڈیاں بیک وقت تشکیل پانا شروع ہوتے ہیں، آٹھویں ہفتے کے اختتام تک بہت کم ہڈیوں کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے۔ مگر پٹھے حرکت کے قابل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ٹی وی ساڈلر (Embryo Anatomy) کے ایسوی ایٹ پروفیسر اور Longman's Medical Embryology کے مصنف ہیں، ایک خط لکھتے ہیں:

''آٹھویں ہفتے کے آخر تک پسلیاں ابتدائی شکل میں ہی ہوتی ہیں ہڈیوں کی نہیں جبکہ پٹھے موجود ہوتے ہیں۔''

ابھی وضاحت باقی ہے۔

''آٹھ ہفتے پر پٹھے کی حد تک حرکت کر سکتے ہیں۔''

چونکہ دو شہادتیں بہتر ہوتی ہیں لہٰذا ڈاکٹر کیتھ مور سے دوسری شہادت ان کی کتاب ''ارتقا لذیز انسان'' سے پیش کرتے ہیں جس کے ابواب نمبر 15 اور 17 کے اقتباسات سے یہ معلومات ملتی ہیں۔

ہڈیوں کا نظام پٹھوں کے نظام کے ساتھ ساتھ بنتا ہے۔ ہڈی کی ابتدائی نرم ساخت عضلات کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ اعضاء کے پٹھے ہڈیوں کے گرد بیک وقت بننے لگتے ہیں۔

میں نے ایک نجی ملاقات کے دوران ڈاکٹر مور کو ذاتی طور پر ڈاکٹر ساڈلر کا بیان دکھایا اور انہوں نے اسے بالکل درست قرار دیا۔ نتیجہ یہ کوئی مرحلہ ایسا نہیں ہے جس میں ہڈیاں بن چکی ہوں اور پھر ان کے اوپر پٹھے بن رہے ہوں۔ پٹھے تو ہڈیوں کے بننے سے کئی دن پہلے تر ہی موجود ہوتے ہیں اور ہڈیوں کے بننے کے بعد نہیں بنتے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

(ڈاکٹر ولیم کیمپبل یہاں قرآن مجید کے بیان کو نعوذ باللہ غلط قرار دیتے ہیں)

یعنی مسلمہ ابھی حل طلب ہے۔

لفظ علق کے حوالہ پر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مور کی ایک اور تجویز ہے کہ قرآن کی ایک اور آیت میں جونک جیسی سے مراد شکل یا ہیت اور چبائے ہوئے سے مراد انسانی ارتقاء سے ہے۔ ان کے نزدیک مطلب 23 دن اور 30 دن کی عمر کا جنین ہے۔ 23 دن کے جنین کا سائز 3 ملی میٹر ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا آٹھواں حصہ۔ اس کی تصویر ڈاکٹر مور کی کتاب میں دی گئی ہے...... مجھے تو یہ نہیں سے بھی جونک نما معلوم نہیں ہوتی۔

لفظ ''علقہ'' کے ان معانی کے علاوہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ کوئی مثال عربی زبان سے ایسی پیش نہیں کی گئی جس سے اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ثابت ہوتا ہو۔ ہجرت کی آس پاس کی صدیوں سے ایسی مثال پیش کی جانی چاہیے۔ یہ ثابت کرنے کا کہ لفظ عَلَق کا مطلب ایک تین ملی میٹر طویل جنین ہوتا ہے جو کہ چپکا ہوا ہوتا ہے، ایک ہی طریقہ ہے کہ محمد ﷺ کے دور کے زبان و ادب میں سے خصوصاً مکہ و مدینہ و قریش کی بولنے والی محمد عربی سے کوئی مثال پیش کی جائے۔

ایسی مثال پیش کرنا مشکل ہوگا۔ قریش کی عربی زبان کافی تحقیقات سے گزر چکی ہے۔ ابتدائی دور کے مسلم امت کے لیے عربی زبان پر تحقیق ضروری تھی کیونکہ وہ قرآنی الفاظ کا صحیح مغلب جاننا چاہتے تھے اور اسی لیئے انہوں نے اپنی زبان اور شاعری کی طرف کافی توجہ دی۔

اسی سبب 1985ء میں منکالیہ میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیرس کی جامع مسجد کے سابق امام ابوبکر نے حاضرین سے یہ سوال پوچھا۔

''کیا قرآن کی تفہیم پیغمبر اسلام ﷺ کے دور سے آج تک ہمیشہ یکساں رہی ہے؟

اور ان کا جواب تھا: ''قدیم شاعری اس کو مشیت دکھاتی ہے۔''

واحد نتیجہ ہم نکال سکتے ہیں: اگر وہ آیات، جو ہمیشہ مسلمانوں کو روحانی سکون وامید فراہم کرنے کا ذریعہ رہی ہیں، آج بھی اسی طرح ہیں تو پھر ان آیات میں موجود سائنسی بیانات بھی ویسے ہی ہیں تاوقتیکہ کوئی نئی شہادت نہ آجائے۔جیسا کہ اکثر آیات میں معلومات کو نشان قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ مومن آیت نمبر 12 تا 14 میں بیان ہے۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥﴾

''ہم نے بنایا انسان کو مٹی کے ست سے پھر اسے تبدیل کیا ٹپکی ہوئی بوند میں ایک محفوظ جگہ پر پھر شکل دی اس بوند کو ایک لوتھڑے کی ۔ پھر بوٹی بنا دیا لوتھڑے کو، پھر ہڈیاں بنائیں بوٹی کی، پھر چڑھایا گوشت ہڈیوں پر، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا پس بڑا ہی برکت والا ہے اللہ اچھا سب کاریگروں سے۔''

اسی طرح سورۃ حج آیت نمبر 5 میں بیان ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾

''اے لوگو اگر تمہیں موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کچھ شبہ ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے بے شکل بھی تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرا رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی شکل میں نکال لاتے ہیں تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اگر مکہ و مدینہ کے باسیوں کے لیے یہ واضح آیت تھی تو ''علقۃ'' سے ان کے نزدیک کیا مراد تھی جو حیات بعد از مرگ کے نظریہ پر ایمان کے لیے قائل کر سکے۔

جواب جاننے کے لیے ہمیں محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کو جانچنا ہوگا۔ کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم (Hypocrites) سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ 460 قبل مسیح میں یونانی جزیرے (Kuss) میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ ''مراحل'' کے نظریہ کا حامل تھا جس کی تفصیل اس کے نزدیک اس طرح ہے کہ مادہ منویہ پورے بدن سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور کمزور حصوں سے کمزور مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم خون کے جمنے کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کی بدولت ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیونکہ حاملہ ہونے کے ساتھ سلسلہ حیض بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ذکر کرتا ہے ہڈیوں کا۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضاء بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی تشکیل ہوتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

ارسطو کی تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں جانوروں کی نسل پر تحریر شدہ کتاب میں جنین کے مراحل میں وہ مادۂ منویہ وحیض کے خون پر بحث کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو ''خالص'' قرار دیتا ہے۔

یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ ولوازمہ فراہم کرتا ہے جس کی نر کے مادۂ منویہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ گویا مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتی ہے اور پھر اس سے گوشت

تشکیل پاتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزاء سے گوشت اور باقی ماندہ اجزاء سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل ایسا ہی ذکر قرآن میں بھی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں بعدازاں ہڈیوں پر گوشت۔

ہندوستان ادویات کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ 123ء میں شارا کا اور ششرتا کی رائے یوں تھی۔

"ہر دو نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ سکرا اور مادہ کا ایٹریوا کہلاتا ہے۔ ان کے خیال میں جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔"

اب ہم گالن کے نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں جس کی پیدائش 131 عیسوی ہے اور وہ آج کے ترکی میں شامل علاقے میں پیدا ہوا تھا گالن کے مطابق لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن کی سورۃ الدھر آیت نمبر 2 میں ہے۔

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔"

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیونکہ وہ بھی جنین کے ارتقاء کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

مرحلہ اول مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

میں مادہ منوریہ اور خون یکجا ہوتے ہیں، اس مرحلہ میں مختلف اعضا نے ابھی واضح شکل اختیار نہیں کی ہوتی۔ قرآن کی سورۃ الحج آیت نمبر 5 میں یوں کہا گیا ہے:

﴿مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ (الحج:۵)

"پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔"

تیسرا مرحلہ وہ بیان کرتا ہے، جس میں ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا قرآن بھی یہ مرحلہ بیان کرتا ہے۔ سورۃ المؤمنون کی آیت نمبر 14 میں۔

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ

عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾

''پھر شکل دی اس بوند کو ایک لوتھڑے کی، پھر بوٹی بنا دیا لوتھڑے کو پھر ہڈیاں بنا لیں بوٹی کی پھر چڑھایا گوشت ہڈیوں پر۔''

اس دور میں گالن کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ پہلی ہجری صدی کے آغاز کے قریب اسکندریہ میں چار افراد نے علم طب کا ایک سکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا نصاب گالن کی 16 کتابوں پر مشتمل تھا۔ جو تیرہویں صدی عیسوی تک نصاب میں شامل رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے دور میں خطہ عرب کی سیاسی، معاشی اور طبی صورت حال کیا تھی؟

یمن میں کوہِ ہجرہ سے گرم مصالحہ کے تجارتی قافلے مکہ و مدین کے رستے شمالی کی طرف روانہ ہوئے اور یورپ میں داخل ہوتے۔ قریباً 500ء میں شمالی عرب پر (Gazaneeds) کا قبضہ ہو گیا اور 528 تک انہوں نے سریانی صحرا کا کنٹرول سنبھال لیا مدینہ کے بیرونی اطراف تک آرامی زبان کی ایک قسم سریانی جو کہ عربی سے قریب تھی ان کی سرکاری زبان تھی۔ تقریباً 463ء تک یہودیوں نے تورات کا اور پرانے عہد نامہ کا عبرانی سے سیریانی میں ترجمہ کر لیا تھا جس کی ایک نقل برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس طرح Guscians جو کہ مسیحی تھے اور یہودی قبائل کی عرب میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی عرصہ میں سرجیس سہراامائینی جو 536ء میں قسطنطنیہ میں وفات پایا تھا اور یونانی سے سیرک زبان کے ابتدائی عظیم مترجمین میں سے ایک تھا نے گالن کی 26 تصانیف سمیت ادویات کی متعدد کتب کا ترجمہ کیا جو خسرو اول کی عجمی سلطنت اور قبیلہ غسان کے علاقوں میں دستیاب تھیں۔ اس قبیلے کا علاقہ اس زمانے میں مدینے کے نزدیکی بیرونی علاقوں تک پہنچ گیا تھا۔ شہنشاہِ ایران کسریٰ اول کو خسرو اعظم کہا جاتا تھا۔ اس کی فتوحات کا دائرہ یمن تک تھا۔ وہ علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے کئی مدارس بھی قائم کیے۔ ان میں مدرسہ جندی شاپور بھی شامل تھا۔ جو خسرو اول کے طویل 48 سالہ دور اقتدار کے عرصہ میں اپنے وقت کا عظیم ترین علمی مرکز بن چکا تھا۔

مدرسہ جندی شاپور میں یونانی، یہودی، نسطوری، ایرانی اور ہندی افکار پر آزادانہ تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ تعلیم و تدریس زیادہ تر (Syriac) زبان میں ہوتی تھی۔ تراجم کے ذریعے انہیں ارسطو، گالن اور ہاپوٹیٹس کے خیالات و افکار مدرسہ جندی شاپور میں با آسانی دستیاب تھے۔

فاتح عربوں کا اگلا قدم سطوریوں کو یونانی ادویات کے سار یا ک متن کا عربی میں ترجمہ

کے لیے مجبور کرنا تھا جو کہ آسان کام تھا جیسا کہ ہر دو زبانوں کی گرائمر ایک ہی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مقامی طب کی صورتحال کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں طبیب رہتے تھے۔ صحت کے شعبہ میں حارث بن کلادیہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ طبیب تھا، جو چھٹی صدی عیسوی میں طائف میں قبیلہ بنی ثقیف میں پیدا ہوا۔ یمن کے راستے ایران کا سفر کیا اور جندی شاپور کے بڑے میڈیکل سکول میں میڈیکل تعلیم حاصل کی اور ارسطو، ہایپوکریٹس (Hypocrates) اور گالن کی تعلیمات سے مستفید ہوا اور ایران میں ہی حکمت کا آغاز کیا۔ اس کو خسرو کے دربار میں بھی طلب کیا گیا۔ جہاں اس کے شہنشاہ سے طویل گفتگو ہوئی۔

تقریباً اسلام کے آغاز کے وقت وہ خطۂ عرب میں واپس آیا اور طائف میں رہائش پزیر ہو گیا۔ اس دوران یمن کا ایک بادشاہ ابو خیر کسی بیماری کے سلسلے میں اس کے پاس طائف آیا۔ جس نے صحت یاب ہونے پر حارث کو کافی دولت اور ایک کنیز بطور تحفہ عطا کی۔

گو کہ حارث نے علم طب پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اس کے خیالات کئی طبی معاملات پر خسرو سے اس کی گفتگو کی صورت میں محفوظ ہیں۔ آنکھ کے بارے میں اس کی سوچ تھی کہ یہ چربی سے بنی ہوتی ہے یعنی آنکھ کی سفیدی، جب کہ سیاہ حصے کو وہ پانی قرار دیتا ہے۔ اور نظر کو وہ ''ہوا'' قرار دیتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں غلطی پر مبنی ہیں گو کہ یونانی خیالات یہی تھے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حارث کو یونانی علما کے افکار سے آگاہی حاصل تھی۔ اس صورت حال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے Dr. Lucaine la Clerk اپنی کتاب ''Eastword Delamitry Arabs'' میں لکھتے ہیں:

''حارث نے علم طب جندی شاپور میں حاصل کی اور محمد ﷺ کو علم طب کے حوالے سے جزوی معلومات حارث سے حاصل ہوئیں تھیں۔ لہٰذا ہر دو کے ہاں یونانی خیالات کے آثار مل جاتے ہیں۔ محمد ﷺ اکثر مریضوں کا علاج خود کرتے تھے لیکن پیچیدہ امراض کی صورت میں وہ حارث کو بھیج دیا کرتے تھے۔ علم طب کا ایک اور عالم لادن بن حارث بھی گزرا ہے لیکن اس کا طبیب حارث سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محمد ﷺ کا رشتہ دار تھا اور دربارِ خسرو میں حاضر ہو چکا تھا۔ بہر حال وہ محمد ﷺ سے ہمدردی نہیں رکھتا تھا اور اس کو قرآن کے بعض بیانات پر اعتراض تھا۔ محمد ﷺ نے اس کو معافی نہیں دی اور جب جنگ بدر میں گرفتار ہوا تو اسے موت کی سزا دی گئی۔''

گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

☆ 600ء میں مکہ اور مدینہ میں رہنے والے عربوں کے جبشہ یمن ایران اور بازنطینی سلطنت

کے ساتھ سیاسی و معاشی تعلقات تھے۔

☆ محمد ﷺ کا ایک رشتہ دار فارسی زبان اتنی خوب جانتا تھا کہ موسیقی کے حوالے سے اس میں گراں قدر اضافہ کر سکے۔

☆ مدینہ کی سرحدوں تک پھیلے صحرائے شام پر حکمرانی کرنے والے قبیلہ غسان سہارا ئرزبان بولتا تھا جو طبی تقسیم سکھانے کی اہم زبانوں میں سے ایک تھی اور جندی شاپور کے سکول کی سرکاری زبان تھی۔ یمن کا ایک بیمار بادشاہ طائف آیا کہ طبیب حارث بن کلاڈیہ سے رجوع کرے۔

جس نے طب کی تعلیم جندی شاپور کے مدرسے سے حاصل کی تھی جو اس دور میں دنیا بھر میں طب کی تعلیم کا بہترین ادارہ تھا۔ کبھی محمد ﷺ بھی مریضوں کو حارث کے پاس بھیجتے تھے۔

☆ حضرت محمد ﷺ کے دور میں ہی اسکندریہ میں ایک سکول کا طب کی تعلیم کے لیے قیام ہوا تھا، جس کے نصاب میں گالن کی سولہ کتابیں شامل تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممکنات میں شامل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ نے ارسطو ایپوکریٹس اور گالن کے تولیدی نظرات سے آگاہی کے مواقع حاصل کیئے ہوں جب کبھی وہ حارث بن کولاڈا اور دیگر ڈاکٹرز کے پاس علاج کے لیے جاتے تھے۔ لہٰذا جب قرآن مکی سورتوں کے آخری دور میں کہتا ہے۔

لہٰذا جب قرآن مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ایک سورۃ میں کہتا ہے سورۃ المؤمن آیت 67,68۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾

”وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر وہ تمہیں نکالتا ہے بچے کی شکل میں پھر بڑھاتا ہے تمہیں کہ پہنچ جاؤ اپنی پوری طاقت کو پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ پہنچو بڑھاپے کو اور تم میں کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ تم پہنچو اپنے مقررہ وقت تک اور اس لئے کہ تم سمجھو حقیقت کو۔“

اور پھر سورۂ حج آیت نمبر 5 میں بیان ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾

''اے لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کچھ شبہ ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے مٹی سے پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی شکل میں نکال لاتے ہیں تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

ہمارا یہ حق پہنچتا ہے کہ پوچھیں کہ ان کو کیا سمجھنے کا کیا جا رہا ہے؟ کس امر پر غور کا کہا جا رہا ہے؟ یہاں پھر قرآنی مراحل کا ذکر ہے۔

- ☆ نطفہ......Sperm۔
- ☆ علقہ......لوتھڑا۔
- ☆ مضغہ......گوشت کا ٹکڑا۔
- ☆ مقام......ہڈیاں......اور۔
- ☆ ہڈیوں پر پٹھوں کا لپٹنا۔

جواب بلکل واضح ہے صاف ہے۔ ان کا سمجھنا اور غور کرنا اس دور کے گھومتی تھی اس دور کے عمومی علم کے گرد جو یونانی اطباء کی تعلیمات تولیدی مراحل پر مبنی تھا۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن یونانی اطباء کے نام سنے ہوں کے مگر وہ تولیدی ارتقاء کی یونانی اطباء کے بیان کیئے گئے مراحل سے واقف ہوں گے۔

☆ ان کا یقین تھا کہ نر کا مادہ منویہ حیض کے خون سے مل کر اس کو لوتھڑا بنا دیتا ہے۔ جو پنیر کر شکل اختیار کرتا ہے۔

☆ انہیں یقین تھا کہ جنین کی ایک حالت نیم تشکیل شدہ نیم غیر تشکیل شدہ ہوتی ہے۔

انہیں یقین تھا کہ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان پر بھٹہ چڑھتا ہے۔ اللہ ان کی معلومات کو ہی ایک نشانی کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اور یوں سامعین اور قارئین کو دے رہا تھا۔ کہ اس سے رجوع کریں۔

مشکل یہ ہے کہ یہ عمومی علم درست نہیں تھیں اور نہ ہیں۔

محمد ﷺ کے بعد کے دور کے اطباء:

ہمیں لازماً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے ادوار کے مشہور اطباء پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان اطباء کا قرآن پر اثر ناممکن تھا۔ لیکن یہ سولھویں صدی عیسوی تک ارسطو اپوکریٹس اور گالن کے تصورات ہی کی پیروی کرتے رہے۔

بلغرض "علقہ" کا درست ترجمہ "جونک نما شے" میں لیا جائے جیسا کہ بعض جدید مسلمان مثلاً شبیر علی وغیرہ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان اطباء کو بھی یہی کہنا چاہیے لیکن معاملہ اس کے الٹ تھا۔ یونانی اطباء کے نظریات کی مدد سے قرآنی بیانات کی وضاحت کی جارہی تھی اور قرآن کے اس قسم کے معانی بیان کیے جاتے تھے جو یونانی نظریات کی تائید میں ہوں۔

مثال کے طور پر ابن سینا کے کہنا ہے کہ جنین کی تشکیل دو اجزاء سے ہوتی ہے۔ مردانہ مادۂ منویہ جو فاعل کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے زنانہ مادۂ منویہ جو پہلے حیض کے خون کا جزو ہوتا ہے اور مادیہ منویہ کی تشکیل کے لیے مادہ فراہم کرتا ہے۔

اس طرح ہمارے سامنے ہے کہ ابن سینا زنانہ مادۂ منویہ کو وہی کردار دیتا ہے جو ارسطو نے حیض کے خون کو دیا تھا۔ ابن سینا کو جو اہمیت اور استناد قدیم یورپ میں سائنس اور فلسفے کے حوالے سے حاصل تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

دیکھتے ہیں ابن قیم الجوزیہ کی طرف ابن قیم نے یونانی طب اور قرآنی بیانات کی مطابقت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ بقراط کی کتاب الاجنہ کے باب سوئم کا حوالہ دیتا ہے جس میں بقراط رقمطراز ہے کہ:

"مادہ منویہ ایک جھلی میں پڑا ہوتا ہے جو ماں کے خون سے پرورش پاتا ہے جو رقم میں

نیچے اترتا ہے۔ بعض جھلیاں آغاز میں تکمیل پا جاتی ہیں بعض دوسرے اور کچھ تیسرے ماہ میں۔"

ہم نے دیکھا، کہ ماں کے خون کے رحم میں جانے کی بات بقراط نے بھی کی ہے۔ یہی بات قرآن بھی کہتا ہے: سورۃ الزمر آیت نمبر 6 میں۔

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾

"وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔"

بعد ازیں ابن قیم اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ ہر جھلی کی اپنی تاریکی ہوتی ہے اور قرآن میں خدا جب ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ارتقا کو مذکور کرتا ہے تو ان تین تاریک پردوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔

کافی مفسرین اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پہلی تاریکی پیٹ کی، دوسری رحم مادر کی اور تیسری جنین پر لپٹی ہوئی جھلی کی ہوتی ہے۔

اب ہم دوسری مثال دیکھتے ہیں جیسا کہ بقراط نے کہا:

منہ جبلی طور پر کھلتا ہے
ناک کان کی تشکیل کے بعد کان
کھل جاتے ہیں اور پھر شفاف سیال سے بھرپور آنکھیں۔

"منہ کھل جاتا ہے، ناک اور کان بن جاتے ہیں پھر کان کھل جاتے ہیں اور پھر آنکھیں جو ایک شفاف سیال سے بھری ہوتی ہیں......"

جب کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ:

"میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس نے میرا مکمل چہرہ بنایا مجھے سماعت بخشی اور بینائی عطا کی......"

یہاں بقراط پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں جو دوسرے مرحلے کے حوالے سے ہے۔ ابن خیم بقراط کا حوالہ دیتے ہوئے ماں کے خون کو ناف کے گرد اترتا ہوا اتلاتا ہے۔

ان کا ایسا کرنا ممکن تھا جیسا کہ ہم نے دیکھا چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تعلیم یافتہ لوگ یونانی طب سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن ہمارے لیے آج کے تناظر میں ضروری امر یہ ہے کہ

قرآن کسی بھی جگہ یونانی علم طب کی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ ابن قیم کہیں اس بات کا اعلان نہیں کرتا کہ ''نہیں، تم سب غلط کہہ رہے ہو علقہ کا مطلب تو چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہوتا ہے۔'' اس کے برعکس وہ قرآن اور یونانی علم طب کی مطابقت اور مشابہت کے شہوت پیش کرتا ہے۔ اور ان کی یہ مطابقت غلطی پر ہے۔ یعنی وہ ایک غلطی پر متفق ہیں۔ آخری شہادت بیضاوی کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر 1200ء میں لکھی گئی۔ جس میں علقہ کا مطلب ''جما ہوا خون'' بتایا گیا ہے۔ پھر گوشت کی بوٹی، جس کی جسامت بس اس قدر ہوتی ہے کہ جسے چبایا جا سکے، اور اسی طرح آگے بات چلتی ہے۔

آغاز میں جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں عمومی خیال یہ ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے۔ اور یہ کہ قرآن نے ان مراحل کا ذکر کر کے جدید علم الجنین کی معلومات چودہ سو برس پیشتر ہی پیش کر دی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ ارسطو، قدیم ہندو اور گالن وغیرہ بھی ان مراحل سے قرآن سے ہزاروں سال قبل واقف تھے اور انہوں نے ان مراحل پر گفتگو بھی کی ہے۔

بعد از قرآن ہم دیکھتے ہیں کہ وہی نظریات جو یونانی علما نے اور قرآن نے بیان کیے تھے، ابن سینا اور ابن قیم تک پہنچے اور بعینہٖ گالن کی تعلیم کی طرح پہنچے۔

جہاں تک ہڈیوں کا تعلق ہے، اس حوالے سے بھی ہم نے بات کی اور جیسا ڈاکٹر مور نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ پہلے پٹھے بنتے ہیں اور اسی دوران ہڈی بھی اپنی ابتدائی صورت میں تشکیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ہڈیوں کے ڈھانچہ بن جانے اور اس پر گوشت چڑھنے کا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ لفظ ''علقہ'' کے معنی لوتھڑا ہوتے ہیں اور یہ کہ محمد ﷺ کا قریش سے کہنا کہ جنین کے ارتقا میں عورت کا حصہ حیض کے خون کی صورت میں ہوتا ہے تو یہ بات ان کے لیے قابل فہم تھی۔

پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قرآن کا یہ بیان کہ انسان نطفے سے اور پھر خون کے لوتھڑے سے بنتا ہے، پہلی صدی ہجری کی سائنسی صورت حال کے عین مطابق تھا۔ یعنی جب قرآن سامنے آیا اس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھا۔ لیکن جب مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ساتھ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہپوقریطس غلطی پر ہے، ارسطو غلطی پر ہے، گالن غلطی پر ہے اور قرآن بھی غلطی پر ہے۔ (نعوذ باللہ) یہ سب ایک بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔

اب ہم تھوڑا ذکر ''چاندنی'' کا کریں گے۔ کیا قرآن واقعی یہ بتاتا ہے کہ ''چاند کی چاندنی

سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے۔" اور اس دور میں جب کہ لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہوا تھا؟

سورۂ نوح میں کہا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (نوح:١٦-١٥)

"کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟"

یہاں چاند کو "نور" اور سورج کو چراغ یعنی "سراج" کہا گیا ہے۔ بعض مسلمان یہ دعوے کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن میں سورج اور چاند کی روشنی کے لیے مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لیئے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ سورج اپنی روشنی خارج کرتا ہے جب کہ چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ شبیر علی نے یہ دعوے اپنے کتابچے جبکہ ڈاکٹر ذاکر نے اپنے خطاب میں پر زور طریقہ سے کیا ہے۔

"کیا قرآن کلام الٰہی ہے۔" کے عنوان سے اپنی ویڈیو میں ذاکر نائیک صاف کہتے ہیں۔

ویڈیو کلیسینگ ڈاکٹر ذاکر:

"چاند سے آنے والی روشنی کہاں سے آتی ہے؟ جواب ہوگا کہ قبل ازیں ہم سوچتے تھے کہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج سائنسی ترقی کی وجہ سے ہمیں علم ہے کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے۔ یہاں میں ایک سوال پوچھوں گا۔ قرآن مجید کی سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:"

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ (الفرقان:٦١)

"پاک ہے وہ جس نے آسمان میں جھرمٹ بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔"

عربی میں چاند کے لیے لفظ قمر مستعمل ہے اور اس کی روشنی کے لیے لفظ منیر استعمال کیا گیا ہے جو کہ منعکس روشنی یا "نور" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بیان قرآن یہ ہے کہ چاند کی روشنی

منعکس روشنی ہے آپ کہتے ہو کہ آپ نے یہ بات آج دریافت کی ہے تو پھر قرآن یہ بات 1400 برس پہلے کر چکا کیسے بیان کی؟ وہ کچھ تامل کے بعد کچھ دیر سے ممکنہ طور پر کہے گا...... "شاید یہ ایک حسن اتفاق ہے۔" "میں اس کے ساتھ بحث نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر کیمپبل کا جواب:

ویڈیو کے آخری حصے میں ہم نے ڈاکٹر ذاکر کی یہ وضاحت سنی کے عربی میں چاند کو قمر کہتے ہیں اور اس کی روشنی کے لیے لفظ منیر ا استعمال ہوا ہے جو جس کے معنی مستعار لی گی روشنی یا نور یا منعکس شدہ روشنی ہے دعوے' صرف اتنا ہی نہیں کہ سائنسی حقائق بمطابق حقائق ہونا چاہیے بلکہ اس کا ایک معجزاتی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات کہ چاند کی روشنی منعکس ہوتی ہے نسبتاً حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔

یہ درست ہے کہ چاند اپنی روشنی خارج نہیں کرتا بلکہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ لیکن یہ تو محمد ﷺ کے دور سے ایک ہزار برس پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ اور کوئی جدید دریافت نہیں تھی ۔ارسطو نے 360 ق م میں ہی چاند پر زمین کا سایہ پڑنے کا ذکر کیا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور چاند پر سایہ پڑنے کا ذکر وہ اسی صورت میں کر سکتا تھا اگر اسے چاند سے روشنی خارج نہیں ہونے کا علم تھا۔ اگر آپ اس کے باوجود اسے معجزہ قرار دینے پر مصر ہیں تو پھر ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ قرآن سے بذات خود بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟

پہلے لفظ "سراج" پر غور کریں گے۔

سورۃ نوح جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ میں یہ لفظ سب سے پہلے استعمال ہوا۔ سورۃ فرقان سورہ نمبر 25 آیت نمبر 61 میں لفظ چراغ سورج کے لیئے استعمال ہو رہا ہے۔ سورہ النباء میں جہاں ﴿سِرَاجًا وَّهَّاجًا﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی "نہایت روشن اور گرم چراغ۔"

لفظ "نور" اور "منیر" ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ لفظ منیر قرآن میں چھ بار استعمال ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران، سورۂ حج، سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں ایک اصطلاحی استعمال ہوئی "کتاب المنیر" جس کا ترجمہ پکتھال نے (The Scripture giving Light) اور عبداللہ یوسف علی نے (A Book of Enlightment) کیا ہے۔ واضح ہے کہ یہاں معنی علم کی روشنی پھیلانے والی کتاب ہے اور "منعکس روشنی" کا بالکل ذکر نہیں۔ نور کا لفظ سورۂ نوح اور سورۂ یونس میں استعمال ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ "وہی ہے جس نے چاند کو نور بنایا۔" یہاں خود چاند کو روشنی بتایا جا رہا

ہے اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ چاند منعکس کردہ روشنی پھینکتا ہے۔

نیز بعض دیگر آیات میں خود اللہ کو نور قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ نور میں قرآن کا ایک خوبصورت بیان ہے، جس میں کہا گیا ہے۔

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو اور نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی بھڑکا پڑتا ہو، چاہے اس کو آگ نہ لگے۔''

بس ہم دیکھتے ہیں کہ ''نور'' کا لفظ چاند کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اللہ کے لیے بھی۔
تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا نور بھی منعکس نور ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن اگر آپ اس پر مصر ہیں کہ ''نور'' منعکس یا ''مانگی ہوئی روشنی'' ہی کو کہتے ہیں تو پھر ہم متذکرہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ تو پھر اس روشنی کا ''سراج'' یا اصل منبع کیا ہے، جس کا نور اللہ ہے؟

ذرا سوچیے؟
اگر اللہ کو ''نور'' بتایا گیا ہے تو پھر ''سراج'' کون اور کیا ہے؟ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ''سراج'' کون ہے؟ لیکن قرآن کا جواب آپ کو چونکا دے گا۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ (الاحزاب:۴۶،۴۵)

''اے نبیؐ! ہم نے تمہیں بھیجا ہے، گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

مذکورہ آیت میں محمد ﷺ کو ''روشن چراغ'' کہا گیا ہے۔ عربی میں ''سِرَاجًا مُّنِیْرًا'' کے

الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔لسانی اور روحانی ہر دو لحاظ سے یہاں بحث ختم ہو جاتی ہے۔لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''سراج'' اور ''منیر'' کے الفاظ ایک ساتھ اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی محمد ﷺ کی روشن شخصیت کے لیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ منیر کا لفظ اس آیت میں ''منعکس روشنی'' کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ استعمال نہیں ہوا، بلکہ کسی بھی آیت میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ کے معنی صرف ''روشن'' ہے۔محمد ﷺ کے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ چاند روشن ہے اور درست سمجھتے تھے، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے لوگ سورج کو برتر روشنی اور چاند کو کم تر روشنی سمجھتے تھے اور وہ بھی ٹھیک سمجھتے تھے۔

لیکن اگر آپ اپنی بات پر اصرار کریں گے کہ عربی لفظ ''نور'' کا مطلب ''منعکس روشنی'' ہی ہوتا ہے تو پھر قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ محمد ﷺ سورج کی طرح اور اللہ چاند کے مانند ہے۔کیا ڈاکٹر ذاکر نائیک واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محمد وروشنی کا اصل ذریعہ ہیں اور اللہ اس روشنی کا عکس ہے؟

ایسے نام نہاد سائنسی دعوے کیوں کیئے جاتے ہیں جن کو ایسے مسلمان کی حمایت بھی حاصل نہیں ہوتی جس نے قرآن کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہو۔اس قسم کے مکالمے میں جیسا کہ آج رات ہے ایماندارانہ بحث مشکل بلکہ تقریباً ناممکن بن جاتی ہے۔

بات کو جاری رکھے ہوئے ''آبی چکر'' پر نظر ڈالتے ہیں۔بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن ہمیں جدید سائنس سے پہلے ہی آبی چکر کے بارے میں معلومات فراہم کر چکا تھا۔

آبی چکر ہوتا کیا ہے؟

آبی چکر چار مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔

اول مرحلے میں سمندر اور زمین پر موجود پانی سے بخارات بن کر اٹھتے ہیں۔

دوئم مرحلے میں یہ بخارات بادلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔سوئم مرحلے میں بادلوں سے بارش ہوتی ہے اور چہارم مرحلے میں اس بارش کی وجہ سے نباتات اگتی ہیں۔ یہ سب کچھ بڑا سیدھا معلوم ہوتا ہے اور دوئم سوئم اور چہارم مرحلے کے بارے میں تو ہر کوئی جانتا ہے۔شہروں میں رہنے والے لوگ بھی خوب جانتے ہیں کہ بادل آتے ہیں پھر بارش ہوتی ہے اور پھر پودے بڑھتے ہیں۔البتہ بات اول مرحلے کی ہے یعنی بخارات اٹھنے کی، کیونکہ یہ عمل ہمیں نظر نہیں آتا، یہی مرحلہ مشکل ہے اور اسی مرحلے کا ذکر قرآن میں نہیں۔اب ہم بائبل کی طرف آتے ہیں، بائبل میں ایک پیغمبر جس کا تعلق 700 ق م سے ہے، کہتا ہے:

''وہی ثریا اور جبار ستاروں کا خالق ہے جو موت کے سایہ کو مطلع نور اور روزِ روشن کو شب دیجور بنا دیتا ہے اور سمندر کے پانی کو بلاتا ہے۔

اول مرحلہ:

اور روئے زمین پر پانی پھیلاتا ہے۔

مرحلہ سوم:

جس کا نام خداوند ہے۔'' (عاموس: 2:8)

یہاں پہلے اور تیسرے مرحلے کا ذکر موجود ہے۔

ایک اور نبی ایوب علیہ السلام ہیں جن کا زمانہ سنہ ہجری کے آغاز سے کم از کم ایک ہزار سال قبل کا ہے، وہ کہتے ہیں:

''خدا کتنا عظیم ہے کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اس کی موجودگی کے عرصہ کا تعین ناممکن ہے۔''

اول مرحلہ:

وہ قطراتِ آب کو اوپر اٹھاتا ہے۔

جو بخارات بن کر بارش کی صورت میں برسنے لگتے ہیں (مرحلہ سوئم) جو اپنی نمی نیچے انڈیلتے ہیں اور انسان پر کثرت سے برساتے ہیں۔''

پس دیکھتے ہیں کہ پہلے یعنی سب سے مشکل مرحلے کا بیان قرآن سے ہزار سال بائبل میں موجود ہے آگے چل کر پہاڑوں کے ذکر کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن میں ایک درجن سے زائد آیات میں بیان ہے کہ اللہ نے مضبوط اور نا قابل حرکت پہاڑوں کو زمین پر جمایا ہے۔ ان میں سے بعض آیات میں پہاڑوں کو مسلمانوں کے لیے رحمت اور کافروں کے لیے خبرداری قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ لقمان میں بیان ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ

مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تا کہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اس آیت میں پہاڑ چھ خبرداروں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح سورۃ انبیاء بیان کیا گیا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

سورۃ نحل میں بیان ہے:

﴿وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (النحل: ۱۵)

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

اگلی دو آیات میں ایک اور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۃ النباء میں کہا گیا:

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝﴾

(النباء: ۸-۶)

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

﴿ اَوْتَادًا﴾ وہ میخیں ہوتی ہیں جو خیمہ گاڑنے کے کام آتی ہیں۔اسی طرح سورۂ غاشیہ میں کہا جاتا ہے:

﴿ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ [۱۸] وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝﴾ (الغاشیہ:۱۹-۱۸)

''(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

پہاڑوں کے لیئے استعمال کیئے گئے لفظ ''رواسیہ'' سے ایک تیسری شکل سامنے آتی ہے۔ یہ لفظ عربی لفظ ''ارسہ'' سے ماخوذ ہے اور یہ ہی مصدر عربی زبان میں لنگر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لنگر پھینکنا یا ڈالنا کے لیے عالتہ الرسا کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یعنی جہاز کو حرکت سے روکنے کے لیے لنگر ڈالنے کی مانند ہم نے زمین کو لرزنے سے روکنے کے لیے پہاڑوں کو ڈالا ہے، یعنی یہ واضح ہو گیا کہ محمد (ﷺ) کے پیروکار یہ سمجھتے تھے کہ پہاڑ خیمے کی میخوں کی طرح پھینکے گئے ہیں۔ کہ جس طرح خیمے کو یا لنگر ے جہاز کو روکا جاتا ہے اس طرح زمین کو ہلنے سے یا زلزلوں سے روکیں گے۔ مگر حقیقتاً یہ جھوٹ ہے۔ (نعوذ باللہ) پہاڑوں کی تشکیل تو زلزلوں کا موجب بنتی ہے۔

اس لیئے یہ آیات یقیناً ایک مسئلہ کھڑا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر موریس بوکا میلے نے اس کو تسلیم کیا تھا اور اس کو اپنی کتاب 'بائبل، قرآن اور سائنس' میں زیر بحث بھی لائے ہیں۔ پہاڑوں کے حوالے سے مذکورہ بالا آیات کے بعد وہ رقمطراز ہیں کہ جدید ماہرین ارضیات کے مطابق زمین میں خلاء پہاڑوں کو بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔ اور سطح ارضی کی مضبوطی کا سبب یہی نقائص ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے جب ارضیات کے پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ اے یونگ سے سوال کیا گیا تو ان کا جواب تھا کہ:

''گو کہ یہ امر درست ہے کہ بہت سے پہاڑی سلسلے تہہ شدہ چٹانوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ تہیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں لیکن یہ بات غلط ہے کہ ان تہوں کی وجہ سے سطح ارضی کو استحکام ملتا ہے بلکہ یہ تہیں بذاتِ خود چٹانوں کے عدم استحکام کی نشانی ہوتی ہے۔''

الفاظ، دیگر پہاڑ زمین کے استحکام کا موجب نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس ان کی تشکیل زمین کے لرزنے کا سبب بنتی رہی ہے اور آج بھی بنتی ہے۔ جدید وقت کے نظریاتِ ارضیاتی کی روشنی

میں دیکھا جائے تو زمین کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ٹھوس سطح زمین درحقیقت مختلف تہوں اور حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تہیں ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت میں رہتی ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ تہیں علیحدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ جس کی مثال شمالی اور جنوبی امریکہ کی یورپ اور جنوبی افریقہ سے علیحدگی ہے۔ اسی طرح کبھی برعکس اس کے ہوتا ہے کہ یہ تہیں ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، جس کے نتیجے میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مشرق وسطیٰ میں ملتی ہے جہاں پلیٹ عرب کی ایران کی جانب حرکت کے نتیجے میں ایک پہاڑی سلسلے کی تشکیل ہوئی۔ دنیا کے مختلف خطوں میں سڑک کے راستے سفر کرتے ہوئے ایسی پہاڑیاں نظر آتی ہیں جن پر ریت کے طوفانوں کے سبب افقی تہیں بن گئی ہوں اور پھر وہ افقی تہیں 75 درجے کے زاویہ تک ترچھی ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں کی تشکیل کے عمل میں زلزلوں کی آمد کے سبب یہ تہیں ترچھی ہو گئیں۔ بعض اوقات ایک دوسرے پر چڑھ کر یہ تہیں پھسلنا شروع ہو جاتی ہیں اور ایک بڑی قوت معرض وجود میں آتی ہے ۔ جب رگڑ کی قوتیں خاموش ہو جاتی ہیں تو تہہ کا جڑا ہوا حصہ آگے کی طرف ہلتا ہے جو زلزلے کا باعث بنتا ہے۔

حساب کے مطابق کوکوسپلیڈ میکسیکو میں آنے والے ایک حالیہ زلزلے سے ایک تہہ پورے تین میٹر تک اچھلی تھی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کا گھر یکدم تین میٹر اچھلے تو کیا قیامت برپا ہو گی؟ ایک دوسری قسم کے پہاڑ آتش فشاں کے ذریعے بنتے ہیں۔ زمین کے اندر سے لاوا اور راکھ قوت کے ساتھ یوں نکلتا ہے کہ ان سے ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ ایسا پہاڑ سمندر کی تہہ سے بھی مل سکتا ہے۔

سلائیڈ دکھائی جاتی ہے:

اوپر کی سمندری تہہ براعظم کی تہہ کے نیچے سرکتی ہے جہاں پہاڑ بنتے ہیں۔ کسی آتش فشاں پہاڑ سے پگھلی ہوئی چٹانوں کا مادہ اور کسی سے سیال مادہ اگلتا ہے، جو پہاڑوں کی تشکیل اور زلزلوں کا سبب بنتے ہیں۔ آتش فشاں کے دہانے میں پھنس جانے والی پگھلی ہوئی چٹان پہاڑ کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتی۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لاوے کے دباؤ سے ایک سطح ابھرتی ہے مگر نہیں پھٹتی ایسی جگہ پر جب دباؤ بڑھتا تو یہ پھٹ جاتی ہے جسے آتش فشاں کا پھٹنا کہتے ہیں۔ مثلاً ایسا ایک واقعہ جنوبی بحرالکاہل میں کریکاٹو کے مقام پر 1883ء میں ہوا تھا۔ جس میں ایک پورا جزیرہ ہی پھٹ گیا

تھا۔اسی طرح ماؤنٹ سینٹ ہیلینا کے واقعے میں بھی ایک پورا پہاڑ ہی پھٹ گیا تھا۔

مذکورہ بالا معلومات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پہاڑوں کی تشکیل ماضی میں بھی سطح زمین کی حرکت اور زلزلوں کے باعث ہوئی تھی اور حال میں بھی ایسا ہی ہے جس کا نتیجہ زلزلوں کی صورت میں سامنے آتا ہے سطح ارضی کی تہیں کے ایک دوسرے سے رگڑ کھانے سے زلزلے آتے ہیں۔اسی طرح آتش فشاں بھی زلزلے کا موجب ہوتے ہیں۔مگر یہ بات بھی واضح ہے کہ محمد ﷺ کے پیروکاروں کے لیے ان آیات کا سے مراد یہ تھی کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑا ہے، میخوں کی مانند یا لنگر کی طرح، تا کہ زمین حرکت نہ کرے اور مستحکم رہے۔ پہاڑوں کو زمین میں گاڑا ہے، میخوں کی مانند یا لنگر کی طرح، تا کہ زمین حرکت نہ کرے اور مستحکم رہے۔ پہاڑوں کو زمین میں گاڑے جانے کی بات تو شاید شاعرانہ انداز کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بیان کہ پہاڑ زمین کو حرکت سے بچاتے ہیں، ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔جو کہ جدید سائنس کی رُو سے غلط ہے۔

مختصراً ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن سورج کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے؟

سورۂ کہف میں کہا گیا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا﴾ (الکھف:۸٦)

”حتیٰ کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا، تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور وہاں اسے ایک قوم ملی۔ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔“

پھر سورۂ فرقان میں یہ بھی کہا گیا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ۝﴾

(الفرقان:۴٦-۴۵)

”تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو

اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے جاتے ہیں۔''

اگر ہم اس طرح خیال میں جب سورج ہمارے سر پر ہوتا ہے تو سایہ نہیں ہوتا یا نہ ہونے جیسا ہوتا ہے۔مگر جوں جوں سورج آگے بڑھتا ہے اس کے مخالف سمت میں سایہ طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ سورج تو زمین کے لحاظ سے ساکن ہے۔زمین کی گردش اصل میں سائے کے گھٹنے یا بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔گویا زمین کی حرکت سائے کو کم کرنے اور زیادہ کرنے کا موجب ہوتی ہے:

ایک مختلف عنوان پر بات کرتے ہیں۔

قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے فوت ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی وفات کا جنوں کو پتہ اس وقت چلا جب ان کے عصا کو گھن لگ گیا۔اور وہ گر پڑے۔

گویا صورت حال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کا جسم عصاء کے بل پر کھڑا ہے۔کوئی باورچی ان کے پاس نہیں آتا کہ پوچھے، حضرت آج کیا کھانا ہے کوئی جنرل احکامات لینے نہیں آتا۔کوئی درباری آکر یہ نہیں کہتا کہ شکار پر چلیں۔میرے لیے یہ کہانی ناقابل یقین ہے کیونکہ بادشاہ کو کبھی بھی تنہا چھوڑا نہیں جا سکتا۔

''دودھ'' کا جائزہ لیتے ہیں۔سورۂ نحل میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ٥﴾

(النحل:٦٦)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم تمہیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

پیٹ میں سے؟ جہاں آنتیں ہوتی ہیں؟ معاف کیجئے گا۔بیسویں صدی کے علم طب کے مطابق دودھ کے غدود جن میں دودھ بنتا ہے، ان کا آنتوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ دودھ کے غدود جلد کے نیچے ہوتے ہیں۔چھاتیوں اور آنتوں میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔فضلات جسم کے اندر ہو کر بھی

سسٹم سے باہر ہوتے ہیں جس کا دودھ اور کسی چیز سے تعلق نہیں جانور تو اسے خارج کر چکا ہوتا ہے۔

ایک اور موضوع کی طرف چلتے ہیں۔سورۃ انعام میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴾

(الانعام:۳۸)

"زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔"

میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ قرآن ہم انسانوں کے بارے میں بیان ہے۔ درست طور پر بعض مکڑے اس قسم کے ہیں کہ نر اور مادہ کے ملاپ کے بعد مادہ نر کو کھا جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی نے مجھے نہیں کھایا۔ اسی طرح شہید کی مکھیاں زائد از ضرورت نروں کو نکال باہر کرتی ہے۔ مجھے اس پر بھی خوشی ہے کہ 4 بچوں کی پیدائش کے بعد بھی میری بیوی نے مجھے باہر نہیں نکالا آخر میں شیر۔ جب شیر بوڑھا ہوتا ہے یعنی نر شیر بوڑھا ہوتا ہے تو جوان شیر اس کی بیویوں سے اسے دور بھگا دیتا ہے۔ لیکن شیر کے بچوں کا کیا ہوتا ہے؟ وہ ان کو مار دیتے ہیں۔ لہٰذا میں اس نقطہ نظر کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ تمام جانور اور دیگر برادریاں اس طرح نہیں رہتیں جیسے ہم رہتے ہیں۔

نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قرآن میں بہت سی سائنسی اغلاط ہیں۔ (نعوذ باللہ) عمومی طور پر قرآن ساتویں صدی عیسوی کے سائنسی نظریات کا عکاس ہے۔ ہم یہاں سچ کی تلاش میں آئے تھے۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی کہ درست معلومات پیش کروں۔ اگر آپ تمام حوالہ جات دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "قرآن اور بائبل تاریخ اور سائنس کی روشنی میں" ملاحظہ کریں۔ تمام سچائیوں کا خدا آپ کی رہنمائی کرے۔ آپ کی مہربانی۔

ڈاکٹر محمد:

ڈاکٹر کیمپبل آپ کی تقریر کی مہربانی اب میں برادر سہیل احمد سے گزارش کروں گا کہ اگلے مقرر ڈاکٹر ذاکر نائیک کا تعارف پیش کریں۔

برادر سہیل احمد:

اسلام وعلیکم ورحمۃ اللہ۔ میرے لیئے باعث مسرت ہے کہ موجودہ دور کے بہترین سکالرز میں سے ایک ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک کا تعارف پیش کروں۔ 34 سال کی عمر اور اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن بمبئی بھارت کے صدر ہیں۔ اگر چہ طبی ڈاکٹر ہیں لیکن ایک عالمی مقرر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اسلام اور تقابلی مذاہب میں ڈاکٹر ذاکر نائیک اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرتے ہیں۔ ان کا موقف قرآن حدیث، دوسری مذہبی کتب نیز سائنسی حقائق اور منطق کے مطالعہ سے اخذ ہوتا ہے۔

وہ اپنے تنقیدی تجزیئے اور حاضرین کی طرف سے چیلنج شدہ سوالات کے سہل جوابات دینے کے حوالے سے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک دنیا میں 400 سے زائد لیکچر دے چکے ہیں۔ بین الاقوامی اور سیٹلائیٹ ٹی وی چینل پروگرامز میں پیش ہوتے ہیں۔ اسلام اور تقابلی ادیان پر کتب تحریر کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد:

میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہر دو مقررین کی تقاریر اور جوابات کے بعد کھلے سوالات و جوابات کا سیشن ہوگا۔ مائیک پر سوال کیئے جائیں گے اور پھر انڈیکس کارڈز پر۔ خواتین و حضرات میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کو تقریر کی دعوت دیتا ہوں۔

تقریر ڈاکٹر ذاکر نائیک:

ڈاکٹر ذاکر نائیک محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل، ڈاکٹر مارکوس، ڈاکٹر جمال براور، سیموئیل نعمان، ڈاکٹر محمد نائیک اور میرے محترم بھائیو اور بہنو، میں آپ سب کو اسلامی طرز سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میری دعا ہے کہ آپ سب پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔

"قرآن اور بائبل جدید سائنس کی روشنی میں۔"

عظیم قرآن آخری اور مکمل وحی ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ ہر وہ کتاب جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل

ہے اسے وقت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے۔

پہلے کے پرانے ادوار معجزات کے ادوار تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ قرآن پاک معجزوں کا معجزہ ہے۔ اس کے بعد ادب وشاعری کا دور آیا۔ تمام مسلم و غیر مسلم اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ روئے زمین پر عربی ادب کا بہترین نمونہ قرآن ہے۔ آج کا دور سائنس وٹیکنالوجی کا دور ہے۔ دیکھتے ہیں کہ قرآن جدید سائنس سے مطابقت میں ہے یا نہیں؟

البرٹ آئن سٹائن کے مطابق:

''مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر اندھی ہے۔''

سب سے پہلے تو میں آپ کو یاد دہانی کرانا چاہوں گا کہ قرآن عظیم سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ نشانیوں کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے زیادہ نشانیاں یعنی آیات ہیں جن میں سے ایک ہزار سائنس سے متعلق ہیں۔

سائنس اور قرآن کے بارے میں میری گفتگو ایسی سائنسی حقائق تک محدود ہوئی جو ثابت شدہ ہوں۔ مفروضوں اور اندازوں پر مبنی سائنس نظریات کے حوالے سے بات نہیں کروں گا، جو کسی ثبوت پر مبنی نہ ہوں کیونکہ جیسا کہ ہم سب کو علم ہے کہ سائنس ٹرن بھی لیتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے رد میں ''بائبل اور قرآن، تاریخ اور سائنس کی روشنی میں'' لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ دو طریقہ ہائے کار موجود ہیں۔ ایک تطبیق کا طریقہ کار ہے جس کے تحت کوئی شخص سائنسی نظریات اور مذہبی کتب میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا طریقہ کار اختلاف کا ہے یعنی سائنس اور کتب کے مابین اختلاف کوئی شخص سامنے لائے۔

جیسا کہ محترم ڈاکٹر کیمپبل نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

مگر جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص تطبیق کا طریقہ اپنائے یا اختلاف کا، اگر آپ منطقی دلائل کی روشنی میں اور منطقی طریقہ کار کے تحت آگے بڑھتے ہیں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی ثابت شدہ جدید سائنس سے متضاد قرار دے سکے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے جدید سائنس کی روشنی میں قرآن میں متعدد مبینہ غلطیوں کی نشاندہی

کی ہے جس کا جواب میں جوابی تقریر میں دوں گا۔

البتہ ان کے ابتداء کرنے کے فیصلے کے بعد بعض نکات کا جواب اسی تقریر میں دوں گا۔ ان کی گفتگو علم الجنین اور علم الارضیات سے بحث کرتی، لہٰذا اس حوالے سے ان کے اعتراضات کا جواب میں ابھی دوں گا جبکہ بقایا اعتراضات کا جواب انشاء اللہ اپنی جوابی تقریر میں دے سکوں گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا موضوع ''قرآن اور بائبل سائنس کی روشنی میں'' ہے۔ لہٰذا یہ درست نہیں ہے کہ میں ایک ہی کتاب مقدسہ کے بارے میں بات کروں۔ یہ موضوع سے غیر انصافی ہوگی ۔ میں قرآن اور بائبل دونوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے بائبل کے بارے میں مشکل سے ایک دو باتیں ہی کی ہیں۔ انشاء اللہ میں تفصیلاً اس پر بحث کروں گا تاکہ موضوع سے انصاف کرسکوں۔ جہاں تک قرآن اور جدید سائنس کا تعلق ہے۔ ہم علم الفلکیات سے آغاز کرتے ہیں۔ چند عشروں قبل سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات نے کائنات کے آغاز کا حال بیان کیا، جس کو وہ ''عظیم دھماکہ'' قرار دیتے ہیں جس کو وضاحت وہ کرتے ہیں کہ ابتداء میں گیس و غبار کا ایک بادل موجود تھا۔ اور عظیم دھماکہ سے علیحدہ ہونے کے سبب کہکشائیں اور اجرام فلکی، ستارے، سورج اور زمین معرض وجود میں آئے۔ جہاں ہم رہائش رکھتے ہیں۔ یہ تمام معلومات نہائیت مختصراً عظیم قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ سورۃ انبیاء باب نمبر 21 آیت نمبر 30 میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

(الانبیاء:۳۰)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے؟''

سوچیں، یہ بات حال ہی میں ہمارے علم میں آئی ہے لیکن قرآن میں آج سے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کی جا چکی تھی۔ جب میں سکول میں تھا تو ہمیں سورج کے ساکن جب کہ زمین اور چاند کے اپنے مداروں میں سورج کے گرد گروش کرنے کا بتایا جاتا تھا۔ یعنی چاند اور زمین تو اپنے مداروں میں متحرک ہیں مگر سورج ایک مقام پر ساکن ہے۔ لیکن قرآن مجید کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ o﴾ (الانبیاء:۳۳)

"اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔

سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔"

الحمدللہ جدید سائنس نے اس آیت قرآنی کی تصدیق کر دی ہے۔ قرآن میں اس مقام پر استعمال کیا گیا عربی لفظ (یَسْبَحُوْنَ) ایک ایسے جسم کی حرکت ظاہر کرتا ہے جو بذات خود بھی اپنے مقام پر متحرک ہو۔ گویا جہاں اجرام فلکی کا ذکر ہو وہاں یہ لفظ اپنے مرکز کے گرد حرکت کو بھی آشکار کرتا ہے۔

لہٰذا قرآن ہمیں چاند اور سورج کا اپنے مرکز کے گرد بھی گھومنے اور اپنے اپنے مداروں میں بھی تیرنے کا بتاتا ہے۔

آج جدید سائنس کے مطابق سورج تقریباً 25 روز میں اپنے مرکز کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔

ایڈون ہبل پہلا سائنسدان تھا جس نے کائنات کے مسلسل پھیلنے کی حقیقت دریافت کی قرآن کو سورۃ الذریات میں بیان ہے۔

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ o﴾

(الذّٰریٰت :۴۷

"آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اسے وسیع کرنے والے ہیں۔"

یہاں کائنات کے پھیلنے کا ذکر ہے، عربی کے لفظ (مُوْسِعُوْنَ) کے معنی ہیں وسعت۔

علم فلکیات کے عنوان پر جن باتوں کا ذکر ڈاکٹر ولیم کیمبل نے کیا ہے ان کا جواب میں اپنی جوابی تقریر میں دوں گا انشاء اللہ۔

"آبی چکر" کا جہاں تک تعلق ہے ڈاکٹر ولیم کیمبل نے اپنی گفتگو میں چار مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ اپنی کتاب میں وہ چوتھے مرحلے کا (a) اور (b) دو حصوں میں ذکر کرتے ہیں۔ آخری مرحلے کا ذکر انہوں نے اپنی گفتگو میں نہیں کیا۔ معلوم نہیں کیوں؟

اس مرحلے کو "پانی کا جدول" کہتے ہیں۔ ممکن ہے بائبل میں ذکر نہ ہونے کے سبب اس

کو نظر انداز کر دیا ہو۔

ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں بخارات کی تشکیل کا ذکر نہیں ہے آبی چکر کے حوالے سے قرآن میں وضاحت موجود ہے۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝﴾ (الطارق:۱۱)

"قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔"

تقریباً تمام مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں پلٹانے کا مطلب بارش کو پلٹانے یا بخارات کی صورت میں پانی کے بادلوں میں تبدیل ہونے کی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل جو عربی جانتے ہیں، اس موقع پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات واضح الفاظ میں بیان کیوں نہیں کی؟ صاف صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہا کہ آسمان بخارات کو بارش کی صورت میں پلٹا دیتا ہے؟

لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا کیوں نہیں فرمایا؟ اسی میں حکمت پوشیدہ تھی کیونکہ آج ہمیں یہ علم ہوا کہ زمین کے اوپر موجود اوزون کی تہہ نہ صرف بخارات اور بادلوں کو بارش کی صورت میں زمین کی طرف پلٹاتی ہے بلکہ زمین سے اوپر جانے والی فائدہ مند حرارت اور قوت کو بھی واپس پلٹاتی ہے جو کہ انسانیت کے لیے ضروری ہے۔

آج ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ ذرائع مواصلاتی، ٹیلی ویژن کی، ریڈیو کی لہریں بھی اس سے پلٹ کر ہم تک پہنچتی ہیں جس سے ہم ٹی وی دیکھ سکتے ہیں، رابطے کر سکتے ہیں، ریڈیو سن سکتے ہیں ، اور ان کے علاوہ اوزون کی تہہ بیرونی خلا سے آنے والی مضرر رساں شعاؤں کو روکنے یا پلٹانے یا جذب کرنے کی وجہ بھی ہے۔

شعاعوں کو روکنے اور پلٹانے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثلاً سورج سے آنے والی بالا بنفشی شعاعیں، اوزون کی سطح جذب کر لیتی ہے۔ ایسا نہ ہونے سے زمین پر زندگی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ عظیم ہے اور بالکل بجا طور پر فرماتا ہے:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝﴾ (الطارق: ۱۱)

"اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔"

دیگر باتیں جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی قرآن میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے آپ میری ویڈیو کیسٹ دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن آبی چکر کو مفصل طریقہ سے بیان کرتا ہے۔
بائیبل میں آبی چکر کے حوالے سے ڈاکٹر کیمپبل نے اول وسوئم مرحلے کا ذکر کیا اور پھر سوئم ودوئم مرحلے کا۔ان کے مطابق پانی اوپر جا کر بارش کو صورت میں پھر سے زمین پر آتا ہے یہ ساتویں صدی قبل مسیح کے فلسفی فاسو ئملیکس کا نظریہ ہے جس کا خیال تھا کے ہوا سمندر کے ذرات کو اوپر اٹھاتی ہے جو بارشوں کی صورت میں برستے ہیں۔اس نظریہ میں بادلوں کو مذکور نہیں کیا گیا۔
ڈاکٹر کیمپبل کے دوسرے حوالے میں پانی کی بخارات میں تبدیل ہونے کی بات کی گئی۔ ہم اس امر پر متفق ہیں۔بائیبل کے ساتھ مطابقت رکھنے پر ہمیں کوئی اعتراج نہیں۔بعد ازاں بارش کا اور پھر دوبارہ بادلوں کا ذکر ہے۔درست لیکن یہ آبی چکر کی تکمیل شدہ صورت نہیں ہے۔
الحمدللہ قرآن نے اس آبی چکر کو متعدد مقامات پر بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بادلوں کی تشکیل، برسنے کا عمل اور ایک بار پھر پانی کی بخارات میں تبدیلی کا عمل یہ تمام مراحل قرآن میں مذکور ہیں۔
قرآن مندرجہ ذیل آیات میں آبی چکر کا تفصیلاً ذکر کرتا ہے۔

سورۃ	باب نمبر	آیت
سورہ نور	24	43
سورہ روم	30	48
سورۃ الزمر	39	21
سورہ مومنون	23	18
سورہ روم	30	24
سورہ حجر	15	22
سورہ اعراف	7	57
سورہ رعد	13	17
سورہ الفرقان	25	48 , 49
سورہ فاطر	35	9
سورہ یٰسین	36	34

سورہ جاثیہ	45	5
سورہ ق	50	9
سورہ واقعہ	56	68 , 70
سورہ الملک	67	30

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی زیادہ تر گفتگو علم الجنین کے حوالے سے ہے..... تقریباً نصف گفتگو سب جس کے بعد علم الارضیات کے بارے میں نسبتاً زیادہ بات کی، جبکہ دیگر 6 موضوعات پر ہلکی پھلکی گفتگو کی۔

اراضیات کے میدان میں ماہرین اراضیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے قطرِ ارض تقریباً تین ہزار سات سو پچاس میل ہے، زمین کی سب سے باہر سطح ٹخ ہے مگر اندرونی پرتیں انتہائی گرم اور پگھلی ہوئی حالت میں ہیں، جہاں زندگی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ کہ زمین کی سب سے بیرونی پرت جس پر ہم آباد ہیں، نسبتاً انتہائی نازک ہے۔

اس کی عمومی گہرائی چند زیادہ گہرے حصوں کو چھوڑ کر ایک سے 30 میل تک ہے جس کے ہلنے یا لرزنے کے امکانات کافی ہوتے ہیں جو کہ بل پڑنے کی وجہ سے ہیں جو پہاڑوں کی تشکیل کا عمل ہے جس سے زمین مستحکم ہوتی ہے۔ قرآن کی سورۃ النبا میں بیان ہے۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝﴾

(النباء: ۶۔۷)

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخیں۔''

بیان قرآن یہ نہیں ہے کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح زمین میں اوپر سے گاڑا گیا ہے بلکہ یہ کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ اوتادا کا مطلب خیمے گاڑنے والی میخیں ہی ہوتا ہے۔ آج جدید ارضیات بھی اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ پہاڑوں کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہین۔ یہ بات انیسویں صدی کے آخری نصف میں سامنے آئی تھی کہ پہاڑ کا بیشتر حصہ زمین کے اندر ہوتا ہے اور صرف تھوڑا سا حصہ ہمیں نظر آتا ہے، بالکل جیسے زمین میں گڑی ہوئی میخ کا بیشتر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یا جیسا کہ ''آئس برگ'' کی صرف چوٹی ہمیں نظر آتی ہے جب کہ 90 فی صد حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

سورۂ غاشیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ o﴾ (الغاشیۃ:۱۹)

''اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟''

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا o﴾ (النازعات:۳۲)

''اور پہاڑ اس میں کھڑے کر دیے۔''

جدید ارضیاتی نظریے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پہاڑی سلسلے سطح زمین کو مستحکم کرتے ہیں گو تمام ماہرین ارضیات نہیں لیکن اکثر ماہرین ایسا ہی کہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ علم ارضیات کی کسی ایک مستند کتاب میں اپنی کہی ہوئی بات دکھا دیں۔ میں مستند کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کی ''ذاتی خط و کتابت'' کا نہیں۔ دستاویزی ثبوت طلب کر رہا ہوں۔

''زمین'' نامی ایک کتاب جو اکثر یونیورسٹیوں کے ارضیات کے نصاب میں شامل ہے۔ جس کے مصنفین میں ڈاکٹر فرینک پریس بھی شامل ہیں جو سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے مشیر اور امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے صدر رہے ہیں۔ اس کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ پہاڑ مثلث نما ہوتے ہیں، زمین کے اندر گہرائی تک ان کی جڑیں ہوتی ہیں اور یہ کہ پہاڑ زمین کو مستحکم کرتے ہیں۔

جب قرآن کہتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ﴾ (الانبیاء:۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ﴾ (لقمان:۱۰)

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

﴿وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ

تَهْتَدُوْنَ﴾ (النحل:١٥)

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے،اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے، تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

گویا قرآن میں بھی پہاڑوں کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ وہ سطح زمین کو مستحکم کریں۔قرآن کی ان آیات میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے اور اپنی گفتگو میں بھی کہا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں اور یہ کہ پہاڑ زلزلوں کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں قابل توجہ امر یہ ہے کہ قرآن میں یہ تو کہیں بیان نہیں کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ عربی میں زلزلے کے لیے ''زلزال'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ڈاکٹر کیمپبل چونکہ عربی شناس ہیں لہٰذا یہ بات ان کے بھی علم میں ہوگی۔لیکن ان تینوں آیات میں،جن کا میں نے ذکر کیا،کہیں بھی زلزلے کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ان میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے۔(تَمِيدَ ا) جس کے معنی (ڈھلکنے) یا(جھولنے) کے ہوتے ہیں اور قرآن ہر سہ آیات میں یہی لفظ استعمال کرتا ہے کہ زمین تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے ،جھول نہ پڑے۔اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین حرکت کرتی ۔یہی بات قرآن میں بیان ہے اور ایسا ہی ڈاکٹر فرینک پریس کہہ رہے ہیں ۔یہی بات ڈاکٹر نجات لکھتے ہیں۔ڈاکٹر نجات مسعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے قرآن کے ارضیاتی تصورات پر ایک کتاب لکھی ہے۔جو ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے جملہ اعتراضات کے تفصیلی جوابات فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل اپنی کتاب میں سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر پہاڑ زمین کو کانپنے سے روکتے ہیں تو پھر کیونکر ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں؟

میں یہ پوچھتا ہوں،قرآن میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں؟ زلزلے کو عربی میں زلزال کہتے ہیں۔آکسفرڈ ڈکشنری میں زلزلے کی تعریف کچھ اس طرح ہے۔

''زلزلہ زمین کی بالائی تہہ کے زلزلے سے لہروں کے پیدا ہونے سے چٹان میں دراڑ کے سبب یا آتش فشانی کے ردعمل سے پیدا ہوتا ہے۔''

قرآن میں سورہ زلزال میں زلزلے کا ذکر بیان کیا گیا ہے لیکن وہاں تمید بکم کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ڈولنے یا ڈھلکنے کا ذکر ہے اسی طرح جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے:

''اگر پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں تو پھر پہاڑی علاقوں میں ہی زیادہ زلزلے کیوں آتے ہیں؟''

تو اس بات کا جواب دینے کے لیے میں یہ پوچھنا چاہوں گا۔ کہ ڈاکٹر حضرات انسانوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں اور کوئی شخص یہ اعتراض اٹھائے کہ اگر ڈاکٹر بیماریوں کو ٹھیک کرتے ہیں تو پھر زیادہ مریض ہسپتالوں میں کیوں پائے جاتے ہیں جہاں گھر کی نسبت زیادہ ڈاکٹر ہوتے ہیں؟ تو کیا یہ اعتراض درست ہوگا؟

اب ہم سمندروں کے موضوع پر بات کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (الفرقان:۵۳)

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید کی سورۂ رحمان میں ارشاد ہوتا ہے:۔

﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ﴾

(الرحمٰن:۱۹،۲۰)

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

قبل ازیں مفسرین قرآن کو کڑوے و میٹھے پانی کا تو علم تھا لیکن ایسی رکاوٹ یا پردے سے لاعلم تھے جو ہر دو پانیوں کو آپس میں حل ہونے نہیں دیتا، لہٰذا آج مذکورہ بالا کے مفہوم میں ان کو دشواری پیش تھی۔

مگر آج بحریات کے علوم کی ترقی کے ساتھ ہمارے علم میں آچکا ہے کہ جب ایک طرح کا پانی دوسری قسم کے پانی کے ساتھ ملتا ہے تو دونوں کے اجزاء ایک دوسرے میں محلول ہوتے ہیں اور یہ یکساں محلول، ہر پانی کی خصوصیات کے ساتھ دونوں اقسام کے پانیوں کو الگ الگ بھی رکھتا ہے

۔قرآن اس کے لیے "برزخ" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔اس پر متعدد بڑے سائنس دان متفق ہیں امریکہ کے ایک سائنس دان ڈاکٹر ہے جو کہ بحری علوم کے ماہر ہیں بھی اس سے متفق ہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ یہ تو ایک معمولی امر ہے جس سے محمد (ﷺ) کے دور کے ماہی گیر بھی واقف تھے اور (حضرت محمد ﷺ) شام کا سفر کرتے ہوئے سمندری سفر کے ذریعے ان ماہی گیروں سے گفتگو میں اس حقیقت سے باخبر ہو گئے ہوں گے۔

میٹھا یا نمکین پانی ایک مشاہدے کے قابل بات ہے۔درست لیکن ماضی قریب تک لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ نظر نہ آنے والی سرحد بھی ہوتی ہے۔جس سائنسی نقطے کی وضاحت ضروری ہے وہ ہے "برزخ" میٹھے اور نمکین کی خصوصیات سے عادی پانی بات کرتے ہیں علم الجنین پر ۔ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی گفتگو کا آدھے سے زیادہ حصہ اسی موضوع سے متعلق تھا۔وقت کی کمی کے سبب نا ممکن ہے کہ ان کی ہر غیر منطقی بات کا جواب دے سکوں۔لہٰذا مختصر جواب حاضر ہے مزید تفصیل کے لیے قرآن اور جدید سائنس اور قرآن و میڈیکل سائنس کے عنوان سے بری کتاب وسی ڈیز ے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

ماضی قریب میں علم الجنین سے متعلق قرآن و احادیث نبویہ کو جمع کر کے کچھ عربوں نے سارا مواد کینیڈا کی یونیورسٹی آف ٹورنٹو میں علم الجنین کے شعبہ کے سربراہ اور عصرِ حاضر کے بڑے ماہرین میں شمار ڈاکٹر کیتھ مور کو پیش کیا۔

ان آیات و احادیث کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان سے تبصرہ ہے طلب کیا گیا تو انہوں نے ان میں سے بیشتر آیات اور احادیث کو جدید ترین تحقیقات سے مکمل مطابقت والا قرار دیا۔البتہ چند باتیں ایسی تھیں جنہیں درست قرار دینے نہ غلط قرار دینے پر تیار تھے کیونکہ جدید سائنس نے ابھی تک ان کی وضاحت کامل نہیں کی۔انہوں نے کہا کہ وہ خود ان کے بارے میں مکمل علم نہیں رکھتے۔اور ان میں دو آیات ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کی اولین آیات ہیں۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ٥﴾

(العلق ۲،۱)

"پڑھو! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے۔"

"علق" سے مراد کوئی چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل بیان کہ کسی لفظ کے معنی کے لیے ہمیں اُس دور میں اس سے کیا مراد ہے لی جاتی کہ دیکھنا ہوگا جب کتاب تحریر کی گئی۔ یا وہی معنی قبول کرنے چاہئیں جو معنی اولین مخاطبین کے لیئے صحیح تھے۔

میں ڈاکٹر کیمپبل کی اس بات سے متفق ہوں لیکن صرف بائبل کی حد تک بائبل کے حق میں تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ بائبل کے مخاطبین صرف اس دور کے لوگ تھے۔ اور صرف بنی اسرائیل یہ بات بائبل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ بارہ حواریوں کے نام بیان کرنے کے بعد تحریر ہے:

> ''ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور ان کو حکم دے کر کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (متی، باب ۱۰، ۷،۶)

یہاں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام منع کر رہے ہیں انہیں غیر قوموں کی طرف جانے سے غیر قوموں سے کیا مطلب ہے؟ غیر قوموں سے مراد ہندو، مسلمان سمت، تمام غیر یہودی اقوام ہیں۔ اس طرح متی کی انجیل میں پھر کہا گیا ہے:

> ''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (متی۔ باب ۱۵، ۲۴)

گویا بائبل اور حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کا پیغام ہدایت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا اور چونکہ یہ پیغام صرف ایک قوم تک محدود تھا لہٰذا یہاں وہ معانی نکالنے چاہئیں جو ان لوگوں کے لیے درست تھے۔

مگر قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن صرف اس دور کے عربوں کے لیے نزول نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لیے ہدایت کا پیغام ہے۔ اور دور کے لیے بھیجا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیمؑ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ۝﴾ (ابراہیم:۵۲)

''یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے۔''

اسی طرح سورۂ بقرہ میں کہا گیا:

﴿الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ۝﴾ (البقرہ:۱۸۵)

''قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

سورۂ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۝﴾ (الزمر:۴۱)

''(اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا پیغام پوری بنی نوع انسانیت کے لیے ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ کو صرف عربوں کے لیے ہدایت دے کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انبیاء میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۱۰۷)

''اے نبیؐ!) ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

پس جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، آپ قرآنی الفاظ کے معانی کو قطعاً عہد تک محدود نہیں کر سکتے جس عہد میں یہ نازل ہوا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کا پیغام کسی دور تک محدود نہیں ہے۔

عَـلَـق کا ایک مطلب کا ایک مطلب جونک نما چیز یا چپکنے والی شے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور کو علم نہیں تھا کہ جنین کی ابتدائی مرحلے میں جونک سے کوئی مشابہت ہوتی ہے یا نہیں۔ لہٰذا اپنی تجربہ گاہ میں انہوں نے جنین کے ابتدائی مرحلے کا خوردبین سے جائزہ لینے کے بعد اس کا موازنہ جونک کی تصویر سے کیا اور وہ دونوں کے درمیان موجود حیرت انگیز مماثلت پا کر حیرت زدہ ہو گئے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے آپ کو بالکل مختلف رخ دکھایا ہے۔ ان کی کتاب میں تصویر مختلف رُخ سے ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو جب مختلف تناظر میں دیکھا جائے تو وہ خاصی الگ سی دکھائی دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور سے 80 سوالات کیے گئے۔ ڈاکٹر کیتھ میور نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ 80 سوالات ان سے 30 سال قبل کیے جاتے تو شاید وہ پچاس فی صد سوالات کا بھی جواب دینے کے قابل نہ تھے۔ جیسا کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں علم الجنین نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ اور یہ بات ڈاکٹر کیتھ مور نے 1980ء کی دھائی میں کی تھی۔

ڈاکٹر کیتھ مور کا یہ بیان تحریری صورت میں بھی دستیاب ہے اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔ ویڈیو کیسٹ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ ان کے اس بیان پر یقین کیا

جائے گا یا ڈاکٹر کیمپبل کے ساتھ ان کی نجی گفتگو پر؟

ڈاکٹر کیتھ مور نے یہ تحقیقات ایک کتاب کی صورت میں بھی پیش کی تھی جس کا عنوان تھا ''ارتقا پذیر انسان'' اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ جس کا اسلامی ایڈیشن ڈاکٹر عبدالمجید الزندانی نے شائع کیا تھا جس پر ڈاکٹر مور کی تصدیق بھی موجود ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾ (المؤمنون:۱۳)

''پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔''

سورۂ حج سمیت قرآن میں گیارہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ تخلیق انسانی نطفے سے ہوئی ہے۔ اور نطفہ عربی زبان میں ''مائع کی انتہائی قلیل مقدار'' کو کہتے ہیں۔ مثلاً وہ مقدار جو پیالے کی تہہ سے لگی رہ جاتی ہے یعنی چھوٹی سے چھوٹی مقدار آج ہم جانتے ہیں کہ مادہ منویہ میں موجود کروڑوں جرثوموں میں سے صرف ایک ہی بیضے کی بار آوری کے لیے کافی ہوتا ہے جو انتہائی قلیل ترین مقدار ہوتی ہے۔

جس کے لیے قرآن ''نطفہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝﴾ (السجدہ:۸)

''پھر اس کی نسل ایک سیبے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔''

''ست یا سلالۃ'' سے مراد ہے کسی چیز کا جوہر، کسی شے کا بہترین حصہ۔ کہہ سکتے ہیں کہ کروڑوں جرثوموں میں سے وہ ایک جرثومہ جو بیضے بار آوری کا باعث بنتا ہے۔ قرآن اسی لیے قرآن اسی لیے تو یہاں لفظ ''سلالۃ'' یعنی بہترین حصہ استعمال کرتا ہے۔

سورۂ الدھر میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝﴾ (الدھر:۲)

''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض

کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

اس جگہ قرآن میں نُطْفَةٍ امشاج کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی مخلوط نطفہ۔ اشارہ بیضوں اور مادہ منویہ کی طرف ہے۔ کیونکہ جنین کی تشکیل کے لیے ہر دو کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنین کے ارتقاء کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن میں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ (المومنون:۱۲تا۱۴)

"ہم نے بنایا انسان کو مٹی کے ست سے۔ پھر اسے تبدیل کیا ٹپکی ہوئی بوند میں ایک محفوظ جگہ، پھر شکل دی اس بوند کو ایک لوتھڑے کی۔ پھر بوٹی بنا دیا لوتھڑے کو، پھر ہڈیاں بنائیں بوٹی کی، پھر چڑھایا گوشت ہڈیوں پر، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی برکت والا ہے اللہ، اچھا سب کاریگروں سے۔"

مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق نُطْفَةً سے ہوئی جو مائع کی بالکل قلیل ترین مقدار ہے۔

پھر اسے "قَرَارٍ مَّكِيْنٍ" میں رکھا گیا یعنی محفوظ جگہ پھر وہ "علقه" میں تبدیل ہوا یعنی "جونک نما شے" یا "چپکنے والی شے" یا "خون کا لوتھڑا۔"

پھر علقه تبدیل کیا گیا "مضغة" میں یعنی چبائی ہوئی بوٹی۔

پھر مضغة سے "عظاماً" یعنی ہڈیاں بنائی گئیں۔

پھر "لحم" یعنی تشکیل گوشت ہوئی۔

ہر سہ آیات قرآنی میں جنین کے ارتقائی مراحل وضاحت سے بیان کیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو نطفہ، قرار مکین میں پہنچتا ہے یعنی رحم مادر میں اور تب وہ علقة میں تبدیل ہوتا ہے۔ لفظ "علقة" کے تین معانی ہیں: پہلا معنی تو "چپکنے والی چیز" اور یہ معانی بالکل درست ہے کیونکہ جنین رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ دوسرا مطلب "جونک نما شے" ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت

کر چکا ہوں کہ جنین اپنے ابتدائی مرحلوں میں واقعی جونک سے مشابہ ہوتا ہے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی کہ جونک کی طرح اس کی پرورش بھی خون سے ہو رہی ہوتی ہے۔

تیسرا مطلب ''خون کا لوتھڑا'' بھی ہوتا ہے اور انہی معانی پر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے معترض ہیں ۔انہوں نے کہا ہے کہ یہاں قرآن غلطی پر ہے۔ (نعوذ باللہ) میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قرآن قطعی طور پر غلطی پر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اب جبکہ علم طب اس قدر ترقی کر چکا ہے، آج بھی ڈاکٹر کیتھ مور، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنین آغاز کے مراحل میں خون کے لوتھڑے کی مانند بھی نظر آتا ہے۔ آپ تصاویر کی مدد سے بھی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ عقلہ تین سے چار ہفتے کی عمر میں خون بند تھیلی میں منجمد ہو جاتا ہے:

یہی بات پروفیسر کیتھ مور نے کہی ''جمے ہوئے خون کے لوتھڑے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔'' بند تھیلی میں منجمد خون ۔ جنین کے سوئم ہفتہ میں خون گردش نہیں کرتا جو بعد میں شروع ہوتا ہے لہٰذا اس کی شکل لوتھڑے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر اسقاطِ حمل کے بعد مشاہدہ کریں تو یہ جونک جیسا ہی نظر آئے گا۔

ڈاکٹر کیمپبل کے تمام اعتراضات کا جواب ایک جملے میں بھی دیا جا سکتا ہے۔

''قرآن میں جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کو ان کی شباہت کی بنا پر نام دیے گئے ہیں۔''

جنین بظاہر اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں واقعی لوتھڑے جیسا جونک یا چپکنے والی چیز کی طرح پھر قرآن کہتا ہے کہ علقہ کو مضغہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی چبائی ہوئی شے کی مانند ہو جاتا ہے۔ جو کہ درست ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے کو دانتوں سے چبا کر دیکھا کہ دانتوں کے نشانات اعضاء جیسے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کہتے ہیں کہ علقہ کے مضغہ میں تبدیلی کے بعد بھی چپکنے کی خاصیت ساڑھے آٹھ ماہ تک موجود رہتی ہے ۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قرآن میں یہ تمام نام جنین کی ظاہری صورت کی بنا پر دیے گئے ہیں بے شک جنین تقریباً آخر تک ''چپکا ہوا'' رہتا ہے لیکن اس کی ظاہرہ شباہت ''جونک نما چیز'' کی بجائے ''چبائی ہوئی چیز'' جیسی ہو جاتی ہے۔

بعد ازاں قرآن کہتا ہے کہ ''عِظَامًا'' یعنی ہڈیاں اور پھر ''لَحْمًا'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل کہتے ہیں کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی تشکیل بیک وقت ہوتی ہے۔ میں ان سے متفق ہوں۔

جدید دور میں علم الجنین کی جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کے بنیادی مادے کی تشکیل 25ویں سے 40ویں روز کے درمیان ہوتی ہے جس کا قرآن میں مغنۃ کے حوالے سے تذکرہ ہے۔

لیکن وہ پختہ نہیں ہوتے۔ بعد ازاں ساتویں ہفتہ کے آخر میں جنین انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر ہڈیاں تشکیل پاتی ہیں۔ آج جدید علم الجنین بیان کرتا ہے کہ ہڈیاں 42ویں دن کے بعد بنتی ہیں اور ڈھانچہ جیسی صورت اختیار کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس مرحلے پر بھی جب ہڈیاں تشکیل پاتی ہیں پٹھے نہیں بنتے۔ بعد ازاں 7ویں ہفتے کے بعد اور آٹھویں ہفتے کے آغاز میں پٹھے تشکیل پاتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قرآنی ترتیب کے سب سے پہلے علقہ پھر مضغتہ پھر عظاما اور پھر لحما ہی درست ترتیب ہے جیسا کہ پروفیسر کیتھ مور نے کہا کہ

جدید علم الجنین کے بیان کردہ مراحل یعنی اول، دوئم، سوئم، چہارم و پنجم مرحلہ اور ان کی تفاصیل انتہائی پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں۔ جب کہ مشابہت بنیاد پر بیان کردہ قرآنی مراحل سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اسی لیے ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کہ محمدؐ اللہ کے رسول تھے اور قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہی ہے۔''

قرآن کی سورۃ النساء باب نمبر 4 آیت نمبر 56 احساس درد کے حوالے سے ہے احساسِ درد کے متعلق پہلے ڈاکٹرز کا نظریہ تھا کہ یہ فقط دماغ سے متعلق ہوتا ہے مگر آج معلوم ہوسکا کہ درد کا احساس دماغ کے ساتھ ساتھ جلد کے خلیوں سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ جن کو ''درد وصول کرنے والے'' کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن کی سورۃ النساء باب نمبر 4 آیت نمبر 56 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (النساء:٥٦)

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا، انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔''

یہ آیت جلد میں درد کے احساس کی کسی خصوصیت کا پتہ دیتی ہے جس کو قرآن ''درد وصول کرنے والے'' کے طور پر بیان کر رہا ہے۔

تھائی لینڈ کی چانگ مائی یونیورسٹی کے شعبہ اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تھاگاڈاشان نے صرف اس ایک آیت کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ ریاض، سعودی عرب میں ہونے والی آٹھویں میڈیکل کانفرنس میں انہوں نے کہا۔

﴿أَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں۔''

سورہ فضیلت سے میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

قرآن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾

(حم السجدہ: ۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

ڈاکٹر تھاگاڈا کے لیے ایک ہی نشانی حق کی نشان دہی کے لیے کافی تھی۔ بات پر ایمان لانے کے لیے کہ قرآن کلام خداوندی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں کہ وہ قرآن کلام خداوندی پر ایمان لے آئے۔ بعض لوگوں کو دس نشانیاں درکار ہوں گی اور بعض کو سو نشانیاں درکار ہوں گی۔ لیکن بعض لوگ تو ایک ہزار نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

جن کے بارے میں قرآن میں بیان ہے۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ (البقرہ: ۱۸)

''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب رجوع کریں گے۔''

بائبل بھی متی کی انجیل میں ان کے بارے میں یہی کہتی ہے۔

''میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور انہیں سمجھتے۔'' (متی باب ۱۳۔۱۳)

جہاں تک علم الجنین سے متعلق دیگر نکات کا تعلق ہے، اگر اللہ نے چاہا اپنی جوابی تقریر میں ذکر کروں گا لیکن مجھے موضوع کے دوسرے حصے سے بھی انصاف کرنا ہے یعنی ''بائبل، سائنس کی روشنی میں''

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے:

﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾

(الرعد: ۳۸۔۳۹)

''ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، قائم رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ لیکن نام صرف چار کا مذکور ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔ تورات بھی وحی خداوندی ہے اور زبور بھی۔ انجیل وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور قرآن اللہ تعالیٰ کی وہ وحی ہے جو اس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری وحی ہے۔

یہاں ایک بات میں واضح طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جس بائبل کو تمام مسیحی حضرات اپنی کتاب مقدسہ قرار دیتے ہیں، ہم مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی انجیل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس انجیل میں کلام خداوندی بھی شامل ہو۔ لیکن اس میں دیگر کئی چیزیں بھی مل گئی ہیں۔ اس میں حواریوں کا کلام بھی شامل ہے۔ تاریخ دانوں کے بیانات بھی شامل ہیں اور کچھ بے معنی اور مہمل باتیں بھی۔ کچھ فحش بیانات اور لاتعداد سائنسی اغلاط بھی موجود ہیں۔ بائبل میں کچھ سائنسی درست باتیں ہیں تو یہ ممکن ہے کیونکہ بائبل کلام خداوندی کے کچھ حصے پر مشتمل ہے۔ لیکن سائنسی غلطیوں کے بارے میں کیا کیا جائے؟ غیر سائنسی حصے کے بارے میں کیا کہا جائے؟ کیا آپ اسے خدا سے منسوب کر سکتے ہیں؟

میں یہ بات اپنے مسیحی بہن بھائیوں کے سامنے بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں ہے۔ اگر بائبل اور سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کا دل دکھے تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ہماری گفتگو کا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ کلام خداوندی غلطی پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ اس میں سائنسی غلطیوں کا امکان ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی فرماتے تھے کہ سچائی کو تلاش کرو۔

دیکھئے ہمارے پاس عہد نامہ قدیم ہے، عہد نامہ جدید ہے اور خدا کی آخری وحی ہمارے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا تعلق ہے، ان کے ساتھ میں خاصی بے تکلفی اختیار کر سکتا ہوں کیونکہ وہ ایک کتاب "قرآن اور بائبل تاریخ اور سائنس کی روشنی میں۔" تحریر کر چکے ہیں۔ وہ اپنی تقریر کر چکے ہیں۔ اور ویسے بھی وہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں لہٰذا ان کے معاملے میں تکلف برتنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جہاں تک دوسرے مسیحی بہن بھائیوں کا سوال ہے اگر دوران گفتگو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے تو میں ان سے معذرت چاہتا ہوں۔ آیئے تجزیہ کرتے ہیں کے سائنس کے بارے میں بائیبل کیا کہتی ہے۔ پہلے علم الفلکیات کے حوالے سے بائیبل کا بیان دیکھتے ہیں خصوصاً تخلیق کائنات کے حوالے سے۔ آغاز میں یعنی کتاب الپیدائش میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> "خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔" (پیدائش، باب ا۔۵،ا)

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں تخلیق کیا اور بائبل صبح اور شام کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی چوبیس گھنٹے والے دن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان کے مطابق چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں کائنات کی تشکیل ناممکن ہے۔

قرآن بھی اس حوالے سے چھ ایام کا ذکر کرتا ہے۔ عربی لفظ ایام ہے جس کا واحد یوم ہوتا ہے۔ لفظ یوم کا مطلب چوبیس گھنٹے کا ایک دن بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد طویل وقت بھی ممکن ہے مطلب "ایک دور" اور کوئی سائنسدان یہ بات تسلیم کرنے میں معترض نہیں ہو سکتا کہ دنیا چھ طویل ادوار میں تخلیق ہوئی۔

نکتہ نمبر 2 بائیبل "کتاب پیدائش" میں آیت نمبر 3 اور 5 میں کہتی ہے۔

"روشنی پہلے دن بنائی گئی۔"

کتاب پیدائش باب 1 آیت 14 سے 19 میں بیان ہے۔

''روشنی کے اسباب ستارے اور سورج وغیرہ چوتھے دن تخلیق کیئے گئے۔''

روشنی کے ذرائع کس طرح چوتھے دن پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

جبکہ روشنی اول دن ہی پیدا کی جا چکی ہو؟ یہ غیر سائنسی ہے۔ مذید نکتہ نمبر 4 بائیبل کتاب پیدائش باب نمبر 1 آیات نمبر 9 تا 13 میں کہتی ہے۔

''زمین تیسرے دن تخلیق کی گئی۔''

کتاب پیدائش باب نمبر 1 آیت نمبر 14 تا 19۔

''سورج اور چاند چوتھے دن پیدا کئے گئے۔''

جدید سائنس کے مطابق زمین اپنے اجداد سورج کا حصہ ہے۔ یہ سورج سے پہلے وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ غیر سائنسی ہے نکتہ نمبر 5 کتاب پیدائش باب نمبر 1 آیات نمبر 11 تا 13۔

''سبزیاں ، جڑی بوٹیاں جھاڑیاں اور درخت یہ سب چوتھے دن بنائے گئے۔''

اور کتاب پیدائش کے باب نمبر 1 آیات نمبر 14 تا 19 کے مطابق سورج چوتھے دن تخلیق کیا گیا سبزیاں کس طرح سورج کی روشنی کے بغیر وجود میں آسکتی ہیں اور کس طرح اپنی بقاء قائم رکھ سکتی ہیں؟

نکتہ نمبر 6 کتاب پیدائش باب نمبر 1 آیت نمبر 16۔

''خدا نے دو روشنیاں تخلیق کیں بڑی روشنی سورج دن کی حکمرانی کے لیے چھوٹی روشنی چاند رات کی حکمرانی کے لیئے۔''

اس کا اصل ترجمہ اگر عبرانی سے کریں تو اس سے مراد چراغ ہیں۔ ایسے چراغ جن کی اپنی روشنیاں ہوں۔ اور اگر آپ ہر دو آیات یعنی آیت نمبر 16 اور آیت نمبر 17 ملاحظہ کریں تو بہتر طور پر معلوم کر سکیں گے۔ آیت نمبر 17 میں بیان ہے۔

''خداوند تعالیٰ نے انہیں آسمان کے گنبد میں رکھا تا کہ زمین کو روشنی دیں۔''

اشارہ یہ ہے کہ سورج و چاند کی اپنی روشنی ہے۔ لیکن مسلمہ سائنس اس کے برعکس کہتی ہے۔ بعض افراد مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے چھ دن سے مراد چھ دور لیتے ہیں۔ جو کہ غیر منطقی ہے جیسا کے صاف نظر آتا ہے کہ بائبل میں صبح و شام کا ذکر ہے جس سے مراد چوبیں گھنٹے والا دن ہی ہے۔ لیکن بالفرض اس غیر منطقی دلیل کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس طرح زیادہ سے زیادہ پہلے دو نکات کا جواب ملتا ہے جب کہ باقی ماندہ چار سوالات پھر بھی جواب طلب ہی رہ جائے گے۔ اکثر لوگوں کے

مطابق اگر یہاں عام دن ہی مراد ہے تو پھر نباتات چوبیس گھنٹے روشنی کے بغیر بھی گزار سکتی ہیں۔ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں مگر نباتات والے مسئلے کے حل کے بعد آپ چھ دن کو چھ ادوار نہیں کہہ سکتے۔ آپ کے پاس کیک آپ کے کھانے کے باوجود موجود رہے ناممکن ہے۔اگر آپ طویل ادوار کی بات کرتے ہیں تو نکتہ نمبر 1 اور 2 حل کر سکتے ہیں۔باقی 4 نکات آپ کا منہ چڑا رہے ہیں اور اگر آپ 24 گھنٹہ والے دن کی بات کرتے ہیں تو صرف نکتہ نمبر 5 حل ہوتا ہے بقایا 5 نکات پھر بھی کھڑے ہیں۔

لہٰذا اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں۔ان کے پاس دو صورتیں ہیں:

اول یہ کہ دن سے مراد طویل زمانہ کو تسلیم کر لیں تو آپ پہلا اور تیسرا نکتہ حل کر لیں گے لیکن دوسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا نکتہ حل طلب رہ جائے گا۔

دوئم یہ ہے کہ وہ دن کو 24 گھنٹے کا عام دن ہی فرض کریں، اس صورت میں وہ صرف نکتہ نمبر 5 کا جواب مہیا کریں گے لیکن باقی تمام نکات حل طلب رہ جائیں گے۔

زمین کے نظریہ کے حوالے سے بہت سے سائنسدانوں نے کہا ہے کہ کس طرح زمین ختم ہو جائے گی۔یہ مفروضے ہیں جن کی درستگی بھی ممکن ہے اور غلطی کا بھی امکان ہے۔مگر زمین یا تو فنا ہو جائے گی یا ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان میں سے کوئی ایک نظریہ ہی درست ہو سکتا ہے دونوں باتیں بیک وقت درست نہیں ہو سکتیں۔یہ غیر سائنسی امر ہوگا۔

لیکن بائیبل بلکل ایسا ہی کہتی ہے۔کتاب العبرانی باب نمبر 1 آیات نمبر 10 اور کتاب دعائیہ باب نمبر 102 آیات نمبر 25 اور 26 میں بیان ہے۔

''خداوند نے جنت اور زمین تخلیق کی اور وہ فنا ہو جائیں گی۔''

جبکہ اس کے برعکس کتاب (Ecclesiastics) کے باب نمبر 1 آیت نمبر 4 اور کتاب دعائیہ باب نمبر 78 آیت نمبر 69 میں درج ہے کہ:

''زمین ہمیشہ قائم رہے گی۔''

میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑتا ہوں کہ درست و غلط کا خود انتخاب کر لیں۔کیونکہ دونوں باتیں بیک وقت تو درست نہیں ہو سکتیں۔دنیا بیک وقت فانی اور غیر فانی نہیں ہو سکتی ہے۔

آسمان کے حوالے سے بائبل میں کہا گیا ہے: کتاب ایوب باب نمبر 26 آیت نمبر 11۔

''اور آسمان کے ستون لرزیں گے۔''

جب کہ قرآن میں سورۃ لقمان باب نمبر 31 آیت نمبر 10 میں بیان ہے۔

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ﴾ (لقمان:١٠)

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے۔''

بائبل کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں، قرآن کہتا ہے کہ آسمان ستونوں کے بغیر ہے۔ کیا آپ خود نہیں دیکھ سکتے کہ آسمان کے ستون موجود ہیں یا نہیں؟

بائبل نہ صرف یہ کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں بلکہ وہ تو زمین کے بارے میں بھی یہی بات کرتی ہے: کتاب سموئیل باب نمبر 2 آیت نمبر 8 کتاب ایوب باب نمبر 9 آیت نمبر 6 اور کتاب دعا (Psalms) باب نمبر 75 آیت نمبر 3 میں بیان ہے۔

''حتیٰ کہ زمین کے بھی ستون ہیں۔''

خوراک اور غذا کے بارے میں بائبل کیا کہتی ہے۔

کتاب پیدائش باب نمبر 1 آیت نمبر 29۔

''خدا نے تمہیں تمام جڑی بوٹیاں جن میں بیج ہیں درخت جن پر پھل ہیں۔ وہ جو بیج دار ہیں کھانے کے لیے دیئے ہیں۔''

آج ایک عام شخص بھی اس سے واقف ہے کہ کئی زہریلے پودے اسے زہریلے ہوتے ہیں جن کے کھانے سے موت واقع ہو سکتی ہے کس طرح ممکن ہے کہ خالق کائنات اور بنی نوع انسانوں کو زہریلے پودوں کا علم نہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر کیمپبل اپنے مریضوں کو ایسے پھل نہیں دیتے ہوں گے۔

بائبل میں حقیقی اہل ایمان کو پرکھنے کا ایک طریقہ درج ہے گوسپل آف مارک کے باب نمبر 16 آیات نمبر 17 اور 18 میں بیان ہے۔

''اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے۔

وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکال لیں گے۔

غیر اور نئی زبانیں بولیں گے۔

سانپوں کو اُٹھا لیں گے۔

اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انہیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا، وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔''

یہ ایک سائنسی آزمائش ہے جس کو سائنسی اصطلاح میں ''تصدیق آزمائش'' کہتے ہیں تا کہ حقیقی مسیحی مومن کی پرکھ ہو سکے۔

اپنی زندگی کے گزشتہ دس سالوں میں، مجھے بلا مبالغہ ہزاروں عیسائیوں سے واسطہ پڑا ہے بشمول عیسائیت کے مبلغین کے لیکن میں نے آج تک کوئی ایک بھی ایسا عیسائی نہیں دیکھا جو انجیل کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میں نے کوئی ایک بھی مسیحی زہر کھاتے نہیں دیکھا جس پر زہر اثر نہ کرے۔ سائنسی اصطلاح میں اسے ''جھوٹوں کی پرکھ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جھوٹا شخص اس آزمائش سے گزرے گا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔ اگر غلط آدمی زہر کھائے گا تو مر جائے گا۔ کوئی جھوٹا شخص ایسی آزمائش کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔ اگر آپ ایک حقیقی عیسائی نہیں ہیں تو آپ بھی یہ امتحان نہیں دیں گے۔

میں نے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی کتاب ''قرآن اور بائبل تاریخ و سائنس کی روشنی میں'' پڑھی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک حقیقی مسیحی ہیں۔ اور میری خواہش ہے کہ کم از کم وہ یہ امتحان ضرور دیں۔ میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی خطرناک زہر کھا کر دکھائیں کیونکہ اس طرح تو ہمارا یہ مناظرہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں ان سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں نئی زبانیں بول کر دکھائیں۔ آپ میں سے اکثر واقف ہیں کہ بھارت میں ایک ہزار سے زائد مختلف زبانیں اور لہجے موجود ہیں۔ ان میں سے 17 زبانیں ایسی ہیں جنہیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف تین الفاظ ان 17 زبانوں میں بول کر دکھائیں یعنی'' ایک سو روپے۔''

ڈاکٹر صاحب کی مدد کے لیے میں انہیں سو روپے کا نوٹ بھی پیش کر دیتا ہوں۔ اس کرنسی پر یہ سترہ زبانیں موجود ہیں۔ انگریزی اور ہندی سمیت۔ انگریزی میں (One Hundred Rupees) تو وہ پڑھ ہی لیں گے۔ ہندی میں انہیں بتا دیتا ہوں ''ایک سو روپے'' باقی پندرہ زبانوں میں یہ تین الفاظ بیان کر دیں اور بمطابق آزمائش'' وہ یہ زبانیں خود بغیر پڑھے بول لیں گے۔''

مگر میں اس آزمائش کو آسان بنانے کے لیے ان کو مدد کر رہا ہوں کیونکہ میری خواہش ہے کہ کوئی تو اس آزمائش پر پورا اترے میں نے آج تک کسی کو اس پر پورا اترتا نہیں دیکھا۔

لہٰذا میں یہ نوٹ انہیں پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ تین الفاظ پندرہ زبانوں میں پڑھ دیں۔'' ایک سو روپے۔''

اب ہم آیات کا ذکر کرتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے: کتاب پیدائش باب نمبر 9 آیات نمبر 13 تا 17 جس میں طوفانِ نوح کے بعد جب دنیا اس میں غرق ہوگئی تھی اور پھر پانی اترنے پر خدا نے کہا۔

"میں نے ایک کمان (قوس وقزح) آسمان پر رکھی کے دنیا کو دوبارہ کبھی پانی کے ذریعے غرق نہ کروں گا۔"

سائنس سے نابلد شخص کہتا ہے کہ قوس وقزح تو ایسی نشانی خدا کی طرف سے ہے دنیا کبھی سیلاب سے غرق نہ ہوگی۔

لیکن آج سب کو علم ہے کہ قوس وقزاح سورج کے انعکاس کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ جب بارش یا دھند ہو۔ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام سے قبل بھی ہزاروں قوس وقزاح تھیں۔ یہ امر کس طرح مان لیا جائے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام سے قبل بادل تو ہوتے تھے۔ بارش تو برستی تھی لیکن قوس قزح نہیں بنتی تھی۔ کیا اس وقت (Law of Refraction) موجود نہیں تھا؟

اب ہم آتے ہیں علم طب کی جانب۔ انجیل میں گھر کو کوڑھ کی وبا اور طاعون سے بچانے کے لیے ایک طریقہ بتایا گیا ہے۔

کتاب احبار باب نمبر 14 آیات نمبر 49 تا 53۔

"دو پرندے لیں۔ ایک کو مار دیں۔

لکڑی لے کر اس کو چھیل لیں۔

زندہ پرندے کو بہتے پانی میں ڈبوئیں،

اور بعد ازاں 7 مرتبہ گھر پر اس کا چھڑکاؤ کریں۔"

گھر کو کوڑھ اور طاعون سے بچانے کے لیے خون کا چھڑکا؟ خون تو جراثیم، بیکٹیریا اور زہریلے مواد کے پھیلاؤ کا سبب ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر کیمپبل اس طریقہ سے اپنے آپریشن تھیٹر صاف نہیں کرتے ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نفاس کا خون، وہ خون جو بچے کی پیدائش کے دوران یا اس کے بعد آتا ہے ناپاک ہوتا ہے لیکن بائبل اس بارے میں کتاب احبار باب نمبر 12 آیات نمبر 1 تا 5 میں کہتی ہے۔

"اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کا لڑکا ہو۔

تو وہ سات دن ناپاک رہے گی۔
اس کے بعد تینتیس دن تک ناپاک رہے گی۔
اور اگر اس کے لڑکی ہو۔
تو وہ دو ہفتے ناپاک رہے گی۔
اس کے بعد چھیاسٹھ دن تک وہ مزید ناپاک رہے گی۔"

یعنی بیٹے کی پیدائش کی صورت میں 40 دن اور بیٹی کی پیدائش کی صورت میں 80 دن تک عورت ناپاک رہے گی۔

ڈاکٹر کیمپبل سے درخواست ہے کہ وہ وضاحت فرمائیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سائنسی طور پر عورت بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے۔

بائیبل میں شادی شدہ کی زناکاری کو ثابت کرنے کے لیے بھی ایک آزمائش بیان کی گئی ہے۔ کتاب اعداد باب نمبر 5 آیات نمبر 11 تا 13۔ میں فقط اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

"پادری کاہن مٹی کے ایک برتن میں مقدس پانی لے...... فرش کے گرد لے کر
اس پانی میں ڈالے...... اور وہ کڑوا پانی اس عورت کو بددعا کے بعد پلائے......
اگر وہ ناپاک ہوئی...... تو وہ پانی جو لعنت کو لاتا ہے اس کے پیٹ میں جا کر کڑوا
ہو جائے گا، اس کا پیٹ پھول جائے گا، اس کی ران سڑ جائے گی...... لیکن اگر وہ
ناپاک نہیں ہوئی بلکہ پاک ہے تو بے الزام ٹھہرے گی اور اس سے اولاد ہو گی۔"

کسی عورت کے کردار کو معلوم کرنے کا افسانوی طریقہ، سب کو علم ہے کہ آج کل عدالتوں میں اس قسم کے بے شمار کیس پوری دنیا میں فیصلے کے انتظار میں ہیں۔ جن میں عورت پر اس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ بدکردار ہے۔ بلکہ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس عظیم ملک امریکہ کے صدر جناب بل کلنٹن پر بھی چند سال قبل اس قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکی عدالتیں ایسے مواقع پر بائیبل میں بیان کردہ یہ امتحان کیوں نہیں لیتیں؟

ریاضی سائنس کا ایک انتہائی اہم شعبہ ہے۔ اس حوالے سے بائیبل میں ہمیں سینکڑوں تضادات نظر آتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند کا تذکرہ کافی ہے۔ کتاب عزرا باب نمبر 2 آیت نمبر 1 نحمیاہ باب نمبر 7 آیت نمبر 6 میں اقتباس ہے۔

"جب لوگ بابل سے جلاوطنی سے واپس آئے بادشاہ بخت نصر نے ان لوگوں کو
اسرائیل سے آزاد کیا وہ حالتِ محکومی میں لوٹے۔"

جب بنی اسرائیل کو بابل سے رہائی ملی تو وہ واپس آئے۔ان کی فہرست بائبل میں موجود ہے۔عزرا کے دوسرے باب کی آیات نمبر 2 تا 63 اور نحمیاہ باب نمبر 7 آیات 7 تا 65 ان آیات میں مکمل فہرست دی گئی ہے۔لیکن ان دونوں فہرستوں میں کم از کم 18 جگہ تضادات موجود ہیں۔نام بالکل ایک ہیں لیکن تعداد میں اختلاف ہے۔

مزید کتاب عزرا میں کل تعداد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ بتائی گئی ہے جب کہ نحمیاہ میں بھی کل تعداد یہی بتائی گئی ہے یعنی بیالیس ہزار تین سو ساٹھ لیکن جب میں نے خود اس تعداد کو جمع کیا تو جواب اس کے برعکس تھا۔

یعنی عزرا میں بیان کی گئی تعداد انتیس ہزار آٹھ سو اٹھارہ بنتی ہے۔اسی طرح نحمیاہ میں بیان کی گئی تعداد کو جمع کیا جائے تو وہاں بھی میزان اکتیس ہزار انانوے (31089) ہے۔

اگر بائیبل کا مصنف سیدھا سادا میزان بھی نہیں کر سکتا تھا اگر پرائمری پاس شخص سے یہ سوال کریں تو درست جواب دے گا۔

کیا نعوذ باللہ خدا گنتی بھی نہیں جانتا؟

آگے چلئے۔عزرا میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''ان کے ساتھ دو سو گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

جب کہ نحمیاہ میں کہا جا رہا ہے:

''اور ان کے ساتھ دو سو پینتالیس گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ تعداد سو تھی یا دو سو پینتالیس گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟ کیونکہ بات ایک ہی سیاق و سباق میں ہو رہی ہے لیکن ریاضیاتی تضاد موجود ہے۔اسی طرح سلاطین 2 کے باب نمبر 24: آیت نمبر 18 میں درج ہے۔

''اور یہویاکین جب حکمرانی کرنے لگا تو اٹھارہ برس کا تھا اور یروشلم میں اس نے تین مہینے حکومت کی۔''

لیکن تواریخ 2 کے باب نمبر 36 آیت نمبر 9 میں بیان ہے۔

''یہویاکین آٹھ برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن حکومت کی۔'' (آیت نمبر 9)

تضاد بالکل واضح ہے۔میں ڈاکٹر کیمپبل سے پوچھنا چاہوں گا کہ جب یہویاکین نے

سلطنت شروع کی تو اس کی عمر آٹھ برس تھی یا اٹھارہ برس؟ اور یہ بھی کہ اس کی حکومت کا عرصہ 3 مہینے یا تین مہینے اور دس دن تھا۔

مزید بائبل میں ہیکل سلیمانی کا ذکر کرتے ہوئے کتاب سلاطین کے باب 7 کی آیت نمبر 26 میں تحریر ہے:

''ہیکل سلیمانی میں اس کے سمندر میں 2 ہزار حمام تھے۔''

کتاب تواریخ باب نمبر 4 آیت نمبر 5 میں درج ہے۔

''وہاں تین ہزار حمام تھے۔''

اب میں ڈاکٹر کیمپبل پر چھوڑتا ہوں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ وہاں تین ہزار حمام تھے یا دو ہزار تھے؟

یہاں ایک واضح، ریاضیاتی تضاد ہمارے سامنے موجود ہے۔

مزید کتاب، سلاطین کے باب نمبر 15 کی آیات 34,33 سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال بعشا مر گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ایلہ حکومت کرنے لگا۔

لیکن تواریخ کا سولہواں باب نمبر 16 پڑھنا شروع کیجیے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ آسا کے چھتیسویں برس بعشا نے یہوداہ پر حملہ کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کس طرح یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا ہے؟ بالکل غیر سائنسی امر ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی آسانی کے لیے میں اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں تاکہ وہ اس کا جواب دے سکیں۔

اول نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق کائنات چھ دنوں میں یعنی 24 گھنٹے والے دنوں میں تخلیق ہوئی جو کہ ظاہر ہے کہ غیر سائنسی امر ہے۔

دوئم نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق روشنی کی تخلیق سورج اور ستاروں سے پہلے قبل ہوئی تھی، یہ غیر منطقی بات ہے۔

سوئم نکتہ یہ تھا کہ دن اور رات کی تشکیل زمین کے تخلیق ہونے سے قبل ناممکن ہے مگر بائبل ایسا ہی ظاہر کرتی ہے۔

چہارم نکتہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ بائبل کے مطابق نباتات کی تخلیق سورج سے پہلے ہوئی تھی۔ یہ غیر سائنسی بیان ہے کیونکہ پودوں کو اپنی نشوونما کے لیے سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی

ہے۔

پنجم نکتہ کہ زمین کی تخلیق سورج سے قبل بیان کی گئی ہے جو غیر سائنسی ہے۔

ششم نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی ہے۔

ہفتم نکتہ یہ تھا کہ زمین ہمیشہ قائم رہے گی یا فنا ہوگی؟

ہشتم نکتہ یہ کہ موبائل میں زمین کے ستون بیان کیے گئے ہیں۔

نہم یہ کہ آسمان کے بھی ستون بتائے گئے ہیں۔

دہم یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق تمام بیج دار پھل انسان کی خ ﷺ راک ہیں مگر ہمیں علم ہے کہ ان میں کئی انتہائی زہریلے بھی ہوتے ہیں۔

یازدہم نکتہ کہ بائبل میں ایک آزمائش بتائی گئی ہے جس سے ایک سچے مسیحی کا ایمان معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی مسیحی اس آزمائش کے لیے تیار ہے؟

دوازدہم نکتہ یہ کہ بیٹی کی پیدائش کی صورت میں ماں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے؟

سیزدہم نکتہ یہ کہ بائبل میں مکان کو کوڑھ و طاعون کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے خون چھڑکنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو کہ سراسر غیر سائنسی ہے۔

چہاردہم نکتہ یہ کہ بدکرداری معلوم کرنے کے لیے جو کڑوے پانی کا امتحان بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت درکار ہے۔

پانزدہم نکتہ یہ کہ بائبل میں ایک ہی جگہ ساٹھ سے بھی کم آیات میں 18 تضادات موجود ہیں۔ اور میں اسے ایک ہی نکتہ شمار کر رہا ہوں جبکہ یہ اٹھارہ نکات ہیں۔

شانزدہم نکتہ یہ کہ مندرجہ بالا معاملے میں دونوں جگہ تعداد مختلف ہے یعنی ایک تو بیان شدہ کل تعداد غلط ہے اور دوسرے دونوں ابواب میں میزان مختلف نکلتا ہے۔

ہفت دہم نکتہ بابل سے بنی اسرائیل کی رہائی کے وقت گویوں کی تعداد دوسو تھی یا دوسو پینتالیس؟

ہشت دہم نکتہ یہ کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر اٹھارہ برس تھی یا آٹھ برس؟

نیستم نکتہ یہ کہ اس نے حکومت تین ماہ کی تھی یا تین ماہ اور دس دن؟

بیستم نکتہ یہ کہ ہیکل سلیمانی میں ''دو ہزار حمام ہے'' یا ''تین ہزار حمام''

یک وبیستم نکتہ یہ کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کیونکہ یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا تھا؟

دو وبیستم نکتہ یہ کہ قوس قزح کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ طوفان نوح کے بعد خدا کے وعدے کی نشانی کے طور پر ظاہر ہوئی۔

میں نے بائبل میں موجود سینکڑوں سائنسی غلطیوں میں سے صرف بائیس کی نشاندہی کی ہے۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ وہ منطقی اور سائنسی طور پر ان 22 نکات کا جواب کبھی نہیں دے سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ انہیں انجیل عطا کی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ انجیل نہیں ہے۔ شاید اس میں جزوی طور پر وحی خداوندی موجود ہو لیکن مجموعی طور پر یہ انجیل قطعی وہ نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا غیر سائنسی اور غیر منطقی حصہ ہرگز اللہ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہے۔ میں اپنی تقریر کا خاتمہ اس قرآنی پر کرنا چاہوں گا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ٥﴾ (البقرہ:۷۹)

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔''

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

ڈاکٹر محمد:

میں حاضرین سے التجا کروں گا کہ برداشت کے ساتھ اس مذاکرے کو جاری رکھنے میں تعاون کریں۔ میں ولیم کیمپبل سے درخواست کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کو جواب دیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:

ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بعض حقیقی مسائل کو سامنے لائے ہیں جو کہ موجود ہیں میں تردید

نہیں کرتا کیونکہ تسلی بخش جوابات نہیں دے سکتا لیکن اس حوالے سے بات کروں گا...... (تالیاں)
ہم پیشن گویوں کا ریاضیاتی مطالعہ کریں گے جس کو نظریہ امکانات کہا جاتا ہے۔ ہم امکان کا اندازہ لگائیں گے کہ اتفاقاً پیشین گوئیاں پوری ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد:

میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کو دعوت دیتا ہوں کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا جواب دیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک:

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اٹھائے گئے 22 اعتراضات میں سے فقط 2 کا سرسری جواب دیا۔
آپ صرف 2 مسئلے حل کر سکتے ہیں۔

مسئلہ چھ دن کی تخلیق کا، پہلے دن روشنی اور تیسرے دن زمین کی پیدائش کے مسائل جبکہ بقایا 5 مسائل حل طلب ہیں۔ گویا کہ طویل دورانیے کا کہہ کر ڈاکٹر کیمپبل نے 2 سائنسی غلطیوں کا اعتراف کر لیا۔ شاہ جیمز کا مصرعہ اور نئی عالمی اشاعت جن کا ڈاکٹر کیمپبل نے حوالہ دیا کہ مہلک زہر پیو، کھاؤ نہیں ۔ انہیں نہیں علم کے یہاں بہت سے بھارتی موجود ہیں جو گجراتی، مراٹھی جانتے ہیں میرے سمیت اگر میں یہ بولوں شوچے؟ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے 20 اعتراضات کے جواب کی بجائے پیشن گویوں پر بات شروع کر دی۔ اس کا بائبل میں سائنس سے کیا تعلق؟ اگر پیش گوئی آزمائش ہے تو کسی ایک بھی وقوع پذیر نہ ہونیوالی پیش گوئی کا مطلب ہے کہ بائبل کلام الٰہی نہیں ہے جن کی میں فہرست دے سکتا ہوں۔

اگر آپ منطق کی بات کرتے ہیں تو ثابت شدہ سائنس سے ایک متضاد آیت بھی قرآن سے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ اگر ڈاکٹر ولیم کیمپبل قرآن کو نہیں سمجھتے تو اس سے قرآن کے غلط ہونے کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بائبل کتابِ ایوب باب نمبر 10 آیت نمبر 9 میں کہتی ہے۔
''ہم نے انسان کو مٹی سے بنایا۔ ابلے ہوئے دودھ اور نیم لچکدار پنیر کی مانند۔''
ابلا ہوا دودھ اور نیم لچکدار پنیر بلکل بقراط کے خیالات کی نقل ہے۔

جوابی تقریر

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:

بعض حقیقی مسائل کو نشاندہی ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کی ہے۔

علقہ اور مصنفہ کے بارے میں ان کے جواب سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں یہ اب بھی ایک برا مسئلہ ہے۔ لیکن یہ ان کا اپنا نقطہ نظر اور میرا اپنا نقطہ نظر ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو گھر جا کر اس مسئلے پر غور کرنا پڑے گا۔

ان کے مطابق وہ زہر کی آزمائش دینے والے کسی شخص سے نہیں ملے میں ایسا شخص یہاں بلا تو نہیں سکتا کیونکہ وہ زندہ نہیں رہا لیکن اس کا واقعہ بیان کر سکتا ہوں۔

ہیری رینکلف نامی میرے ایک دوست مراکش کے جنوبی علاقے کے ایک قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ اسی قصبے کے ایک شخص نے جسے وہ اپنا دوست سمجھتے تھے، ان کی دعوت کی۔ اس نے ان کی بیوی اور بیٹے کو بھی اس دعوت میں مدعو کیا۔ ہیری نے یہ دعوت قبول کر لی لیکن کسی شخص نے آ کر انکا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ وہ شخص انہیں زہر دینا چاہ رہا ہے۔ پھر بھی وہ گئے۔ ہیری نے اسی آیت جس کا آپ نے حوالہ دیا کہ روشنی میں فیصلہ کیا کہ وہاں جانا چاہیے۔ پس وہ دعوت میں گئے اس نیت کے ساتھ کے پلیٹیں تبدیل کر دیں گے مگر موقع نہ مل سکا۔ البتہ بیٹے کو خوب کھانا کھلا کر لے گے جبکہ ان کی بیوی نے بھی زیادہ نہ کھایا مگر ہیری نے کھایا۔

اس رات ہیری کو معدے کی تکلیف اور خون کی قے سے گزرنا پڑا مگر وہ زندہ رہا۔ دو روز بعد ہیری وہاں پھر گیا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس شخص کا باہر آتے ہی ہیری کو دیکھ کر رنگ سفید پڑ گیا جبکہ ہیری اس کا دعوت کا شکریہ ادا کر کے واپس ہو گیا۔ زندہ رہا۔ دو دن بعد ہیری اُس شخص کے گھر گیا، دروازے پر دستک دی۔ جب وہ باہر آیا تو ہیری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ لیکن ہیری دعوت کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

چونکہ یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تھا، لہٰذا میں نے سوچا اُسے کو سنا ہی دیا جائے۔

ایک بات آپ نے یہ کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہودیوں کے لیے رسول بنایا گیا تھا اور دیگر اقوام کے لیے نہیں۔

لیکن خود قرآن میں کہا گیا ہے:

﴿وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾

(مریم:۲۱)

''اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت۔'' (مریم ۲۱)

اسی طرح انجیل میں کہا گیا ہے:

''یسوع نے پاس آ کر ان سے باتیں کیں اور کہا آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' (متی باب ۲۸، ۱۹، ۱۸)

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو صرف یہودیوں کی طرف روانہ ہونے کے لیے بھی کہا تھا اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ یہودیوں کو ایک یقینی موقع دیا جانا تھا۔

انجیل میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے...... بلکہ شاید مجھے ''کہانی'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے، یہ تو تاریخ ہے...... ہاں تو حکایت کچھ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک انجیر کے درخت کے پاس آئے۔ اس درخت پر تین سال سے پھل نہیں آیا تھا۔ جب اس درخت کو اکھاڑنے کا پوچھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''نہیں'' سال مزید انتظار کرو اور دیکھو، ممکن ہے پھلدار ہو جائے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ ایک تمثیل تھی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین سال تک انہیں تبلیغ کی تھی اور چھ ماہ تک مزید تبلیغ کرنی تھی۔ اسی طرح مزید تمثیلات بھی موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ نعمت ان سے لے کر غیر اقوام کے حوالے کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر نائیک نے ''دن'' کے ضمن میں ''زمانوں'' کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ بائبل میں ''دن'' کے لفظ سے مراد ایک طویل زمانہ بھی ممکن ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے 24 گھنٹے والا دن ہی مراد ہو جیسا کہ ڈاکٹر موریس بوکائیے نے اپنی کتاب میں ثابت کرنے کی کوششوں کی میں سمجھتا ہوں کہ اس سے طویل زمانے مراد ہیں۔ دیگر مسائل بھی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر نائیک نے کیا ہے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسائل موجود ہیں اور ان کے مناسب جوابات میں نہیں دے سکتا۔

لیکن میں یہاں اس حوالے سے بات ضرور کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے دو طرح کے پانی کا ذکر کیا، نمکین پانی اور میٹھا پانی۔ اس سلسلے میں ان کی وضاحت سے غیر مطمئن ہوں۔ قرآن

یہ کہتا ہے کہ دو طرح کے پانی ہیں جو ملتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے جو انہیں ملنے نہیں دیتا۔ یہاں پردہ کے لیے قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے برزخ، برزخ کے معانی وقفہ، رکاوٹ، فاصلہ وغیرہ ہوتے ہیں۔

یہی بات سورۂ فرقان میں بھی کہی گئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝﴾

(الفرقان:۵۳)

”اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان، ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔“

ایک فاضل حد جسے عبور کرنا منع ہے۔ عربی کے دو الفاظ ایک ہی نوعیت کے استعمال ہوئے ہیں۔ عربی میں ایسا تب کیا جاتا ہے جب کسی بات پر زور دیا جانا مقصود ہو۔ تاکید مقصد ہو لہٰذا یہاں ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ کوئی باقاعدہ روک ہے جو کہ دونوں طرح کے پانیوں کے مابین موجود ہے۔

لیکن میرے دوست نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں طرح کے پانی الگ الگ رہتے ہیں۔ یعنی نمکین پانی اور تازہ پانی ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بوکائیے نے مختصراً اس حوالے سے بحث کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ سمندر میں آگے جا کر بالآخر پانی کے دھارے آپس میں مل جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اتنی زیادہ مقدار میں پانی کے حلول کے لیے کچھ وقت لگتا ہے۔

ایک سائنس دان دوست کا اس پر تبصرہ اس طرح ہے کہ ”یہ تو فقط نمکین اور تازہ آب ہیں جو جسمانی طور پر (فزیکلی) جدا ہیں دریا کے پانی کا بہاؤ سمندر کے پانی کو دھکیلتا ہے مگر کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ حرارت اور توانائی کے اصول کے مطابق ملاپ ایک غیر ارادی فوری فعل ہے جس کو entropy کی حمایت حاصل ہے واحد رکاوٹ Canonic ہے۔ بڑی مقدار کے ملنے میں وقت تو لگتا ہے۔ اس ضمن میں چھوٹی سی ذاتی مثال پیش خدمت ہے۔

تیونس میں میرا ایک دوست ہے جو آکٹوپس مچھلی پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ میں اس سے ملنے گیا۔ میں پانی میں تیراکی کر رہا تھا کہ گاڑی میں اچانک محسوس ہوا کہ پانی اوپر سے ٹھنڈا اور نیچے سے

گرم ہے۔ میں حیران ہوا کہ کس طرح ممکن ہے کہ اوپر ٹھنڈا پانی نیچے گرم؟ پھر معلوم ہوا کہ ٹھنڈا پانی دریا سے آرہا تھا۔ سمندری پانی چونکہ نمکین ہونے کی وجہ سے بھاری تھا ہے، لہٰذا وہ نیچے تھا اور ٹھنڈا پانی ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر تھا۔ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے زبانوں کی بات کی اور یقیناً میں ہندوستانی زبانیں نہیں بول سکتا لہٰذا کوئی فرق نہیں امریکہ اور ہندوستان سے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انجیل کے جس مقام کے بارے انہوں نے کہا وہاں ذکر ہے حواریوں کا جنہیں یہ صلاحیت ایک معجزے کے طور پر دی گئی تھی۔ یہ وہ زبانیں تھیں جو وہاں کے موجود لوگ بولا کرتے تھے نہ کہ دنیا بھر کی چھوٹی چھوٹی اور گمنام زبانیں ہوتا یہ تھا کہ سپین سے آنے والے شخص کے ساتھ حواری سپینش میں بات کرتا۔ اگر کوئی ترکی سے آتا تو ترکش میں اس کو جواب دیتا۔

اب ہم شاہدین کے تذکرے کرتے ہیں۔ پیشن گویاں سچے نبی کو پہچاننے کا ذریعہ ہی ہیں۔ پیشین گویوں کے سچا ہونے پر نبی کے سچا ہونے کی جانچ کا طریقہ خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کی ایک تمثیل ہے جن کا قرآن میں اس طرح ذکر ہے کہ وہ بادشاہ کے پاس گئے اور اسے بتایا:

''اس وقت تک بارش نہ ہوگی جب تک میں نہ کہوں گا۔''

لہٰذا چھ ماہ اور پھر ایک سال گزرنے کے باوجود بارش نہیں ہوئی۔ دوسرا سال تیسرا اور ساڑھے تین سال گزر گئے۔ پھر الیاس علیہ السلام بادشاہ کے پاس گئے اور اسے مقابلے کی دعوت دی۔ وہ کوہ کارمل پر گئے جہاں مقابلہ میں بادشاہ ہار گیا۔ قرآن کے مطابق الیاس علیہ السلام نے اپنی شاندار فتح کے بعد گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بارش کی دعا کی جو ہوئی اس لیئے الیاس علیہ السلام پہلے شاہد ہیں۔

دوسری تمثیل Isaiah کی 750 قبل مسیح کو ہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ یہودیوں کو جلاوطن کردیا جائے گا پھر سائرس ان کو واپس لائے گا۔ یہودی جلاوطن ہوئے ڈھائی سو برس بعد فارس کے بے دین بادشاہ سائرس نے انہیں واپس اسرائیل کے پاس فلسطین بھیجا۔ پس آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گویاں سچ ثابت ہوئی ہیں؟ کیا عیسیٰ علیہ السلام نے معجزے دکھائے؟

ہم پیش گوئیوں کا ریاضیاتی تجزیہ کریں گے۔ اس نظریے کو نظریہ امکانات بھی کہتے ہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ بالغرض ڈاکٹر ذاکر نائیک کے پاس دس قمیصیں ہیں اور ان میں سے ایک کا

رنگ سرخ ہے۔اب میں پیش گوئی کروں کہ ''کل ڈاکٹر ذاکر نائیک سرخ قمیض پہنیں گے۔'' اور بلغرض اگلے دن واقعی ڈاکٹر نائیک سرخ قمیض پہنتے ہیں۔اگر میں اپنی اس پیش گوئی کو بنیاد بنا کر نبوت کا دعویٰ کروں تو کیا ہوگا؟ میرا ہر دوست کہے گا کہ نہیں نہیں، یہ تو فقط اتفاقیہ ہوا ہے۔

لیکن بالغرض میں ایسی ہی پیش گوئی ڈاکٹر سمویل نعمان کے حوالے سے بھی کرتا ہوں کہ وہ اپنی تین جوتیوں میں سے کل کون سی جوتی پہنیں گے، اسی طرح ڈاکٹر نبیل احمد کے بارے میں بھی کہ وہ اپنی پانچ ٹوپیوں میں سے کل کون سی ٹوپی پہنیں گے تو میری ان تین پیش گوئیوں کے بیک وقت درست ثابت ہونے کے ممکنات کتنے ہیں؟

ڈیڑھ سو میں سے ایک امکان ہے۔ہم یہاں دس پیش گوئیوں کا ذکر کریں گے۔محدود کے باعث صرف دس پیش گوئیوں کا ذکر اول پیشگوئی یرمیاہ میں 600 سال قبل مسیح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نسل کے حوالے سے ہے کہ وہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت داؤد کی نسل سے ہوں گے خدا کا فرمان تھا کہ وہ دن آئیں گے جب داؤد علیہ السلام کی نسل سے ایک صحیح دوست پیدا کروں گا ایسا بادشاہ جو عقلمندی سے وانصاف کے ساتھ حکومت کرے گا۔اور یسوہ اویا راست باز کہلائے گا۔ چھٹے ماہ یہ پیشنگوئی پوری ہوئی جب حضرت جبریل علیہ السلام کو مریم علیہ السلام کے پاس بھیجا جس نے مریم سے کہا۔

> ''مریم مت ڈرو، تم حاملہ ہونے کے بعد ایک بیٹے کو پیدا کرو گی جو عیسیٰ علیہ السلام کہلائے گا۔وہ عظیم ہوگا اور عظیم ترین کا بیٹا کہلائے گا۔اور خداوندِ مالک اس کو اس کے باپ داؤد علیہ السلام کا تخت عطا کرے گا اور اس کی سلطنت کو کوئی سرحد نہ ہوگی۔'' اور فرشتے نے اس کو کہا۔
>
> ''روح القدس تم پر نازل ہوگی اور خدا کی قوت تم پر سایہ کرے گی۔لہٰذا پیدا ہونے والا بچہ مقدس کہلائے گا۔''

درست داؤد علیہ السلام جو ابتداء میں معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جب بادشاہ بن گئے اور ان کا خاندان مشہور ہو گیا تو ہر کسی کو یاد ہوگا کہ بادشاہ کا بانچو کذن بھی تھا۔لہٰذا میرا خیال ہے کہ ہر دو سو میں سے ایک یہودی خاندان داؤد علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا۔

دوئم پیشگوئی میکاہ میں 750 ق م میں کی گئی کہ دائمی حاکم بیت اللحم میں پیدا ہوگا۔

> ''مگر بیت اللحم (Ephrathah) جو یہودہ کے قبیلہ میں کم جانے جاتے ہو سے میرے لیے ایک شخص آئے گا جو بنی اسرائیل کا حاکم بنے گا۔جس کا سلسلہ

نسب پرانا اور قدیم ہوگا۔"

اور تکمیل کیسے ہوئی !اگر چہ یوسف اور مریم علیہ السلام نزار یتھ میں رہائش پذیر تھے، لیکن قیصر آگسٹس کے ایک حکم کے سبب یوسف کو مریم علیہ السلام کو بیت الحم اپنے آبائی قصبہ لے جانا پڑا۔ تکمیل پیشگوئی کے سلسلہ میں بیان ہے۔

"اور یوسف نزار یتھ شہر کے علاقہ گلیلی سے داؤد علیہ السلام کے شہر جودیا جس کو بیت اللحم کہتے ہیں گیا۔"

جوزف داؤد علیہ السلام کے خاندان ونسب سے تھا۔ اور وہاں مریم علیہ السلام نے پہلے بیٹے کو پیدا کیا۔

بیت الحم میں پیدا ہونے کا اتفاق کیوں ہوا؟ دنیا میں میکاہ کے وقت سے لے کر اب تک 2 ارب لوگ پیدا ہوئے ہیں اور بیت الحم میں سات ہزار لوگ رہتے تھے یعنی ہر دو لاکھ اسی ہزار میں سے ایک بیت الحم میں پیدا ہوا۔

سوئم پیشگوئی کتاب الملاکی کے باب نمبر 3 آیت نمبر 1 میں ہے مسیح کے لیے راستہ ہموار کرنے والے پیغمبر کی آمد سے متعلق ہے۔

"دیکھو میں پیغمبر بھیجوں گا جو میرے لیئے راہ ہموار کرے گا۔ اور جس مالک کے تم خواہاں ہو اچانک اپنی عبادت گاہ میں آموجود ہوگا۔ ہاں دور کا پیغمبر جس کے تم طالب ہو۔ میزبانوں کا خدا کہتا ہے کہ وہ آرہا ہے۔"

تکمیل:

اگلے ہی روز ہوئی۔ بپتسمہ کا جمان یحییٰ ولد ذکریا نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

"دیکھو خدا پر جان دینے والا جو دنیا کے گناہوں کو دھو ڈالے گا۔" یہ وہ ہی ہے جس کا ذکر میں نے کیا میرے بعد میرے سے پہلے مقام ومرتبہ والا آئے گا۔"

کیونکہ اس کا وجود مجھ سے پہلے تھا۔"

اس سلسلے میں قرآن اس قصے سے متفق ہے۔ سورہ آل عمران باب نمبر 3 آیات نمبر 39 تا 41 میں بیان ہے۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ص وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ ﴾

(آل عمران:۳۹ تا ۴۵)

"فرشتوں نے آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابط ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔" زکریا علیہ السلام نے کہا "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" جواب ملا: "ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا "مالک، پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے۔" کہا "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔"

پھر وہ وقت آیا جب مریم علیہا السلام سے فرشتوں نے آکر کہا۔ ''اے مریم علیہا السلام! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریم علیہا السلام اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ۔ اس کے آگے سر بہ سجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔''

اے نبی ﷺ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم علیہا السلام کا سرپرست کون ہو؟ اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریم علیہا السلام! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔''

خیر کتنے رہنماؤں کا نقیب آچکا ہے؟ خیر یہ کہنا مشکل ہے میں یہ کہوں گا کہ ایک ہزار میں سے کوئی ایک ہی رہنما کا نقیب پہلے آچکا ہوگا۔

چہارم پیشگوئی عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات ونشانیوں کے ہونے کی ہے۔ انجیل 750 میں تحریر ہے۔

''ڈرے ہوئے دل والوں سے کہہ دو کہ مضبوط ہوں اور خوف نہ کریں تمہارا خدا آکر تمہیں بچائے گا۔ تب اندھوں کو آنکھیں ملیں گی۔ بہروں کو سنائی دیا جانے لگے گا۔ تب لنگڑ ہرن کی مانند چھلانگیں لگائے گا اور گونا اپنی زبان سے خوشی سے چیخنا شروع کر دے گا۔''

اور تکمیل!

ہم انجیل اور قرآن دونوں میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کس قدر معجزات وقوع پذیر ہوئے بائبل میں صرف چار پیغمبروں کا معجزات کے حوالے سے ذکر ہے بعض اوقات عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آنے والے بھی لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔

بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ انبیائے کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور

ہم کہیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام 1,24,000 انبیاء علیہ السلام میں سے واحد تھے، جن پر یہ پیش گوئی صادق آتی ہے۔

پنجم پیش گوئی یہ کہ ان کے بھائی ان کی مخالفت کریں گے۔ چونکہ بہت سے رہنماؤں کے رشتہ داران کے مخالف ہوتے ہیں۔ ایک ہزار سال قبل مسیح حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ایک گیت میں کہتے ہیں کہ:

"میں اپنے بھائی کے لیے اجنبی ہو گیا ہوں اور اپنی ماں کے بیٹوں کے لیے دشمن۔"

تکمیل جون میں بیان کی گئی ہے۔

"لہٰذا اس کے بھائیوں نے اس کو یہ مقام چھوڑ کر "جودیا" روانہ ہونے کو کہا کیونکہ وہ بھی اس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔"

پیشن گوئی کے پورا ہونے کے امکانات کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ میں سے ایک امکان تھا۔

ششم پیش گوئی جو کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے 520 ق م میں کی، اور وہ یہ کہ مسیح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوگا۔

ذکریا علیہ السلام خوشی سے پکار اٹھے کہ:

"اے دختران قوم یہود خوش ہو جاؤ، آواز دے اے دختر یروشلم، دیکھو تمہارا بادشاہ آ رہا ہے جو انصاف کرنے والا اور نجات دلانے والا ہے بہت سادگی کے ساتھ گدھے پر سوار ہو کر۔"

تکمیل! زیتون کی شاخیں ہاتھ میں پکڑے لوگوں کا بڑا جلوس اس کے استقبال کے لیے نعرے لگاتا ہوا آیا۔ "نعرہ تحسین" برکت ہو اس پر جو اپنے مالک کے نام پر آیا ہے۔ بادشاہ بنی اسرائیل پر رحمت ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کو ایک جوان گدھا ملا اور وہ اس پر سوار ہو گئے۔ خیر ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے گدھے کو سواری کے لیے منتخب کیا جو غیر معمولی امر نہیں ہے اور نہ ہی معجزہ لیکن وہاں موجود ہجوم نے ان کی تعظیم کی۔ اور آقا کے نام سے آنے والے پر رحمت بھیجی۔

کتنے حکمران ہیں جو گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوں گے۔ آج کل تو ظاہر ہے لوگ مرسڈیز کاروں میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی میرے خیال میں سو میں ایک چانس تھا۔

ہفتم پیش گوئی ہیکل کی تباہی سے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود کی تھی۔ کسی وقت تقریباً 30ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش گوئی کی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ہیکل سے باہر نکلے تو ایک حواری نے خوبصورت پتھروں اور خوبصورت عمارتوں کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔

''کیا تم یہ عظیم عمارتوں کو دیکھ رہے ہو۔ ایک پتھر بھی دوسرے پر نہ رہے گا اور سب نیچے پھینک دیئے جائیں گے۔''

تکمیل 40 سال بعد رومن جنرل ٹائی ٹس نے 70ء میں طویل عرصہ تک محاصرے کے بعد یروشلم پر قبضہ کیا۔ گو کہ خود اس کی نیت نہیں تھی لیکن یہودیوں نے اس کو آگ لگادی۔

اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان پانچ میں سے ایک تھا۔ کیونکہ یہودیوں کی بغاوت اور پھر ان کا کچلا جانا کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔

ہشتم پیشنگوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لٹکائے جانے کے حوالے سے ہے۔ کتاب (Psalms) میں داؤد علیہ السلام نے ایک ہزار قبل مسیح میں تحریر کیا۔

''بدی کے لوگوں کے گروہ نے مجھے محاصرے میں لیا ہوا ہے جنہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کو سوراخ کر دیئے ہیں۔''

خیر حضرت داؤد علیہ السلام نے تو بستر مرگ پر وفات پائی ان کے ہاتھ پاؤں میں سوراخ نہیں کیا گیا تھا۔ لیوک (Luke) اس کی تکمیل کا ذکر کرتا ہے۔

''جب وہ ''سکل'' نامی مقام پر پہنچے تو وہاں انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مجرمان کے رمیان مطلوب کیا۔ ایک ان کے دائیں اور دوسرا بائیں طرف تھا۔''

کتنے لوگ مصلوب ہوئے ہیں؟ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس پیش گوئی کے پورے ہونے کا امکان دس ہزار میں سے ایک تھا۔

نہم پیش گوئی یہ کہ لوگ اس کے کپڑے آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ جو کہ داؤد علیہ السلام کے الفاظ ہیں کہ میرے کپڑے آپس میں تقسیم کر کے لباس کے لیے قرعہ اندازی کی۔

تکمیل جہاں نے باب نمبر 19 میں کی ہے۔

''سپاہیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنے کے بعد ان کے کپڑے چار حصوں میں بانٹ لیئے۔ صرف زیر جامہ جو کے غیر سلا ہوا تھا اوپر سے نیچے تک ایک ہی بنائی کا لہٰذا اس کے ٹکڑے کرنے کو بجائے قرعہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ کتنے مجرموں کے کپڑے تقسیم ہوتے ہیں۔ کے پورا ہونے کا امکان، تقریباً سو میں سے ایک تھا۔ دہم پیشنگوئی بے گناہ ہونے کے باوجود وہ اپنی موت کے لحاظ سے

،گناہ گاروں اور امیر لوگوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔"

750ق م میں (Isaiah) نے اس کو مکاروں اور سرمایہ داروں والی جگہ ملنے کی پیشگوئی کی۔ گو کہ اپنی زندگی میں تشدد نہ کرنے اور دھوکہ نہ دینے کے باوجود اس کا شمار حد سے تجاوز کرنے والوں میں ہوا۔ بائبل میتھیو بیان کرتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو دو ڈاکوؤں کے ساتھ مصلوب کیا اور اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان ہزار میں سے ایک تھا۔

آخری پیش گوئی یہ کہ مصلوب ہونے کے بعد وہ دوبارہ جی اُٹھے گا۔ اس پیش گوئی کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی قدر وابستہ کی ہی نہیں جا سکتی۔

اب ہم ذرا ان تمام پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے امکانات کا حساب لگاتے ہیں یہ امکان دو کھرب 80 ارب) 28,0,000,000,000 میں سے ایک ہے۔

اندازہ لگانے کے لیے فرض کریں کہ پوری ریاست ٹیکساس میں ایک ایک ڈالر کے سکوں کی ایک میٹر بلند تہہ بچھا دی جائے اور پھر آپ کو اس میں سے مخصوص نشان لگا ہوا سکہ ڈھونڈنے کو کہا جائے تو جس قدر ممکنات آپ کے وہ سکہ ڈھونڈ لینے کے ہے، اسی قدر ممکنات اس ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا ہے۔ بالفاظ دیگر کوئی امکان نہیں ہے۔

ایسی بہت سی دیگر پیش گوئیاں بھی ہیں اور یہ ثبوت ہیں اس بات کا کہ انجیل برحق ہے اور یہوواہ الوہیم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

انجیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے جو کہ اچھی خبر ہے لیکن قرآن کی خبر بہت سخت گیر ہے۔ سورہ نحل باب نمبر 16 آیت نمبر 61 میں کہا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ (النحل:٦١)

"اگر کہیں اللہ لوگوں غلطیوں کے سبب کرتا تو زمین پر کسی کو زندہ نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔"

مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہترین عمل کر لیں، ان کے بارے میں بھی قرآن محض ایک

مکان ہی پیش کرتا ہے، یعنی "شاید۔"

سورۂ قصص باب نمبر 28 آیت نمبر 67 میں بیان ہے۔

﴿فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ○﴾ (القصص:٦٧)

"(غالباً) البتہ جس نے آج توبہ کرلی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہ ہی یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔"

یعنی وہ بھی یقین نہ رکھے، بلکہ محض توقع ہی رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح سورۂ تحریم باب نمبر 66 آیت نمبر 8 میں ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ○﴾ (التحریم:8)

"اے ایمان لانے والو اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کردے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرمادے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔"

سورۂ توبہ باب نمبر 9 آیت نمبر 18 میں تحریر ہے۔

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ○﴾ (التوبہ:١٨)

"اللہ کی مسجدوں میں وہ ہی عبادت گزار ہوسکتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ خوفزدہ ہوں۔ انھی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔"

گویا بالآخر تنہائی ہے۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں لاتا تو وہ یقینی طور پر جہنم میں جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایمان لے بھی آتا ہے تو روزِ حشر وہ یک و تنہا خدا کے سامنے کھڑا ہوگا۔ نہ کوئی دوست نہ

سفارش کرنے والا۔ اور محض توقع ہی کر سکتا ہے، امید ہی رکھ سکتا ہے کہ شاید اس کا شمار معاف کیے جانے والوں میں ہو جائے۔ اور یہ بڑی سخت خبر ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں لفظ "عسیٰ" استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے ہو سکتا ہے، "امکان ہے" "توقع ہے" "غالباً" دوسری طرف انجیل ہمیں خوشخبری سناتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میں خدمت کروانے کے لیے نہیں بلکہ خدمت کرنے کے لیے آیا ہوں تاکہ اپنی زندگی، بہت سی زندگیوں کے کفارے میں دے سکوں۔"

اسی طرح بائبل میں پال کہتا ہے۔

"اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاؤ اور دل سے یہ یقین رکھو کہ خدا نے انہیں مردوں میں سے اٹھا لیا تھا تو تمہاری نجات یقینی ہے۔"

یہ ایک حیرت انگیز طور پر خوش کن خبر ہے۔ آپ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ثبوت کے طور پر پڑھیں۔ 500 لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں سے زندہ اٹھانے کے بعد دیکھا تھا۔ بہت سے آثار قدیمہ بھی بائبل کی تائید کرتے ہیں۔

میں آپ سب کو پیش کش کرتا ہوں کہ آپ بائبل کا (گوسپل) ایک نسخہ لیں۔ اسے پڑھیں کے بہت سی خوش خبریاں ملیں گی۔ آپ کو اپنی روح کے لیے خدا آپ سب پر اپنی رحمت کرے۔ بہت بہت مہربانی۔

❁❁❁

جوابی تقریر

ڈاکٹر ذاکر نائیک:

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، سٹیج پر تشریف فرما دیگر معززین، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو اسلامی طریقے سے ایک بار پھر سلام کرتا ہوں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے صرف دو نکات کا تذکرہ کیا ہے۔ اول نکتہ جو انہوں نے اٹھایا یہ تھا کہ ان کے خیال میں بائیبل میں دنوں کا ذکر طویل ادوار کے

معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے جواب دے چکا ہوں کہ اگر آپ دنوں کو طویل عرصہ گردانیں جیسا کہ قرآن میں بیان کئے گئے ہیں تو آپ صرف دو معاملات سلجھا سکتے ہیں۔ پہلے دن روشنی اور چھٹے دن زمین پیدا ہوئی۔ جبکہ بقایا چار مسائل حل طلب رہیں گی۔ لہٰذا ڈاکٹر ولیم نے اس بات کا انتخاب کیا کہ دن طویل عرصہ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ کائینات کی تخلیق کے مسائل کے حوالے سے وہ مستفق ہیں۔ جو اچھی بات ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔

دوئم نکتہ مرقس کی انجیل باب نمبر 16 آیات نمبر 17 اور 18 میں بیان کی گئی سائنسی آزمائش کے حوالے سے تھا جس کے متعلق انہوں نے ہیسری نامی اپنے ایک دوست کا ذکر کیا جو مراکش میں تھا جس نے زہر کھایا بائیبل کے شاہ جیمز کے متن میں جبکہ نئے عالمی متن جس کا ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے حوالہ دیا میں زہر پینے کے حوالے سے ہے کھانے کے نہیں۔

پھر بھی مجھے اعتراض نہیں کہ اگر کوئی شخص شئے کھاتا ہے۔ لیکن ذرا تصور کریں ایک شخص، وہ بھی مراکش میں، دنیا میں دو ارب مسیحی ہیں۔ ان دو ارب لوگوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں آسکتا؟

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل خود ایک سچے مسیحی ہیں، وہ خود اس آزمائش کے لیے آگے بڑھیں گے، نہ کہ ان کا دوست جو پہلے ہی فوت ہو چکا ہے۔

نیز انہوں نے کہا کہ "منہ سے خون آیا" ڈاکٹر ولیم کیمپبل اور حتیٰ کے میں بھی بحیثیت ڈاکٹر جانتے ہیں کہ زہر خوانی سے خون آتا ہے اور ہم نے زہر کے کئی لوگوں کا علاج کیا ہے۔ لہٰذا اصل آزمائش تو یہ ہے کہ آپ آگے آئیں یہ تمام اعمال دہرائیں اور اس کے بعد بھی غیر ملکی زبانیں بولنے کے قابل رہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے کہا کہ اُس دور میں مرقس کی انجیل باب نمبر 16 میں پڑھیں کہ وہاں کے لوگ آشنا اور غیر زبانیں بولا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو علم نہیں کہ یہاں باہر ہندوستانی موجود ہیں جو گجراتی، مراٹھی جانتے ہیں حتیٰ کہ مجھے بھی یہ زبانیں آتی ہیں۔

اگر میں آپ سے پوچھوں "شو چے"؟ بلغرض اگر میں آپ سے مخصوص زبان میں سوال کروں "شہر کر، تامل کوئی جواب نہیں۔ غیر زبانیں ...... نہر کد ...... کوئی ہے جو تامل یا ملائم زبان جانتا ہوں۔

حاضرین:

خوش آمدید۔

ڈاکٹر ذاکر.

جی ہاں۔ بہت خوب۔ کیا آپ مسیحی ہیں؟ نہیں میں اس شخص سے پوچھ رہا ہوں۔ آپ مسلمان ہیں؟ خیر بہت خوب۔ یہ مسیحی اعتقاد والوں کے لیے اچھی آزمائش ہوسکتا تھا، یہاں بہت سے لوگ ہیں جو غیر ملکی زبانیں جانتے ہیں صرف ایک سوال آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں آپ کا نام کیا ہے؟......آپ کیسے ہیں؟ مثال کے طور پر کیفِ حالکہ عربی میں جس سے آپ واقف ہیں۔ نئی زبانیں جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اور آپ نے میرا نکتہ ثابت کر دیا۔ ابھی تک کوئی ایک مسیحی بھی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے یہ آزمائش کو پورا کیا ہو۔

اگر آج تک اس امتحان میں ناکام ہونے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی تو آج ایک ہزار ایک ہوگئی ہے، ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے میری ملاقات کے بعد۔

میری جانب سے اٹھائے گئے بائیس نکات میں سے ڈاکٹر ولیم نے انہی دو نکات کا ذکر کیا اور بقایا بیس نکات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی بجائے پیش گوئیوں پر بحث شروع کر دی۔ پیش گوئیوں کا اس موضوع، یعنی ''بائبل اور جدید سائنس'' سے کیا تعلق ہے؟ اگر پیش گوئیاں ہی معیار ہیں تو پھر سٹراڈیمس کی کتاب بہترین کتاب ہے۔ جس کو اس بنیاد پر کلام خداوندی تسلیم کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹر ولیم نے امکانات کے نظریہ کا اطلاق بائبل کی پیش گوئیوں پر کیا۔ اگر آپ اس نظریہ کا درست اطلاق دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' کا مطالعہ کیجئے۔

کے صحیح معنوں کے اطلاق پر بات کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' کو پڑھیں۔ اگر میری خواہش ہو تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔

اور انجیل کی ان پیش گوئیوں کو غلط ثابت کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ جتنی پیش گوئیوں کا ذکر انہوں نے کیا وہ سب مکمل طور پر صحیح ہیں۔ لیکن ان کے طرزِ استدلال سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انجیل کی ایک بھی پیش گوئی غلط ثابت ہو جانے کا مطلب، یہ ہوگا کہ یہ کتاب خدا کی نازل کردہ نہیں ہے میں ایسی پیش گوئیوں کی پوری فہرست آپ کے سامنے لا سکتا ہوں۔

مثلاً کتاب پیدائش کے باب نمبر 4 آیت نمبر 12 میں قائن کو مخاطب کیا گیا ہے۔

''تو کبھی بھی زمین پر آباد ہونے کے قابل نہ ہوگا اور بھٹکتا رہے گا۔''

بعد ازاں کتاب پیدائش کے ہی باب نمبر 4 آیت نمبر 17 میں بیان ہے۔

''قائن نے ایک شہر بسایا۔'' پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔

کتاب یرمسیاہ کے باب نمبر 36 آیت نمبر 30 میں بیان کیا گیا ہے۔

(Jehoiacin Sloditto) کوئی اس قابل نہ ہوگا۔

کہ تخت پر بیٹھے، داؤد کے تخت پر...... کے بعد کوئی نہ بیٹھ سکے گا۔ لیکن آپ سلاطین کے چوبیسویں باب کی آیت کو نمبر 6 کو پڑھیں جس میں تحریر ہے۔

''اور یہو یقیم اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور اس کا بیٹا یہویا کین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔''

پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

صرف ایک ہی پیش گوئی کا غلط ہونا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ انجیل کلام خداوندی نہیں ہے۔ لیکن بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

حزقی ایل، باب 26، کی آیت نمبر 8 میں بتایا گیا ہے کہ بنوکدرضر شاہِ بابل، صور کے شہر کو تباہ کرے گا لیکن ہم سب کو علم ہے کہ سکندر اعظم نے اس کو تباہ کیا پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

یسعیاہ، باب نمبر 7، آیت نمبر 14 میں کہا گیا ہے:

''دیکھو، ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔''

ان کا کہنا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جو کنواری سے پیدا ہوئے۔ یہاں عبرانی لفظ عملہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ''کنواری'' نہیں ہیں بلکہ ''جوان عورت'' کے ہیں۔ کنواری کے لیے عبرانی میں لفظ بیتولا استعمال ہوتا ہے۔ جو یہاں نہیں ہے۔ ہم بلفرض ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعتاً یہاں لفظ کنواری استعمال ہوا ہے لیکن اس آیت کے مطابق ان کا نام عمانوایل ہوگا اور پوری بائبل میں کسی بھی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عمانوایل کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

میں مزید بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن میں نے پہلے کہا کہ صرف ایک مثال یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ بائبل کلام خداوندی نہیں ہے۔ میں نے کافی مثالیں پیش کر دی ہیں۔ آپ کے پیش کردہ نظریہ امکان کے مطابق بھی ثابت ہوا کہ بائبل خدا کی نازل کردہ کتاب

نہیں ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے کہا کہ قرآن کے مطابق حضرت الیاس علیہ السلام نے جنگ میں کامیابی حاصل کی جبکہ بائیبل کے مطابق حضرت الیاس علیہ السلام کو جنگ میں شکست ہوئی۔حقیقت جو بھی ہو اسے بائیبل کے صحیح اور قرآن کے غلط ہونے کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔اگر ہر دو کتب میں تضاد موجود ہے تو آپ اس کا یہ مطلب لیں کے بائیبل کلام خدا ہے!

اگر ہر دو کتب کا تجزیہ کیا جائے ممکن ہے کہ قرآن درست ہو اور بائیبل غلط ،ممکن ہے بائیبل درست قرآن غلط (نعوذ و باللہ) ایسا بھی ممکنات میں سے ہوسکتا ہے کہ دونوں غلط یا دونوں صحیح ہوں۔اگر آپ نے دونوں کا تجزیہ کرنا ہو تو آپ کو باہر سے تیسرا ذریعہ دیکھنا ہوگا جو مصدقہ ہوسکتا ہے ۔صرف اسی وجہ سے کہ بائیبل کے مطابق الیاس علیہ السلام ناکام ہوئے اور قرآن کے مطابق کامیاب ہوئے قرآن کو غلط قرار دینا غیر منقطی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے اُٹھائے ہوئے نکات کا جواب دینے کے علاوہ بھی چھ سات باتوں کا اضافہ کیا جن کا میں انشاء اللہ مختصراً جواب ضرور دوں گا۔

میرے حوالے سے اور برادر شبیر علی کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق چاند کی روشنی منعکس روشنی ہوتی ہے۔جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔میں ایک بار پھر سورہ فرقان کا حوالہ دیتا ہوں باب نمبر 25 آیت نمبر 61۔

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾ (الفرقان:٦١)

''بہت مقدس'' ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

اس آیت میں سورج کو چراغ کہا گیا ہے۔اور چاند کے لیے قمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قمر کے ساتھ ہمیشہ منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی منعکس روشنی کے ہیں۔سورج کے لیے شمس کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور سورج کو روشن چراغ ہی ہمیشہ کہا گیا ہے۔میں حوالے پیش کر سکتا ہوں۔مثال کے طور پر:

سورۂ نور، باب نمبر 71 آیات نمبر 15 تا 16 سورۂ یونس، باب نمبر 10 آیت نمبر 5 اسی طرح دیگر آیات۔

ان کے مطابق اگر "نور" سے مراد منعکس روشنی ہے تو یہ لفظ سورۂ نور میں خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہی زمین و آسمان کا نور ہے۔ اور انہوں نے سورہ نور باب نمبر 24 آیات نمبر 35 تا 36 کا حوالہ دیا۔

پوری آیت کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ معنی کیا ہیں۔

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، وہ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ مشرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔"

اس آیت کے مطالعہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس مثال میں اگر اللہ تعالیٰ نور مطلب منعکس روشنی ہے تو اس روشنی کا منبع یا چراغ بھی وہ خود ہے۔ یعنی اس آیت میں پیش کی گئی مثال کے مطابق روشنی بھی وہ خود ہے اور اس روشنی کا عکس بھی وہ خود۔ فانوس کی مانند جس کے اندر روشنی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ روشنی کو منعکس بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ قرآن نور ہے تو کیا یہ بھی منعکس روشنی ہے۔ یقینی طور پر قرآن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی منعکس شدہ روشنی اور ہدایت ہے۔

جہاں تک حضرت محمد ﷺ کے سراج ہونے کا ذکر ہے۔ یقیناً وہ سراج ہیں جن کی روشنی کا

عکس احادیث کی صورت میں ہم تک پہنچ رہا ہے۔ اور چونکہ آپ ﷺ احکاماتِ باری تعالیٰ ہم تک پہنچانے کا موجب ہیں لہٰذا آپؐ نور بھی ہیں۔

پس آپ کسی بھی طرح دیکھیں، نور یا منیر کا مطلب منعکس، منعطف یا مستعار لی گئی روشنی ہی بنتا ہے۔ جو چاند کے لیے استعمال ہوئی۔

دیگر امر ڈاکٹر ولیم نے سورۂ کہف کی آیت 76 حوالہ دیا کہ ذوالقرنین نے سورج کو گدلے پانی میں ڈوبتا دیکھا۔ سورج کا گدلے پانی میں ڈوب جانا یقیناً غیر سائنسی امر ہے۔ لیکن یہاں عربی لفظ وَجَدَ استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب معنی ہے نظر آنا۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں فرما رہے ہیں کہ ذوالقرنین کو ایسا نظر آیا۔

اگر میں کہتا ہوں کہ دوسری جماعت کے ایک بچے نے کہا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ''ذاکر کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔'' یہ میری بات نہیں ہے بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ بچہ کہہ رہا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا بلکہ وہ بچہ غلط کہہ رہا ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے کافی طریقے ہیں۔ ایک تو وَجَدَ کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ''نظر آیا'' اور محمد اسد کے بقول دوسرا طریقہ یہ کہ لفظ مغرب کے معانی پر غور کرنا چاہیے۔

عربی زبان میں لفظ ''مغرب'' سمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور غروب آفتاب کے وقت کے لیے بھی۔ گویا اگر مذکورہ بالا آیت میں مغرب کے وقت سے مراد لی جائے تو معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ مگر ممکن ہے ڈاکٹر ولیم ہماری باتوں پر معترض ہوں کہ یہ مفروضے ہیں اور ان الفاظ کے ظاہری معانی ہی قبول کرنا چاہیے۔ جب روز مرہ گفتگو میں سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کا ذکر ہوتا ہے تو کیا واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اخبارات میں سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات سے مراد سورج کا نکلنا یا ڈوبنا ہوتا ہے؟ ہم سب کو سائنسی طور پر علم ہے کہ نہ تو نکلتا ہے اور نہ ڈوبتا ہے۔ درحقیقت یہ زمین کی گردش ہوتی ہے جس کے سبب ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو کیا یہ اخبارات غلط بیانی کرتے ہیں؟

جب لفظ تباہی استعمال کرتا ہوں تو میری مراد ایک بڑا حادثہ ہوتی ہے، یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے لغوی معانی ''ایک منحوس ستارے'' ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا جب یہ لفظ استعمال ہو تو ہمیں اس کے لغوی معانی ہی مراد لینے چاہئیں؟

میں اور ڈاکٹر ولیم دونوں اکثر پاگل شخص کو (Lunatic) کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ہیں ''چاند سے متاثرہ'' کیا اس کو اسی معنی میں ہی استعمال کرنا چاہیے؟

سورج کا اٹھنا بھی فقط الفاظ کے استعمال میں ہے اور اللہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے سمجھ میں آنے والے الفاظ استعمال کرتا ہے۔اسی طرح لفظ (Sunset) استعمال ہوا ہے۔قرآن کی سورہ کہف سورۃ نمبر 18 آیت نمبر 86 مسلمہ سائنس سے متصادم نہیں ہے۔انہوں نے سورہ فرقان سورۃ نمبر 25 آیت نمبر 45 تا 46 بیان کیا۔جس میں اس طرح ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا o﴾ (الفرقان:۴۵)

”تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔“

ڈاکٹر ولیم اپنی اس آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”سورج کہاں حرکت کرتا ہے؟“ اس آیت میں کہیں بھی سورج کی حرکت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ڈاکٹر صاحب اپنی گفتگو میں بھی اور اپنی کتاب میں بھی یہی سوال اُٹھاتے ہیں کہ سورج حرکت نہیں کرتا لیکن اس آیت مبارکہ میں تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ سورج کو دلیل بنایا گیا ہے سائے کی حرکت پر اور یہ بات تو اس شخص کو بھی معلوم ہے جو کبھی مدرسے نہیں گیا ہو۔کہ سائے کا سبب سورج کی روشنی ہوتی ہے۔لہٰذا قرآن کا بیان بالکل صحیح ہے۔کیونکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ سورج کی حرکت کے سبب سایہ کم ہوتا ہے یا زیادہ ہوتا ہے۔یہ بات ڈاکٹر صاحب خود قرآن سے منسوب کر رہے ہیں۔سورج سائے پر دلیل ہے کیونکہ سورج کی روشنی کی وجہ سے ہی سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔روشنی نہ ہو تو سایہ نہیں ہوتا درست ہے کہ۔سایہ دیگر روشنی کے ذرائع کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے لیکن یہاں ذکر ہو رہا ہے خاص سائے کا جو گھٹتا بڑھتا ہے اور یہ سایہ سورج کے سبب وجود میں آتا ہے۔

ڈاکٹر کیمپبل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں سورہ سباء سورہ نمبر 34 آیت نمبر 12 تا 14 کا حوالہ دیا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ o﴾ (سبا:۱۴)

”پھر جب سلیمان علیہ السلام پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی

موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوانہ تھی جو اس کے عصا کو کھار ہا تھا
،اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے
جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''

اس آیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص چھڑی کے سہارے کھڑا ہو، وہ فوت ہو جائے اور کسی کو علم ہی نہ ہو سکے۔ مذکور آیت کی وضاحت متعدد طریقوں سے ممکن ہے۔ اول تو یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور یہ ایک معجزہ ہو سکتا ہے۔ جب بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ نا قابل یقین ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی مردے کو زندہ کر دینا اور بغیر باپ کے پیدا ہونا زیادہ باعث حیرت امر ہے یا کسی مردہ شخص کا چھڑی کے سہارے کھڑے رہنا؟

سو اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے معجزات آشکار کر سکتا ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے کیوں نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر میں راستہ بن سکتا ہے، ان کا عصا اژدھا بن سکتا ہے بائبل یہ بتاتی ہے، قرآن بھی یہی بتاتا ہے، پس اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام والا واقعہ کیوں ناممکن ہو؟

دیگر تشریحات بھی ممکن ہیں کیونکہ قرآن یہ تو بیان نہیں کر رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام'' بہت طویل عرصے'' تک چھڑی کے سہارے کھڑے رہے ہوں۔

صرف یہ بیان ہے کہ...... جانور، اکثر کے مطابق شاید...... ''چیونٹی'' یا خشکی کے کسی دوسرے کیڑے نے کاٹ لیا۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا وقت وہی ہو جب جانور نے ان کی چھڑی ہلا دی تھی اور وہ نیچے گر گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری دلیل قرآن سے متضاد ہے کیونکہ قطع نظر اس کے کہ مطابقت یا متصادم کی کوشش کرتے ہیں سورہ نساء سورہ نمبر 4 آیت نمبر 82 میں بیان ہے۔

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ (النساء:۸۲)

''وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس

میں بہت تضاد ہوتے۔"

آپ کا قرآن کے مطالعے کا نقطہ نظر متضاد یا مطابقت والا ہو اگر منطق پر عمل پیرا ہیں تو نہ تو قرآن میں تضادات پا سکیں گے اور نہ ہی اس کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقائق کے برعکس ملے گی۔ مجھے اتفاق ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبیل سے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام طویل عرصہ تک کھڑے رہے ہوں گے اور اس کی وجہ بھی اسی آیت میں بیان کر دی گئی ہے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گرے اور جنوں کو ان کی وفات کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ "اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو ہم اتنی سخت مشقت نہ کرتے۔" دراصل ان جنات کو اپنی طاقت کا بہت غرور تھا جس کے خاتمے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آشکار کیا کہ جنات بھی علم غیب سے محروم ہیں۔

ڈاکٹر کیمپبیل نے سورہ نحل سورہ نمبر 16 آیت نمبر 66 کے حوالے سے دودھ کے بننے کے عمل کا تذکرہ کیا۔

ابن نفیس سب سے اولین شخص تھا جس نے دوران خون کا عمل دریافت کیا۔ اس ۔ ۔ یہ دریافت نزول قرآن کے چھ سو سال بعد کی تھی اور ابن نفیس کے چار سو سال بعد ولیم ہاروی نے یہ بات اہل مغرب کے علم میں یعنی نزول قراان کے ایک ہزار سال بعد۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ معدے اور آنتوں میں جاتی ہے۔ آنتوں سے اجزاء خوراک دوران خون کے ذریعے جسم کے مختلف اعضاء تک پہنچتے ہیں۔ جگر کے دہانے کے ذریعے غذائی اجزاء دودھ پیدا کرنے والے پستان غدوددوں تک پہنچتے ہیں۔

قرآن نے مختصراً جدید سائنس کی فراہم کردہ یہ تمام معلومات سورۂ نحل سورہ نمبر 16 آیت نمبر 66 میں بیان کر دی ہیں:

﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ۝﴾

"اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی دودھ جو پاکیزہ ہے پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار۔"

الحمد للہ ہمیں قرآن کے ذریعے چودہ سو سال پہلے ہی یہ معلومات حاصل ہو گئی تھیں جن کے بارے میں جدید سائنس 50 سال یا 100 سال قبل معلومات ۔ ۔ یتی ہے۔ سورۃ مومنون سورۃ

نمبر 23 آیت نمبر 21 میں ارشاد ہے۔

﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ۝﴾

(المؤمنون:۲۲،۲۱)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔''

ڈاکٹر ولیم نے حیوانوں کے حوالے سے بھی ایک نکتہ اُٹھایا کے حیوانات گروہ میں رہتے ہیں۔

قرآن کی سورۃ انعام سورۃ نمبر 6 آیت نمبر 38 میں ارشاد ہے۔

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَٰئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝﴾

(الانعام:۳۸)

'' زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

دوسری طرف اور ڈاکٹر ولیم کہہ رہے ہیں کہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے اور شیر ایسا کرتا ہے اور ہاتھی ایسا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تو رویوں کی بات کر رہے ہیں، قرآن رویے کی بات ہی نہیں کر رہا۔ اگر ڈاکٹر ولیم کیمپبل قرآن کی بات نہیں سمجھ پاتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن غلط بیان کر رہا ہے۔ (نعوذ و باللہ) قصور تو ڈاکٹر صاحب کا ہے۔

قرآن بیان کرتا ہے کہ'' وہ گروہی رہائش رکھتے ہیں۔'' جانوروں اور پرندوں کے بھی

انسانوں کی طرح گروہ ہوتے ہیں۔قرآن ان کے رویوں کی بات نہیں کر رہا۔

آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ جانور اور پرندے بھی ہماری طرح گروہوں کی صورت میں ہی بودوباش کے حامل ہوتے ہیں۔

اب ہم علم الجنین کے حوالے سے جن نکات کا جواب میں دے چکا ہوں ان سے ہٹ کر ڈاکٹر ولیم نے کچھ باتیں کی ہیں۔ایک بات یہ کہ جنین کی نشوونما کے مراحل کا ذکر بقراط اور گالن وغیرہ نے بھی کیا ہے۔یہاں ایک بنیادی نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے قرآن کو اتفاق ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن نے وہ بات اس شخص سے اخذ کو ہوگی۔بلفرض میرا دیا گیا ایک بیان صحیح ہے۔ایسا بیان مجھ سے پہلے بھی کوئی دے چکا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے لازماً اس شخص کی نقالی کی ہے۔اس کا امکان بھی لیکن یہ ممکن بھی نہیں ہے۔لہٰذا صورتِ حال کا تجزیہ کرنا چاہیے۔

قرآن گالن اور بقراط وغیرہ کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتا۔جنین کے بارے میں قرآن اور گالن وغیرہ کے نظریات میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔اگر قرآن ان سائنس دانوں کی نقل کی ہوتی تو دونوں میں مکمل یکسانیت پائی جاتی۔(نعوذ وباللہ) جو ایک منطقی امر ہے۔ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ کچھ باتوں کی تو نقل کر لی جاتی اور ایسی باتیں جو غلط ہیں وہ چھوڑ دی جاتیں۔گالن اور ہپوکریٹس وغیرہ ''جونک نما مرحلے'' کا تذکرہ نہیں کرتے۔ان کے ہاں ''مضغہ'' کا تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

مزید برآں ان سائنس دانوں نے یہ بھی کہا کہ عورت میں بھی مادۂ منویہ ہوتا ہے۔اور یہی بات بائبل میں بھی کی گئی ہے۔

(Leviticus) باب نمبر 12 آیات نمبر 12-1 میں بیان کیا گیا ہے کہ عورت ''بیج'' دیتی ہے۔لہٰذا بائیبل بقراط سے نقل کرتی ہے بائیبل میں (Job) باب نمبر 10 آیات نمبر 10,9 میں ہے۔

''ہم نے انسان کو خاک کے بنایا۔ابلے ہوئے دودھ اور نیم جامد پنیر کی مانند۔''

ابلا ہوا دودھ و نیم جامد پنیر بالکل بقراط کا چربہ ہے۔کیوں؟ اس لیے کہ یہ کلامِ خداوندی نہیں ہے۔یہ حصہ غیر سائنسی ہے۔درحقیقت گالن، بقراط اور دیگر یونانیوں کا خیال تھا کہ جنین کی تشکیل جمے ہوئے پنیر کی مانند ہوتی ہے۔اور بائبل میں یہ بات اس طرح نقل کر لی گئی ہے۔قرآن میں ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اگر آپ علم الجنین کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں، حتیٰ کہ ڈاکٹر کیتھ مور کی

کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گالن ہپو کریٹس اور ارسطو وغیرہ نے کافی کچھ اس موضوع پر بتایا۔ اُن کی کچھ باتیں صحیح ہیں تو بہت سی باتیں غلط ہیں۔

- ڈاکٹر مور مزید قمطراز ہیں کہ قرونِ وسطیٰ یا اس وقت کے عربوں کے لحاظ سے قرآن سے ہمیں اضافی معلومات ملتی ہیں ڈاکٹر کیتھ مور اپنی کتاب میں قرآن کی صفت بیان کرتے ہیں۔ وہ ارسطو اور ہپو کریٹس کا بھی اعتراف کرتے ہیں لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی باتیں غلط بھی ہیں۔ قرآن کے کسی بیان کے بارے میں وہ ایسا نہیں کہتے۔ یہی اِس امر کا ثبوت ہے کہ قرآن نے یونانی نظریات کی نقل نہیں کی۔

اب یہ بات کہ ''دنیا گول ہے'' یونانیوں کی نقالی ہے۔ میں فیثا غورث کو جانتا ہوں 6 قبل مسیح میں یونان میں عقیدہ تھا کہ دنیا گردش کرتی ہے اور سورج کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔

لیکن...... اگر رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) ان نظریات کی نقل کرتے تو پھر وہ ان ے اس نظریے کو بھی قبول کرتے کہ سورج ساکن ہے اور پوری کائنات کا مرکز ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ درست باتیں قبول کر لی گئیں اور غلط باتیں چھوڑ دی گئیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے ایک طویل فہرست پیش کی۔ یونانی زبان سے سریانی میں ترجمہ، اس سے عربی میں ہوا، لیکن قرآن کی ایک آیت اس طرزِ استدلال کی نفی کر دینے کے لیے کفایت کرتی ہے۔

سورۂ عنکبوت سورہ نمبر 29 آیت نمبر 48 میں بیان ہے۔

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۝﴾ (العنکبوت:۴۸)

''(اے نبی ﷺ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے، اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

یہ تاریخی حقیقت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''اُمی'' تھے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یہ تاریخی حقیقت اس امر کا ثبوت ہے کہ انہوں نے کہیں سے، کسی سے نقل نہیں کی۔ تصور کریں۔ ایک سائنس دان، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی حکمت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امی رکھا، تاکہ لوگ متکبر لوگ، اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے والے لوگ، منہ نہ کھول سکیں۔

میں بائبل کے بارے میں بہت سی باتیں کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے

میں ڈاکٹر ولیم کی جانب سے اُٹھائے گئے تمام نکات کا جواب دے دیا ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ کوئی ایک نکتہ بھی ایسا نہیں بچا جس سے قرآن سائنس سے متضاد ثابت ہو۔

انہوں نے میرے اُٹھائے ہوئے 22 نکات میں سے صرف دو نکات پر بات کی اور اسے ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ لہٰذا یہ 22 کے 22 نکات ثابت کرتے ہیں کہ بائبل جدید سائنس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اب نکتہ نمبر 23 پیش خدمت ہے۔ یہ نکتہ علم الحیوانات سے متعلق ہے۔

کتاب احبار، باب 11 آیت نمبر 6۔

''اور خرگوش کو کیونکہ وہ جگالی تو کرتا ہے لیکن اس کے پاؤں الگ نہیں۔ وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔''

یہاں واضح طور پر خرگوش کو جگالی کرنے والا جانور کہا گیا ہے ہم سب جانتے ہیں کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کے معدے کی بناوٹ جگالی کرنے والے جیسی ہے۔ دراصل اس کے منہ کی مسلسل حرکت کے سبب قدیم دور میں اس کو جگالی سمجھا جاتا تھا۔

کتاب امثال، باب 6، آیت 7 میں کہا گیا کہ چیونٹیوں کا نہ کوئی سردار ہے، نہ حکمران آج ہم جانتے ہیں کہ چیونٹیاں نہایت منظم مخلوق ہیں۔ ان کے ہاں باقاعدہ نظام محنت موجود ہوتا ہے جس میں ان کا چیف، فورمین اور مزدور ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ملکہ بھی ہوتی ہے ان کا حاکم ہوتا ہے۔ لہٰذا بائبل غیر سائنسی ٹھہری۔

اس کے علاوہ کتاب پیدائش باب نمبر 3 آیت نمبر 14 اور کتاب یسعیاہ باب نمبر 65 آیت نمبر 25 میں بیان ہے کہ ''سانپ مٹی کھاتے ہیں'' کتاب (Leviticus) باب نمبر 11 آیت نمبر 20 میں درج ہے۔

''مکروہ اشیاء میں چار پنجوں والے پرندے شامل ہیں۔''

بعض عبرانی لفظ Upp کا ترجمہ Powp کو غلط قرار دیتے ہیں۔ شاہ جیمز کے متن میں کیڑا یا پروں والی مخلوق مراد ہے اور نئے عالمی متن میں پروں والی مخلوق مراد ہے۔ لیکن بیان یہ کیا گیا ہے کہ ''تمام حشرات جو چار پاؤں رکھتے ہیں مکروہ ہیں۔ تمہارے لیے نفرت کے قابل ہیں۔''

ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے میرا سوال ہے کہ کن حشرات کے چار پاؤں ہوتے ہیں؟ دنیا میں کوئی ایسا پرندہ یا حشرات الرض میں سے ایسا نہیں جس کے چار پاؤں ہوتے ہیں۔

مزید برآں بائبل میں ایسے جانوروں کا تذکرہ بھی جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے مثلاً

ایک دیو مالائی جانور (Unicorn) جس کا ذکر کتاب یسعیاہ باب نمبر 34 آیت نمبر 7 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے حقیقی وجود رکھتا ہو۔ لغات میں دیکھیں معلوم ہوتا آپ ڈکشنری میں دیکھیں ، یہ کہتی ہے ..... '' ایک جانور جس کا جسم گھوڑے کا ہے اور ایک سینگ جو صرف افسانوں میں دستیاب ہے۔'' میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اگر کسی عیسائی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ یہ میری نیت نہ تھی بلکہ محض ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی کتاب کا جواب ، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن سائنس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور بائبل کا ایک حصہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے، مکمل خدا کا کلام نہیں۔ یہ مطابقت نہیں رکھتی۔ میں قرآن کی سورہ اسراء سورۃ نمبر 17 آیت نمبر 18 سے اپنی تقریر ختم کرتا ہوں جس میں ارشاد ہے۔

﴿وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝﴾

(بنی اسرائیل:۸۱)

''اور اعلان کر دو کہ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

﴿وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾

سوالات وجوابات کا دور

ڈاکٹر محمد:

ڈاکٹر ولیم کیمپبل ، ڈاکٹر ذاکر نائیک ، آپ کی تقاریر اور جوابی تقاریر کا شکریہ۔ آخر میں سامعین کو شریک کرنے کا وقت ہے جسے سوال و جواب کا وقت کہیں گے۔

دستیاب تقریباً ساٹھ منٹ کے محدود وقت سے زیادہ سے زیادہ ستفادہ کے لیے ہم مندرجہ ذیل قواعد وضوابط اختیار کرنا پسند کریں گے۔

☆ سوالات صرف آج کے موضوع ،قرآن اور بائبل سائنس کی روشنی میں ، کے موضوع کے متعلق ہونے چاہئیں۔

☆ غیر متعلق سوالات شامل نہیں کیے جائیں گے۔

☆ مہربانی کے ساتھ سوالات مختصر اور موضوع سے متعلق کریں۔

☆ یہ محدود وقت نہ تو سامعین کے خطاب کرنے کے لیے ہے اور نہ ہی ردعمل ظاہر کرنے کے لیے۔

☆ ڈاکٹر ولیم کیمپبل اور ڈاکٹر ذاکر نائیک جامع جوابات دیں گے لہٰذا مہربانی کر کے ہر جواب کو 5 منٹ سے طویل نہ کریں۔

مائیکروفون کے توسط سے سوال کے لیے ہال میں 4 مائیک نصب ہیں۔ 2 سٹیج کے سامنے مردوں کے لیے اور دو درمیان والی قطاروں کے آخر میں خواتین کے لیے۔ ڈاکٹر ولیم کیمبل سے سوالات کرنے کے خواہش مند افراد مہربانی کر کے میری بائیں طرف موجود مائیک کے پیچھے قطار بنائیں، مرد آگے کی جانب جبکہ خواتین پیچھے۔ بالکونی میں موجود سامعین سے درخواست ہے۔ کہ سوال کے لیے مائیک پر آئیں۔ ایک وقت میں ایک سوال کی اجازت ہے۔ دوسرے سوال کے لیے دوبارہ قطار میں آ کر دوسرا سوال کرنا ہوگا۔ آپ کے درمیان موجود رضا کاروں کے پاس موجود انڈیکس کارڈز پر درج سوالات کی حیثیت ثانوی ہوگی مائیک پر آنے والے سوالت کے بعد ان کا جواب مقررین دیں گے مہربانی کر کے کارڈ پر تحریر کریں کہ آپ کا سوال ڈاکٹر ولیم کیمبل سے ہے یا

ڈاکٹر ذاکر نائیک سے تاکہ وہ آپ کے سامنے موجود متعلقہ صندوقچوں میں رکھے جاسکیں۔ شفاف صندوقچے جن پر ڈاکٹر ولیم کیمبل اور ڈاکٹر ذاکر نائیک کے نام درج ہیں۔ منتظمین کی جانب سے صندوقچے کو ہلانے کے بعد مقررین کی مرضی ہوگی کہ وہ کونسا سوال منتخب کریں۔ منتظمین کا پینل ان سوالات کا جائزہ لے گا کہ آیا موضوع سے تعلق رکھتے ہیں اور منتظمین کی منظوری کے بعد مائیک پر پیش کیے جائیں گے جن کا مقررین جواب دیں گے۔ اپنے سوال سے قبل مہربانی کرکے اپنا نام اور پتہ بتائیں۔ ہم گھڑی کی رفتار کے لحاظ سے ہر مقرر سے باری باری ایک وقت میں ایک سوال کرنے کی اجازت دیں گے۔ مثلاً ڈاکٹر کیمبل ...... اول سوال، ڈاکٹر ذاکر نائیک ...... دوئم سوال، ڈاکٹر ولیم کیمبل ...... سوئم سوال، ڈاکٹر ذاکر نائیک ...... چہارم سوال۔ معذرت خواہ ہوں کہ یہ مرحلہ (Clockwise) کی بجائے۔ آڑا ترچھا ہوگا۔ منتظمین نے مائیک کی ترتیب ایسی رکھی ہے اول اور دوئم سوال سٹیج کے سامنے، سوئم سوال عقب میں میرے بائیں طرف اور چہارم سوال عقب میں میرے دائیں طرف اور علیٰ ہذا القیاس۔ ان سوالوں کے لیے تقریباً 40 منٹ دیئے جائیں گے اور پھر کاغذ پر تحریر سوالات کی طرف رجوع کریں گے۔ میری درخواست ہے میرے بائیں جانب والے مائیک سے اول سوال ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے پوچھا جائے۔

سوال ڈاکٹر کیمبل سے کتاب پیدائش (Genesis) میں نوح علیہ السلام کے سیلاب کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے کہ تمام روئے زمین کو پانی نے ڈھانپ دیا، تمام مخلوقات، پہاڑ اور ہر چیز اور یہ بیان ہے کہ زمین کا بلندترین پہاڑ بھی، جس کی بلندی عربی میں 15 ہاتھ بیان کی گئی ہے جو تقریباً 15 فٹ بنتی ہے۔ ہم سائنسی لحاظ سے جانتے ہیں کہ زمین کے بلندترین پہاڑ کی بلندی 15 فٹ نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔ کتاب پیدائش میں کیسے یہ کہا گیا ہے کہ پانی نے ہر چیز کو ڈبو دیا تھا، روئے زمین کا ہر پہاڑ بھی اور بلندترین پہاڑ 15 فٹ؟

جواب ولیم کیمبل: آپ کے سوال کرنے کا شکریہ۔ میرے خیال میں یہ بات کی گئی ہے کہ بلندترین پہاڑ سے بھی بلند ہو گیا۔ اگر بلندترین پہاڑ تیس ہزار میٹر ہے تو پانی اس سے بھی 15 فٹ بلند تھا۔

ڈاکٹر محمد:

برادر! ہم مداخلتی یا جوابی سوالات کے سلسلے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سوال کرنے والا اپنا سوال کرے اور بس۔ پھر جواب دینے والا جیسے چاہے جواب دے شکریہ!

کیمبل: اور میں قرآن میں یہ دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں اس سے درحقیقت ایسا ہی مطلب نکلتا ہے کیونکہ سورہ ہود کی آیت نمبر 40 میں کہا گیا ہے کہ ''زمین کے چشمے ابل پڑے اور پانی کی پہاڑ کی مانند لہریں بلند ہوئیں۔'' اور پھر جہاں انبیاء کی فہرست دی گئی ہے وہاں یہ کہا گیا ہے۔ ''نوح علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی نہیں۔ اور میں واقف ہوں کہ آدم علیہ السلام بھی نبی ہو سکتے تھے لیکن مجھے علم ہے...... اس کا تذکرہ کہیں نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ قرآن میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ تمام روئے زمین کو پانی نے ڈھانپ دیا۔

سوال: آپ نے کہا کہ اللہ روشنی منعکوس کرتا ہے اور وہ ''نور'' سے بنا ہے میں دراصل یہ بات سمجھ نہیں سکا۔

ڈاکٹر ذاکر: برادر نے ایک سوال پیش کیا ہے کہ انہیں ''نور'' اور ''اللہ'' کے حوالہ سے میری وہ وضاحت سمجھ میں نہیں آئی جو میں نے ڈاکٹر ولیم کیمبل کے جوابی دلائل کے بارے میں عرض کی۔ قرآن سورہ نور آیت نمبر 35 میں بیان کرتا ہے کہ...... اللہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ وہ ایک روشنی ہے۔ قرآن میں روشنی کا مطلب ''منعکس شدہ روشنی'' ہے۔ پس وہ یہ پوچھ رہے ہیں'' کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی روشنی بھی منعکس شدہ ہے؟'' جواب آگے ہی ہے اگر آپ آیت کو پڑھیں...... جو کہتی ہے کہ یک ایک طاق کی مانند ہے، طاق میں ایک چراغ ہے۔ چراغ کی روشنی اپنی ہے اس کے معنی ہیں کہ اللہ کی روشنی ذاتی ہے اور منعکس بھی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ لی روشنی کو خود اللہ تعالیٰ دوبارہ سے منعکس لرر ہا ہے۔ ایک کیمیائی چراغ کی مانند جو آپ یہاں دیکھ رہے ہیں۔ جس کے اندر ایک ٹیوب ہے۔ آپ چراغ کو ''سراج'' یا ایک ''دِیا'' پر محمول کر سکتے ہیں۔ اور اس کے شیشے کو ''منیر'' یا ''نور''، مستعار لی ہوئی روشنی یا انعکاس کرنے والی روشنی اور مزید معاملہ یہ ہے کہ آپ اس قدرتی روشنی کو جسمانی روشنی قرار نہیں دے سکتے جیسا کہ آپ نے پوچھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی روحانی روشنی ہے جیسا کہ میں ڈاکٹر ولیم کیمبل کو جواب دے چکا ہوں اور چونکہ میرے پاس 5 منٹ ہیں، میں ان سے مستفید ہونا چاہوں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمبل نے طوفان نوح

علیہ السلام کے حوالے سے جواب دیا...... میں وہ شخص ہوں کہ جو بائبل کے ساتھ مطابقت کا طریقہ کار استعمال کرتا ہوں اور قرآن کے لیے مخالفانہ استدلال۔ لیکن الحمدللہ قرآن دونوں طریقوں سے آزمائش میں کامیاب ہوگیا۔ اور اگر میں ڈاکٹر ولیم کیمبل سے اتفاق بھی کرلوں کہ یہ صحیح ہے کہ پانی بلندترین پہاڑ سے 15 فٹ بلند تھا لیکن کتاب پیدائش آیت 20-19 میں بیان ہے کہ ''ساری دنیا پانی غرق ہوگئی۔'' نیز آثارِ قدیمہ کے شواہد ہمیں آج کا حال بتاتے ہیں اور اُس وقت کا بھی۔ اگر آپ نوح علیہ السلام کے زمانے کا علم النساب کے طریقہ سے تخمینہ لگائیں تو یہ 21 ویں صدی سے 22 ویں صدی قبل مسیح بنتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے شواہد کے مطابق بابل کے حکمرانوں کا دورِ سوئم اور حکمرانانِ مصر کا سلسلہ یازدہم 21 ویں اور 22 ویں صدی قبل مسیح کا دور تھا۔ جس دوران سیلاب کا کوئی ثبوت نہیں اور وہ بغیر رکاوٹ کے حکمران رہے۔ پس آثارِ قدیمہ کے شواہد ہمیں دکھاتے ہیں کہ زمین کا پورا ڈوبنا ناممکن ہے۔ پوری زمین کا 21 ویں، 22 ویں صدی قبل مسیح میں غرق ہو جانا غلط ہے۔ قرآن کے بارے میں کیا کہ سکیں گے؟ نکتہ نمبر 1: قرآن میں وقت کا تعین نہیں ہے، آیا 21 ویں صدی قبل مسیح تھی یا 50 ویں صدی قبل مسیح بالکل تعین نہیں۔ نکتہ نمبر 2: قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہ پوری زمین پانی میں ڈوب گئی تھی۔ قرآن تو نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی بات کرتا ہے اور ان کے لوگ جو ممکن ہے چھوٹا گروہ یا شاید ایک بڑا گروہ۔ آثارِ قدیمہ کی شہادتیں آخر بتاتی ہیں اور ماہرین آثارِ قدیمہ کہتے ہیں کہ ''ہم بالکل اعتراض نہیں کرتے، یہ ممکن ہے دنیا کے کچھ حصے پانی میں ڈوب گئے ہوں، لیکن پوری دنیا کا ڈوب جانا ممکن نہیں۔'' لہٰذا الحمدللہ قرآن آثارِ قدیمہ کی تازہ ترین دریافتوں سے موافقت کر رہا ہے لیکن بائبل نہیں۔ نیز کتاب پیدائش آیت نمبر 15-16 دیکھیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی بنانے کے لیے کہا جو 300 ہاتھ لمبائی، 50 ہاتھ چوڑائی اور 30 ہاتھی بلندی کی پیائش والی ہو (Cubits) ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے۔ بھائی نے یہاں بھی غلطی کی۔ نئی عالمی اشاعت کے مطابق 450 فٹ لمبائی، 75 فٹ چوڑائی اور تقریباً 45 فٹ بلند اونچائی۔ اگر آپ اس کی پیائش کریں میں اعداد و شمار کر چکا ہوں ...... یہ 150 ہزار مکعب فٹ حجم اور 33,750 فٹ رقبے سے نہیں کم ہے۔ اور بائبل اس کی تین منزلیں بتاتی ہے اول، دوم، سوئم منزل جس کو 3 سے ضرب دی جائے تو آپ کو 101,250 مربع فٹ جواب ملے

گا۔ یہ اس کا رقبہ ہے۔ تصور کریں کہ دنیا کی ہر نوع کا ایک ایک جوڑا، 101,250 مربع فٹ جگہ میں سما گیا۔ سوچیں کہ کیا یہ ممکن ہے؟ دنیا میں لاکھوں اقسام ہیں۔ اگر میں کہوں اس ہال میں دس لاکھ لوگ آئے۔ کیا آپ یقین کریں گے؟ مجھے یاد ہے، شاید گزشتہ سال، میرے کیرالہ میں خطاب میں دس لاکھ لوگ تھے۔ یہ سب سے بڑا اجتماع ہے جس سے میں نے اللہ کی مہربانی سے خطاب کیا۔ میں دس لاکھ لوگ تھے۔ یہ سب سے بڑا اجتماع ہے جس سے میں نے اللہ کی مہربانی سے خطاب کیا۔ ایک ملین لوگ! بے شمار لوگوں کو میں دیکھ بھی نہ سکا۔ یہ کوئی ہال نہ تھا بلکہ یہ ایک بڑا ساحل تھا۔ سامنے موجود کو چھ لوگوں کے سوا باقی ماندہ کو نہ دیکھ سکا۔ دس لاکھ میں سے چند لوگ۔ اگر آپ ویڈیو کیسٹ میں دیکھیں تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دس لاکھ کتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ میدان عرفات کی طرح آپ میدان عرفات میں 25 لاکھ لوگ دیکھتے ہیں۔ 101,250 مربع فٹ یا 150,000 مکعب فٹ، یہ ممکن نہیں ہے اور یہ کہ وہ 40 روز تک کھاتے رہے اور رفع حاجت بھی کرتے رہے۔ اگر میں دعویٰ کرتا ہوں کے اس ہال میں دس لاکھ لوگ آئے۔ کیا قابل یقین ہے؟ لہٰذا سائنسی و عقلی لحاظ سے کافی اہم غلطیاں بائبل میں ہیں۔

ڈاکٹر محمد:

عقب والے مائیک سے اگلا سوال ڈاکٹر ولیم کیمبل کے لیے لیا جا سکتا ہے؟

سوال: ڈاکٹر ذاکر، آپ نے کہا کہ......

مسٹر سیموئیل نعمان:

نہیں...... نہیں...... معذرت خواہ ہوں۔ یہ سوال ڈاکٹر کیمبل کے لیے ہے، اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر محمد:

اگلے صاحب ڈاکٹر کیمبل سے سوال کرنا پسند کریں گے۔

سوال: جی ہاں! میں یہ سوال بلکہ یہ آزمائش ڈاکٹر ولیم کیمبل کو پیش کرنا پسند کروں گا کہ وہ بائبل 16:17-18 میں دیا گیا "جھوٹ کی پرکھ" کے ٹیسٹ کو خود پر آزمائیں کہ یہاں، ابھی اور اسی وقت، ثابت ہو سکے کہ وہ ایک سچے عیسائی مومن ہیں؟

جواب ولیم کیمبل: میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی وضاحت سے مستفیق نہیں ہوں خدا...... عیسیٰ علیہ السلام بذات خود اس آزمائش میں ڈالے گئے اور شیطان نے کہا...... خوب، اگر تم خدا کے بیٹے ہو تو خود کو عبادت گاہ کی چھت سے نیچے پھینکو۔ جواباً عیسیٰ علیہ السلام نے کہا......'' تم آقا کو نہیں ورغلا سکتے، اپنے خدا کو۔ اگر میں اس وقت یہ کہوں ......'' جی ہاں، میں یقین حاصل کرنے کے لیے آپ کے سامنے ایک معجزہ دکھاؤں گا۔'' گویا میں خدا کو للکاروں گا۔ میرا دوست ہیری رین کلف، اس نے دعوت پر جانے کا وعدہ کیا تھا، پس اس نے اپنا وعدہ نبھانے کا فیصلہ کیا اور خدا کی رضا پر اعتبار کیا یہ مختلف صورتِ حال ہے، میں خدا کو چیلنج نہیں کروں گا۔

سوال میرا سوال ڈاکٹر ذاکر نائیک کے لیے ہے۔ عیسائی نظریہ تثلیث کی تشریح سائنسی لحاظ سے کرتے ہوئے۔ پانی کی مثال دیتے ہیں جو کہ تین حالتوں میں ہو سکتا ہے، ٹھوس، مائع اور گیس۔ یعنی برف، آب اور بخارات کی صورت میں۔ اسی طرح خدا کے بھی تین پہلو ہیں با، بیٹا اور روح القدس۔ کیا یہ تشریح سائنسی لحاظ سے درست ہے؟

جواب ڈاکٹر ذاکر: بس ایک رائے، اس سے پہلے کہ میں جواب دوں، ہمیں خدا کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں خدا کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ ہم یہاں خدا کا امتحان نہیں لے رہے بلکہ ہم بنی نوع انسان کی آزمائش کر رہے ہیں۔ ہمیں خدا کی آموزش نہیں کرنی بلکہ آپ کی رہے ہیں اور خدا نے عہد کیا ہے کہ کوئی مومن، جس نے مہلک زہر کھایا ہے، وہ نہیں مرے گا۔ وہ غیر ملکی زبانیں بول سکے گا۔ ہم آپ کی آزمائش رہے ہیں کہ آیا آپ ایک مومن ہیں یا بہن کے سوال کی جانب توجہ نہیں دینا چاہتے کہ ایسے عیسائی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم سائنسی حوالے سے نظریہ تثلیث کو ثابت کر سکتے ہیں، جیسا کہ پانی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں ٹھوس، مائع اور گیس مثلاً برف، پانی اور بخارات۔ لہٰذا اسی طرح ہمیں علم ہے کہ خدا کی تین حالتیں ہیں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ کیسے جواب دیا جائے اور کیا یہ سائنسی لحاظ سے صحیح ہے؟

میں اتفاق کرتا ہوں کہ سائنسی لحاظ سے پانی کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ٹھوس، مائع، اور گیس،...... یعنی برف، پانی اور بخارات۔ لیکن ہمیں یہ بھی علم ہے کہ سائنسی لحاظ سے پانی کے اجزائے ترکیبی ایٹم برقرار رہتے ہیں۔ H_2O یعنی ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا چلیں نظریہ تثلیث کو پرکھیں۔ باپ، بیٹا اور مقدس روح حالت ...... وہ کہتے ہیں......'' حالت تبدیل ہوتی ہے۔'' بلحاظ

دلیل تسلیم کر لیتے ہیں۔ کیا اجزائے ترکیبی تبدیل ہوتے ہیں؟ روح سے خدا ومقدس روح بنے ہیں۔ انسان گوشت اور ہڈیوں سے تشکیل کیے گئے ہیں۔ وہ ایک طرح نہیں ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے انسانوں کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، خدا کو خوراک کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک یکساں نہیں ہیں اور اس کی تصدیق خود عیسیٰ علیہ السلام نے Gospel of 24:36 Luke میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میرے ہاتھ اور پیر دیکھو، مجھے جانچو اور دیکھو، اس لیے کہ ایک روح گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل نہیں ہوتیں۔" اور انہوں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے، لوگوں نے دیکھے اور بہت زیادہ خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "کیا آپ لوگوں کے پاس کھانے کے لیے ہے کچھ گوشت ہے؟ لوگوں نے ان کو بھنی ہوئی مچھلی اور شہد کے چھتے کا ایک ٹکڑا دیا جو انہوں نے کھایا۔ کیا ثابت کرنا درکار تھا؟ کہ کیا وہ خدا تھے؟ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا نہیں تھے۔ انہوں نے کھایا اس لیے کہ ان کا وجود گوشت پوست اور ہڈیوں پر مبنی تھا۔ ایک روح کی گوشت اور ہڈیاں نہیں ہوتیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سائنسی طور پر یہ ناممکن ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مقدس روح خدا ہیں۔ اور "تثلیث" کا نظریہ، لفظ (Trinity) کا وجود کہیں بھی بائیبل میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ قرآن میں ہے۔ قرآن پاک کی سورہ نساء سورۃ نمبر 4 آیت نمبر 171 میں فرمان ہے "تین خدا مت کہو۔ ایسا مت کرو، باز آجاؤ! یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔" تثلیث کا لفظ سورۃ مائدہ سورۃ نمبر 5 آیت نمبر 73 میں بھی ہے جہاں فرمان ہے "وہ لوگ کفر کر رہے ہیں۔ وہ مذہب کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ تین ذات سے مل کر ایک بنا ہے۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ خدا ہیں۔ بائیبل میں کہیں بھی نظریہ تثلیث نہیں مارتا۔ وہ آیت جو نظریہ تثلیث کے نزدیک ہیں (بائیبل میں) وہ (1st Epistle of John 5:7) ہے جو کہتی ہے "چونکہ آسمان میں حساب رکھنے والے تین ہیں، باپ، کلمہ اور روح القدس، اور یہ تین ایک ہی ہیں۔" لیکن اگر آپ (Revised Standard Version) پڑھیں جس کی 32 عیسائی علماء نے نظر ثانی کی ہے..... بلند ترین مقام رکھنے والے، جن کی 50 مختلف معاون مذہبی فرقوں نے تائید وحمایت کی ہے، کہتے ہیں "بائبل کی یہ آیت (1st Epistle of John. 5:7) تحریف شدہ ہے، جھوٹ کا پلندا ہے اور من گھڑت ہے۔" اسے بائبل سے نکال باہر پھینکا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ بائبل میں کہیں بھی کسی ایک آیت سے بھی یہ مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکا۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیانی ہوئے کہ "میں خدا ہوں" یا کہیں یہ کہا ہو "میری عبادت کرو۔" درحقیقت اگر آپ بائبل پڑھیں (10:28

(Gospel of John 10:29) میں بیان ہے ''میرا باپ میری نسبت عظیم تر ہے۔'' اور آگے میں بیان ہے ''میرا باپ سب سے عظیم تر ہے۔'' (Gospal of 10:28) ''میں خدا کی روحانی طاقت سے شیطانوں کو بھگاتا ہوں۔'' (Mathew 11:20) میں خدا کی انگلی سے شیطان بھگاتا ہوں۔ (Gospel of Luke 5:30 Gospel of John) ''میں اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے سنا ہے میرا فیصلہ، اور میرا فیصلہ منصفانہ ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی مرضی نہیں رکھتا، بلکہ میں تو اپنے باپ کی مرضی چاہتا ہوں۔'' جو کوئی کہتا ہے ''اپنی مرضی نہیں بلکہ خدا کی مرضی'' وہ ایک مسلمان ہے اس حوالے سے مسلمان کہ جو اپنے ارادے خدا کی رضا کو پیش کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ''میری رضا نہیں بلکہ خدا کی رضا'' وہ مسلمان تھے اور الحمد للہ خدا کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک تھے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی پیدائش معجزانہ طور پر کسی مرد کی مداخلت کے بغیر ہوئی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انہوں نے مُردوں کو زندہ کیا اللہ کی قدرت سے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی اجازت سے پیدائشی اندھوں کو بینائی دی اور کوڑھ کے مریضوں کو صحت یاب کیا۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک کے طور پر ان کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا نہیں ہیں اور نہ ہی وہ جزوئے تثلیث ہیں۔ تثلیث کا کوئی وجود نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے ''کہہ دیجیے وہ اللہ ہے واحد اور احد ہے۔''

سوال السلام علیکم! الحمد للہ آج رات بہت دلچسپ مذاکرہ ہوا ہے جو کہ تمام بنی نوع انسان کے لیے بہت قابل احترام ہے۔ پس ہم یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں ......

مسٹر سیموئل نعمان:

براہِ کرم! ......سوال کریں۔

سوال اچھا، بسم اللہ! آج شام یہاں جس مقصد کے لیے آئے ہیں اس کا حصول ہونا چاہیے، میرا ڈاکٹر کیمبل سے سوال ہے، آپ سے ایک عیسائی کے طور پر مع آپ کے اصحاب، کیا اس محفل کے مقصد کی تکمیل ہوئی ہے؟ کیا اس نے آپ کا دل کھول دیا ہے؟ کیا اس سے کوئی اُمید کی روشنی پیدا ہوئی ہے کہ آپ اسلام کی حقانیت کے بارے میں مزید غور و فکر کریں گے؟

مسٹر سیموئیل نعمان:

شکریہ!

ولیم کیمبل: ڈاکٹر نائیک کے مطابق ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہیں بھی اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ Mark 14:61 میں ہے، انہوں نے جواب نہیں دیا۔ اور دوبارہ بڑا راہب ان سے پوچھ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا'' کیا آپ مسیح ہیں، رحیم کے بیٹے؟ دوسرے لفظوں میں'' کیا آپ مسیح ہیں، خدا کے بیٹے؟'' اور مسیح نے کہا'' ہاں، میں ہوں۔'' پس انہوں نے یوں کہا'' میں خُدا کا بیٹا ہوں'' اور انہوں نے یہ بھی کہا'' وہ خدا ہیں۔'' اور بائبل واضح طور پر کہتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے جن آیات کا حوالہ دینا مقصود تھا وہ دیا۔ ڈاکٹر نائیک ان آیات کا حوالہ دینا چاہتے تھے جن میں یسوع کے بشری پہلو کا تذکرہ ہے۔ لیکن دوسری آیات ہیں جن میں انہوں نے فرمایا'' میں اور باپ ایک ہیں۔'' بیان ہے کہ'' ابتداء میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے پاس تھا اور کلمہ خدا تھا اور خدا اِنسانی رُوپ میں آیا اور ہمارے درمیان رہا۔'' یسوع کے بپتسمے میں باپ بولا اور کہا۔'' یہ میرا چہیتا بیٹا ہے۔'' یسوع وہاں موجود تھا اور مقدس روح کا نزول ہوا۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ ہم نے اسے اپنی کوشش سے اختراع نہیں کیا ہے۔ یہ تو بہت چھوٹی بات ہے۔ اور اب میرے دوست کا سوال ...... '' ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے'' اور میں ہمیشہ سیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں مگر میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ 500 گواہوں نے یسوع کو مُردوں میں سے جی اُٹھتے دیکھا، مجھے ان سے زیادہ تقویت حاصل ہے بہ نسبت محمد ﷺ کے کہ جو 600 سال بعد بطور ایک مشاہد آئے۔ مہربانی۔

سوال: پہلے ڈاکٹر کیمبل نے کائنات کے بارے میں قرآنی افکار کے مد مقابل مقابلے میں مفروضہ دروغ حقائق پیش کرنے کی کوشش کی جو آپ نے رد کیے جن کا جواب نہیں دیا گیا۔ تاہم بائبل ساختِ ارض اور دوسرے پہلوؤں کے بارے میں کیا کہتی ہے، اس کا جواب نہیں آیا۔

ڈاکٹر ذاکر: بہن یہ سوال ہے کہ میں نے جواب نہیں دیا کہ بائبل میں زمین کی ساخت کے بارے میں کیا بیان ہے۔ کم وقت کے باعث یہ ہوا۔ میں 100 مزید نکات کی نشاندہی کر سکتا ہوں لیکن وقت کم ہے خیر، بہن جاننا چاہتی ہیں کہ بائبل زمین کی ساخت کے حوالے سے

کیا کہتی ہے۔بائبل (4:8 Gospel of Mathew) کہتی ہے، وہی حوالہ ہے جو ڈاکٹر کیمبل نے ترغیبِ گناہ کے ضمن میں دیا...... ''شیطان انہیں لے گیا..... (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو) ایک بہت ہی بلند پہاڑ پر اور انہیں روئے زمین کی بادشاہتیں اور ان کی شان وشوکت دکھائی۔(4:5 Gospel of Luke) ''شیطان انہیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا اور سلطانِ عالم کی شان وشوکت دکھائی۔'' اگر آپ دنیا کے بلند ترین پہاڑ پر بھی چڑھ جائیں، یعنی ماؤنٹ ایورسٹ پر اور فرض کریں کہ آپ کی بینائی بہت تیز ہے اور ہزار ہا میل دور تک صاف دیکھ سکتی ہے، پھر بھی آپ کے لیے ناممکن ہے کہ دنیا کی تمام سلطنتیں دیکھ پائیں۔ کیونکہ آج ہمیں علم ہے کہ دنیا گول ہے۔آپ دنیا کی دوسری طرف کی سلطنت نہیں دیکھ سکتے۔ یہ صرف اس صورت ممکن تھا کہ اگر دنیا چپٹی ہوتی۔بائبل بیان اس طرح ہے'' دنیا چپٹی ہے'' مزید برآں یہی بیان (4:10 - 11 Daniel) میں بھی دُہرایا گیا ہے، کہا گیا ہے'' ایک خواب دیکھا گیا کہ ایک درخت آسمان تک بلند ہو گیا اور اتنا زیادہ بلند ہو گیا کہ دنیا کے تمام اطراف کے لوگ اُسے دیکھ سکتے تھے۔'' ایسا صرف تبھی ممکن ہے اگر دنیا چپٹی حالت میں ہو۔ دنیا چپٹی ہو اور درخت بہت ہی بلند ہو اور تب تو یہ ممکن ہو سکتا ہے۔آج یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دنیا گول ہے۔ دنیا کے گول ہونے کے وجہ سے آپ مخالف سمت کے درخت کو، خواہ وہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، کسی صورت نہ دیکھ پائیں گے۔ اگر آپ مزید مطالعہ کریں تو (1st Chronicles 16:30) میں بیان ہے کہ'' زمین حرکت نہیں کرتی۔'' یہی بات (Psalms) میں بھی بیان کی گئی ہے۔(16:30)...... '' اور پھر (Psalms 93:1) میں اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ'' خدا نے زمین کو ٹھہرایا ہوا ہے۔'' جس کے معنی یہ ہیں کہ زمین حرکت میں نہیں ہے اور نئے عالمی اشاعت میں کہا گیا ہے۔

قائم کیا ہے اور اس کی حرکت کو روکا ہوا ہے جیسا کہ......

سیموئیل نعمان:

ایک منٹ!

ڈاکٹر ذاکر: ایک منٹ باقی رہ گیا ہے یا ذرا وقفہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

سیموئل نعمان:

ڈاکٹر ذاکر: مجھے ایسے لگا کہ آپ مجھے وقفہ کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔

بمطابق ڈاکٹر ولیم کیمبل کہ یسوع مسیح نے بائبل میں کئی مقامات پر کہا ہے کہ "وہ خدا ہیں۔" آپ میری ویڈیو کیسٹ "بڑے مذاہب میں خدا کا تصور" تمام حوالہ جات اور جوابات کی غرض سے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میں صرف اس بارے میں ذکر کروں گا جو کہ انہوں نے بیان کیا "میں اور میرا باپ ایک ہیں،" (John 10:30) میں درج ہے اور "ابتداء میں کلمہ تھا۔" (1:1 John) میں ہے۔ آپ سیاق وسباق کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدائی کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ آپ باہر ہال میں دستیاب میرے کیسٹ بڑے مذاہب میں تصورِ خدا اور اسلام و عیسائیت میں یکسانیت حاصل کر سکتے ہیں جن میں تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدا ہیں۔

ڈاکٹر محمد:

اگلا سوال سامنے کھڑی خاتون سے، ڈاکٹر ولیم کے لیے۔

سوال آپ نے ایک آزمائش کا ذکر کیا کہ سچے مومن اپنے ایمان کی وجہ سے زہر پی کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں ۔ آپ راسپوتین کے بارے میں کیا کہیں گے جس کو اتنا سائنائڈ (Cyanide) زہر دیا گیا جو 16 لوگوں کی ہلاکت کے لیے کافی تھا، وہ اس زہر سے نہ مرا، وہ خون کے ضیاع کے باعث مرا۔ وہ ایک اچھا عیسائی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایسا سب کچھ ہوا۔ آپ اس کی وضاحت کیسے کریں گے؟ اور صرف ایک اچھا عیسائی ہی زہر پی سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے، اس کی وضاحت کس طرح کریں گے؟

ولیم کیمبل: میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے۔ میری مراد ہے اگر راسپوتین ایک عیسائی نہیں تھا تو جو کچھ اس کے ساتھ گزرا وہ بائبل میں درج ہے، اس کے مقابلے میں کوئی بنیاد نہیں بن سکتا۔ میں نے پہلے کہا...... یسوع...... خدا کی یہ مرضی نہ تھی کہ ہم یہاں قطار بنا کر زہر پینا شروع کر دیں اور یہ دیکھیں کہ آیا وہ سچے خدا تھے۔ معاف کیجئے گا یہ خدا کو پرکھنے کا امتحان نہیں ہے۔ بس یہ بتایا گیا تھا کہ ایسا ہوگا۔ ایک مثال پال کی ہے، جب اس کا جہاز تباہ ہو گیا، مقام کا نام مجھے یاد نہیں۔ وہ ساحل پر اتر کر لکڑیاں آگ میں ڈال رہا تھا کہ سانپ نے اس کو ڈس لیا اُسے کچھ نہ ہوا۔ لیکن وہ خدا کو پرکھنے کی

کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ آگ میں لکڑیاں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک مختلف صورت حال ہے۔

ڈاکٹر محمد:

معذرت خواہ ہوں، آپ بات جاری رکھیں۔

ولیم کیمبل: میں صرف زمین کی گولائی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ باب نمبر 4 آیت نمبر 22 میں بیان ہے "وہ خدا، زمین کے دائرے سے اُوپر تاج پوش بیٹھتا ہے۔"

ڈاکٹر محمد: جی بھائی، ڈاکٹر ذاکر کے لیے سوال کریں۔

سوال ڈاکٹر ذاکر آپ نے کہا کہ قرآن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں عربی گرائمر کی 20 سے زیادہ غلطیاں پاتا ہوں۔ ان میں سے کچھ آپ کو بتاتا ہوں...... اُس نے بقرہ میں کہا اور انجم ... جو کہ درست ہے......کون سا لفظ درست ہے، السابعون یا الصابرین، سوال نمبر 2 آپ نے کہا......

ڈاکٹر محمد:

ایک وقت میں ایک سوال......مہربانی کر کے!

سوال اسی ضمن میں سورہ طٰہٰ 63 میں...... غلطی! کیا آپ کی وضاحت کر سکتے ہیں؟ اور اس غلطی سے بڑھ کر بھی کچھ ہے۔ (نعوذ باللہ)

ڈاکٹر محمد:

برادر ہم صرف سوال کے پہلے حصے کی اجازت دیں گے۔ دوسرے حصے کی اجازت نہیں دیں گے، کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ایک وقت میں ایک سوال، تاکہ دوسروں کو بھی موقع ملے۔

سوال بہتر بہتر۔

ڈاکٹر ذاکر: بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ میں زیادہ مطابقت کی کوشش کروں گا۔ انہوں نے 20 گرامر کے نکات بیان کیے ہیں۔ اور جس کتاب کا وہ حوالہ دے رہے ہیں، عبدالفعادی کی ہے......عبدالفعادی درست؟" کیا قرآن غلطی سے مبرا ہے؟" میں کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ الحمدللہ میری بینائی اچھی ہے۔ میں تمام 20 نکات کا ایک ساتھ جواب دوں گا کیونکہ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں تمام بیں کا جواب دوں گا انشاء

اللہ۔نکتہ نمبر 1: برادر نوٹ کریں کہ تمام عربی گرامر قرآن سے لی گئی ہے۔قرآن عربی کی عظیم ترین کتاب ہے۔ایک ایسی کتاب جو ادب کے اعلیٰ ترین معیار کی حامل ہے۔تمام عربی گرامر کا ماخذ قرآن ہے: جیسا کہ قرآن گرامر کی نصابی کتاب ہے اور تمام گرامر قرآن سے اخذ کی گئی ہے، لہٰذا قرآن میں ہرگز کسی غلطی کی گنجائش نہیں۔نکتہ نمبر 2 عرب میں کئی مختلف قبائل ہیں جن میں گرامر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبیل بھی میرے موقف سے متفق ہوں گے۔کسی قبیلہ میں جو لفظ مذکر ہے دوسرے میں مونث ہے ۔یعنی گرائمر کے ساتھ ساتھ جنس بھی بدل جاتی ہے۔کیا عربی زبان کی ایسی ناقص گرائمر قرآن کو جانچیں گے؟ نیز قرآن اپنی وضاحت کے لحاظ سے بہت اونچا بہت برتر ہے۔
اور انٹرنیٹ پر دیکھیں کے 12 گرامر کی غلطیاں ، 21 عبدالفعادی اور 20 گرائمر کی غلطیاں جو کہ عیسائیوں نے نہیں نکالیں۔ بلکہ مسلمانوں نے نکالی ہیں! زمک شریف جیسے مسلمان علماء نے قرآن کی گرائمر کو اتنا اعلیٰ قرار دیا کہ یہ عربوں کے روایتی استعمال کی ضد میں جاتی تھی۔انہوں نے جو مثالیں دیں ان میں سے صرف دو مثالیں 20 سوالوں کے جواب کے لیے کافی ہیں۔ایک یہ کہ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے تمام انبیاء کا انکار کیا۔

''انہوں نے انبیاء کا انکار کیا۔''

ڈاکٹر ولیم کیمپبیل کے مطابق ''نوح علیہ السلام کو قوم انبیاء سے منکر ہوئی'' تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان کے پاس صرف ایک پیغمبر روانہ کیا گیا تھا۔قرآن کے الفاظ ہونے چاہیے تھے،لوگوں نے ''پیغمبر'' کا انکار کیا ''پیغمبروں'' کا نہیں۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے۔جیسا کہ مجھے آپ کو علم ہے ناقص گرائمر کے سبب ایک ایک غلطی ممکن ہے لیکن اگر عربوں کی تحریر شدہ کتب کا مطالعہ کیا جائے......
قرآن کی دلنشینی کیا ہے؟ قرآن کی دلنشینی یہ ہے کہ...... قرآن ''پیغمبر'' کی بجائے ''پیغمبروں'' کا کیوں حوالہ دیتا ہے؟ آپ کو علم ہے کیوں؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں تمام پیغمبروں کے بنیادی پیغام کی نوعیت ایک ہی تھی کہ خدا ایک ہے......توحید کے بارے میں...... اللہ تعالیٰ کے بارے، میں۔لوط علیہ السلام کے تذکرے سے......نوح علیہ السلام کے لوگ، انہوں نے پیغمبر کا انکار کیا یہ آیت کہتی ہے کہ لوط علیہ السلام سے منکر ہونا ایسے ہی ہے جیسے بالواسطہ طور پر تمام پیغمبروں سے منکر ہونا حسن کلام اور فصاحت دیکھیے...... الحمدللہ! آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ ایک غلطی ہے یہ غلطی نہیں ہے۔انیس شورش قسم کے افراد قرآن کے الفاظ ''کُن فیکون'' پر اعتراض کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ ''کُن فکان'' کا استعمال درکار تھا۔ہم بلغرض تسلیم کریں کے عربی کا صیغہ ماضی ''کن فکان'' ہے لیکن ''کن فیکون'' اعلیٰ تر کلام ہے جس کے معنی ہیں......اللہ، وہ تھا، وہ ہے اور کرسکتا ہے۔ماضی، حال و مستقبل۔

سیموئل نعمان:

ڈاکٹر نائیک بہت مہربانی۔

ڈاکٹر محمد:

اب ہم سامنے موجود بھائی سے ڈاکٹر ولیم کیمبل سے سوال کریں گے۔

سوال ڈاکٹر کیمبل! یہ ایک بہت سنجیدہ سوال ہے......عیسائیت کے حوالے سے کچھ اور جاننے کے لیے۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ (John the Baptist) سے بپتسمے کے بعد یسوع کی خدمات کا عرصہ صرف تین سال کا تھا۔خدا کے بعد دوسرا طاقتور ترین شخص...... خدا کا بیٹا۔ان کی ابتدائی زندگی کی خدمات کیا ہیں۔پہلے سال سے لے کر 27 ویں یا 28 ویں سال تک ان کی خدمات میں نمایاں کونسی تھیں؟

سیموئیل نعمان:

یہ تو...ڈاکٹر کیمبل معاف کیجئے گا......یہ تو آج رات کا موضوع نہیں۔

سوال خطاب کے آغاز میں ڈاکٹر کیمبل نے ذوالقرنین کا تذکرہ کیا، قرآن کی 18 ویں سورہ کہف سے، اور ذوالقرنین سے مراد سکندرِ اعظم کی ہے۔کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ ذوالقرنین سے مراد سکندرِ اعظم ہے؟

ولیم کیمبل: میں نے یہ بات صرف یوسف علی کے تبصرے میں پڑھی ہے۔مگر اس سے قطع نظر کہ وہ سکندرِ اعظم ہے یا کوئی اور، سورج ایک کثیف دلدل میں غروب نہیں ہوتا اور مذکورہ آیت میں یہ بات ہے بیان کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد:

جی بہن! ڈاکٹر ذاکر سے سوال کریں۔

سوال میں مخصوص آیت کی نشاندہی نہیں کرسکتی لیکن بائبل کا بیان ہے......جب یونس علیہ السلام تین دن اور تین راتیں مچھلی کے پیٹ میں تھے، تو اسی طرح ابن آدم تین دن اور تین

رات زمین کے قلب میں ہوگا۔ کیا سائنسی لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یونس علیہ السلام کی علامت بن سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر: بہن نے بائبل کی آیت، گوسپل آف میتھیو باب نمبر 12 آیات نمبر 40-38 کا حوالہ دیا جب لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا "مجھے کوئی نشانی نہیں دی جائے گی۔ لیکن یونس علیہ السلام کی صورت میں۔ اس لیے کہ یونس علیہ السلام تین دن اور تین رات وہیل مچھلی کے بطن میں رہے، اسی طرح ابن آدم تین دن اور تین راتیں زمین کے قلب میں رہے گا۔" یونس علیہ السلام کی نشانی ...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے تمام انڈے ایک ٹوکری میں رکھے اور اگر یونس علیہ السلام کی نشانی کی بات کریں ...... یونس علیہ السلام کی کتاب دو صفحات سے کم ہے اور یہ بات ہم میں سے زیادہ تر کو علم ہے۔ اگر آپ یہ تجزیہ کریں کہ یونس علیہ السلام تین دن اور تین رات ...... مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ...... ہمیں بائبل کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مصلوب کیا گیا تھا۔ مبینہ مصلوب۔ مبینہ۔ رات کے پچھلے پہر آخری پہر انہیں صلیب سے اتار کر قبر میں رکھ دیا گیا جبکہ اتوار کی سحر قبر پر پتھر ہٹا ہوا تھا، اور مقبرہ خالی تھی۔ گویا یسوع مسیح جمعہ کی شب، ہفتہ کی صبح مقبرہ میں تھے۔ ایک روز ایک شب اور ہفتہ کی شب مطلب دو شب ایک روز جبکہ اتوار کی صبح مقبرہ خالی تھا۔ لہٰذا یسوع مسیح دو شب ایک دن رہے جو کہ تین شب تین روز کا نہیں بنتا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا جواب ہے کہ۔

"آپ جانتے ہیں کہ دن کا حصہ بھی دن کے طور پر شمار ہو سکتا ہے۔ اگر ایک مریض، جو ہفتے کی رات بیمار ہوا، میرے پاس سوموار کی صبح آئے اور میں اس سے سوال کروں گا "تم کتنے دنوں سے بیمار ہو؟" وہ کہے گا ...... "تین دن سے" بمطابق نظریہ مطابقت آپ سے اتفاق ہے۔ میں بہت فراخ دل ہوں۔ آپ کے نزدیک کچھ حصہ سے مراد ایک مکمل دن تسلیم کرتا ہوں۔ لہٰذا

ہفتہ کی رات	دن کا ایک حصہ	ایک دن
اتوار	دن کا ایک حصہ	ایک دن
سوموار	دن کا کچھ حصہ	ایک دن

کوئی مسئلہ نہیں اگر مریض کہتا ہے "تین دن" اعتراض نہیں کرتے۔ لیکن کوئی مریض یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ تین دن تین راتیں میرا چیلنج ہے۔ الحمد للہ کافی مریضوں سے ملاقات کر چکا ہوں ایسا ایک بھی مریض بشمول مسیحی تبلیغیوں کے نہیں ملا جو کہتا ہو کہ "میں تین راتوں تین دن سے بیمار

ہوں۔"لہٰذا یسوع مسیح کے الفاظ "تین دن" نہیں "تین راتیں اور تین دن" تھے جو کہ حسابی غلطی ہے۔

یسوع مسیح نے سائنسی لحاظ سے ثابت نہیں کیا۔نیز پیش گوئی کہتی ہے...... "جیسا کہ یونس علیہ السلام تھے،ابن آدم بھی ایسا ہی ہوگا۔"یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کیسے تھے؟ مچھلی کا پیٹ......مُردہ یا زندہ؟ زندہ!جب انہیں باہر اُگل دیا گیا تو وہ زندہ تھے۔وہیل مچھلی کے پیٹ میں وہ سمندر میں گھومتے رہے،مُردہ یا زندہ؟......زندہ!وہ خدا کی عبادت کرتے رہے......مُردہ یا زندہ؟......زندہ!انہیں قے کی صورت باہر ساحل پر اُگل دیا گیا تھا،مُردہ یا زندہ؟......زندہ!زندہ!زندہ!جب عیسائیوں سے سوال کرتا ہوں......"یسوع مسیح قبر میں کس حال میں تھے......مُردہ یا زندہ؟ان کا کہنا ہے......"مُردہ۔"

(سامعین:)زندہ!

ڈاکٹر ذاکر: زندہ؟الحمدللہ کسی مسیحی کے الفاظ ہیں؟اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام حیات ہیں تو مصلوب نہیں ہوئے اور اگر مردہ تھے تو تمثیل کو تکمیل نہیں کی،آپ میری ویڈیو کیسٹ دیکھ سکتے ہیں جس کا عنوان ہے کیا واقعتاً عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا؟" ملاحظہ فرمائیں۔میں نے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب نہیں کیا گیا تھا،جیسا کہ قرآن سورہ نساء سورۃ نمبر 4 آیت نمبر 157 میں کہتا ہے......"انہوں نے اُسے نہیں مارا،نہ ہی مصلوب کیا،بس کچھ ایسا ظاہر آدکھائی دیا۔"

سیموئیل نعمان:

مہربانی،ڈاکٹر نائیک!

ڈاکٹر محمد:

ڈاکٹر ولیم سے سوال کریں۔

سوال ڈاکٹر کیمبل!چونکہ آپ ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں،کیا آپ مہربانی کر کے بائبل میں بیان کردہ مختلف طبی پہلوؤں کو واضح کریں گے۔

اپنی جوابی تقریر میں آپ جراثیم کش کے طور پر استعمال خون،کڑوے پانی کی آزمائش برائے معلومات زنا کاری نیز اہم ترین کے بچے کو پیدائش کی نسبت بچی کی پیدائش کے بعد ماں دگنا وقت کیوں ناپاک رہتی ہے۔

ولیم کیمبل: آپ کے سوال کا شکریہ،اور میں اس کا جواب دوں گا۔لیکن ڈاکٹر نائیک سے وہ سوال کئے جارہے ہیں جو ایک عیسائی سے کئے جانے چاہئے تھے۔کہا گیا ہے کہ......

"اگلے دن جبکہ ایک دن گزر چکا تھا بڑے پادری اور رہنما دعا گو افراد کی قیادت میں پوری تیاری سے آئے اور بیانو ہوئے کے جناب! ہمیں یاد ہے کہ جب وہ حیات تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ مجھے تین دن بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔لہٰذا قبر کو محفوظ کرنے کے لیے تیسرے روز تک پانی ڈالیں۔"

لہٰذا وہ تبدیل ہونے والے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔تیسرا دن، تیسرے دن بعد اس کے ساتھ برابر ہے جو یسوع مسیح کے ساتھ قبر میں پیش آیا۔دیگر امر ہے ان کا دوبارہ زندہ ہونا۔ایک اور امر ہے کہ جب جمعرات کی شب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا۔

سیموئیل نعمان:

مہربانی کر کے خاموش ہو جائیں۔اس طرح کام نہیں چلے گا۔مہربانی کر کے صبر کریں۔

ولیم کیمبل: جمعرات اور جمعرات کے بعد...... جب وہ گرفتار تھے،انہوں نے کہا...... "میرا وقت آ گیا ہے۔" اس لیے میں نے تین دن اور تین رات شمار کیے ہیں۔پھر آپ نے مجھ سے بائبل میں ان مقامات کے بارے میں پوچھا ہے۔میرا عقیدہ ہے کہ بائبل خدا کی تحریر ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ خدا نے ان مقامات کو بائبل میں رکھا۔اس لیے میں وضاحت کا ذمہ نہیں کہ خدا نے کیا کہا۔لیکن میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ خدا نے ان چیزوں کو بائیبل میں رکھا۔

ڈاکٹر محمد:

پیچھے تشریف فرما بھائی ڈاکٹر ذاکر سے آخری سوال کریں گے جس کے بعد انڈیکس کارڈ پر تحریر شدہ سوالات کا سلسلہ ہوگا۔وقت کی مقررہ حد میں یہ آخری سوال ہوگا۔

سوال: علم حیاتیات میں ارتقاء کے عمل کا طالب علم ہونے کے ناطے میں بحوالہ ارتقاء دیئے گئے اسلامی جواب پر حیران ہوا۔اگر آپ اختصار کے ساتھ بتا سکیں کہ مذہب اسلام ارتقاء کے عمل اور عمل تخلیق کے حوالے سے کیا بیان کرتا ہے؟

ڈاکٹر ذاکر:

بھائی نے ایک سوال پوچھا ہے۔ڈاکٹر ولیم کیمبل کے بے تکلفی سے جواب دینے کی طرح میں بھی بالکل اسی طرح بے تکلفی سے جواب دینا چاہوں گا۔قرآن میں سکندر کا نام کہیں نہیں آیا۔ذوالقرنین بیان کیا گیا ہے...... نہ کہ سکندر۔اگر کسی تبصرہ نگار نے غلطی کی ہے تو یہ تبصرے کی غلطی

ہے۔انسانوں نے غلطی کی ہے ...... نہ کہ خدا کے کلام نے۔ بائبل کی بابت یہ کہنا کہ "دنیا" (Isaiah) میں "ایک دائرہ ہے" کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ "دائرہ" کہتی ہے نہ کہ "گنبد نما" پس ایک مقام پر بائبل اسے "چپٹی" کہتی ہے دوسری جگہ "دائرہ" کہتی ہے۔ اگر ہر دو آیات کو مانا جائے تو تصور آتا ہے ایک پتلی چپٹی گول شے دیکھیں کیا زمین کی ساخت ایسی ہے؟ یہ دائروی اور چپٹی ہے ...... یہ زمین نہیں ہے۔قرآن میں حیاتیات اور عمل ارتقا ...... برادر نے دو سوال کیے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں دونوں کا جواب دے سکتا ہوں یا نہیں ...... بذات خود مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

سیموئیل نعمان:

کسی ایک کا جواب دیں!

ڈاکٹر ذاکر:

کونسا؟ پہلا یا دوسرا؟ حیاتیاب؟ عمل ارتقا؟

سیموئیل نعمان:

عمل ارتقا مناسب رہے گا۔

ڈاکٹر ذاکر:

آپ انتخاب کر رہے ہیں یا وہ انتخاب کر رہا ہے؟

سیموئیل نعمان:

اس نے چونکہ عمل ارتقا کی بات کی ہے اس لیے میرے خیال میں یہی مناسب ہے۔

ڈاکٹر ذاکر:

دو سوال۔ پہلے حیاتیات اور پھر عمل ارتقا۔ اگر آپ مجھے دس منٹ دیں تو دونوں کا جواب دوں گا۔

ڈاکٹر محمد:

صرف پانچ منٹ میں، جو کچھ آپ بیان کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر:

چلیں ٹھیک ہے......! مجھے صاحب صدر مسٹر سیموئیل نعمان سے اتفاق ہے عمل ارتقاء کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ صحیح جواب میری ویڈیو کیسٹ قرآن اور جدید سائنس سے ملے گا۔ جب عمل ارتقا کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو آپ ڈارون کے نظریے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ڈارون اپنے H.M.H نامی جہاز کے ذریعے ایک (Calatropis) نامی جزیرے پر گیا اور وہاں پرندوں کو طاقتوں پر چونچلے کرتے دیکھا۔ اس مشاہدے کی بنا پر کہ پرندوں کی چھوٹی اور بڑی چونچیں ہوتی ہیں اس نے مطالعہ کے لیے ''قدرتی انتخاب کے نظریہ'' کو پیش کیا۔ 19 ویں صدی میں اپنے ایک دوست تھامس تھامپسن کو تحریر کردہ خط میں لکھا۔

> ''قدرتی انتخاب کی حمایت میں میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر ابتدائی اعضاء کے بارے میں علم جنین کی درجہ بندی میں اس سے مجھے مدد ملی لہٰذا میں نے اس کو پیش کیا۔''

ڈارون کا نظریہ ہرگز مبنی بر حقیقت نہیں ہے اور صرف نظریہ ہے۔ اور آغاز گفتگو میں واضح کر چکا ہوں کہ قرآن ایسے نظریات سے متضاد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نظریات U ٹرن لے سکتے ہیں۔ مگر قرآن کسی تسلیم شدہ حقیقت سے تضاد نہیں رکھ سکتا۔ اسکولوں میں ڈارون کا نظریہ ایسے پڑھایا جاتا تھا۔ جیسے یہ مبنی بر حقیقت ہو سکیں یہ حقیقت نہیں قطعاً کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ''بعض لاپتہ کڑیاں ہیں''

کوئی شخص اپنے دوست پر یوں تمسخر کر سکتا ہے کہ ''اگر تو ڈارون کے دور میں ہوتا تو ڈارون کا نظریہ صحیح ثابت ہوتا۔'' معنوی انداز میں اس کو لنگور جیسا بیان کرنا۔ ڈارون کے نظریہ میں لاپتہ کڑیاں ہیں۔ میں چار موجود ڈھانچوں کے بارے معلومات رکھتا ہوں۔

The Hominoids.... The Lucy Orthalopetians جو موجود ہیں

Cromageron اور Naindertoiman، کے ہمراہ Homoeructus اپنے محافظ

برائے تفصیلات میری ویڈیو کیسٹ دیکھیں۔

سالمی حیاتیات کے بارے میں ہینس کرے (Hansis Cray) DNAL کو ڈینگ کے مطابق بندروں سے انسانی ارتقاء پذیری کو ناممکن قرار دیا ہے۔ (میری ویڈیو کیسٹ میں تمام تفاصیل ہیں) حیاتیات کے چند اجزاء کے حوالے سے میں معترض نہیں ہوں۔ قرآن کی سورۃ

الانبیاء سورۃ نمبر 21 آیت نمبر 30 میں کہا گیا ہے۔

''ہم نے پیدا کیا ہر مخلوق کو پانی سے پر تم کیا یقین نہ کرو گے؟''

آج سب کو معلوم ہے کہ ہر زندہ مخلوق کا بنیادی جزو خلیہ کا زندہ حصہ تقریباً 90 فیصد پانی پر مبنی ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق 50 سے 90 فیصد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ عرب کے صحرائیں کون تصور کر سکتا تھا کہ ہر شئے کا ماخذ پانی ہے۔ 1400 سال قبل یہ بات قرآن نے بتائی۔

سیموئیل نعمان:

وقت! ڈاکٹر نائیک!

ڈاکٹر ذاکر نائیک! مہربانی

سیموئیل نعمان:

آپ کی بہت مہربانی۔

ڈاکٹر محمد:

اب کاغذ کے پرچوں والے سوالات شروع کیئے جائیں گے۔ یہ صندوق ڈاکٹر ولیم کیمبل کے لیے مخصوص ہے جبکہ دوسرا صندوق ڈاکٹر ذاکر نائیک کے لیے۔ ہم ان کے ناموں والی جانب ان کی طرف پھیر دیتے ہیں تاکہ وہ دیکھ نہیں سکیں جبکہ آپ لوگ دیکھ سکیں۔ وہ صندوق کی جانب بغیر دیکھے سوال اُٹھائیں گے اور اپنے اپنے سوال کا جواب خود دیں گے۔ اول سوال ڈاکٹر ولیم کیمبل کے لیے جبکہ دوئم سوال ڈاکٹر ذاکر نائیک کے لیے۔ وہ اپنے سوالات پہلے ہی اُٹھا سکتے ہیں تاکہ ہمارا وقت ضائع ہونے سے بچ جانے کی طرف سے سوالات شروع کیئے جا سکتے ہیں۔ اور ہم ڈاکٹر ولیم کیمبل کو مہلت دی جاتی ہے کہ اپنا سوال پڑھ لیں۔ یہ پہلا سوال؟

ولیم کیمبل: میں سوال کو پڑھوں گا مگر پہلے میں اس بارے میں ''بات کرنا چاہتا ہوں کہ سب کچھ پانی سے بنا ہے'' یہ تو بالکل واضح ہے۔ جب کبھی آپ کسی کیڑے کو ماریں، یہ پانی سے بنا ہے۔ ہر جاندار پانی سے بنا ہے۔ لیکن یہ ایک قابل مشاہدہ امر ہے۔ یہ کوئی معجزہ نہیں ہے۔

(سوال کنندہ...... ڈاکٹر ولیم کیمبل سے):

سوال: اچھا ڈاکٹر کیمبل، اگر آپ تخلیق کے بارے میں کتاب پیدائش میں موجود تضادات کا جواب نہیں دے سکتے تو کیا اس سے یہ ثبوت نہیں ملتا تاکہ بائبل غیر سائنسی ہے اور اس

لیے کلام خدا نہیں ہے؟

ولیم کیمبل: میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے اس میں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ لیکن میرے پاس تمام تکمیل شدہ پیش گوئیاں بھی تو ہیں اور یہ امر میں بہت اہم سمجھتا ہوں اور یہ انبیاء کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں اور انبیاء نے یہی پیش گوئیاں کیں اور حواریوں نے لکھیں، جب خدا نے پیش گوئیوں کی تکمیل کر دی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ لیکن میرا ایمان...... مسیح پر ہے، اپنے نجات دہندہ کے طور پر۔

سیموئیل نعمان:

آپ کا شکریہ۔ ڈاکٹر نائیک اب آپ سوال اُٹھائیں۔

ڈاکٹر ذاکر:

''عبارت'' اور ''ترجمہ'' دو مختلف الفاظ ہیں جن کے بائبل میں مختلف معنی بنتے ہیں۔ انگلش میں ''ایک عبارت'' یا ''ایک ترجمہ'' ناممکن ہے کہ بلحاظِ سائنسی عبارت اور ترجمہ بالکل ایک ہی چیز ثابت کیے جاسکیں۔ کیا خدا نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی وحی انگلش میں نازل کی؟ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے۔ کیا اصل عبارت اور ترجمہ مشابہ ہو سکتے ہیں؟ نہیں! اصل عبارت اور ایک ترجمہ بالکل ایک طرح کے نہیں ہو سکتے البتہ قریب قریب ہو سکتے ہیں۔ اور مولانا عبدالماجد دریا نے جیسا کہ کہا ہے کہ ترجمہ کرنے کے حوالے سے دنیا کی سب سے مشکل کتاب قرآن مجید ہے۔ کیونکہ قرآن کی زبان اتنی فصیح، اتنی برتر، اتنی بلند مرتبہ ہے اور عربی میں ایک لفظ کئی معنی کا حامل ہوتا ہے لہٰذا قرآن کا ترجمہ کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ (ترجمہ اور اصل عبارت) ایک جیسے نہیں ہیں۔ اور اگر ترجمے میں کوئی غلطی ہے تو یہ انسانی قابلیت کی کمی ہے۔ جس انسان نے ترجمہ کیا صرف وہ ہی غلطی کا مرتکب ہوا ہے نہ کہ خدا۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا بائبل کا نزول انگریزی میں ہوا تھا؟ نہیں! بائبل انگلش میں نازل نہیں ہوئی تھی۔ قدیم عہد نامہ عبرانی زبان میں ہے اور عہد نامہ جدید یونانی زبان میں گو کہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان بولتے تھے لیکن اصل مسودہ جو یونانی زبان میں ہے۔ اصل عبرانی زبان والا عہد نامہ قدیم موجود نہیں ہے۔ کیا آپ کو علم ہے کہ عہد نامہ قدیم کا یونانی زبانی سے عبرانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ قدیم عبرانی زبان والا اصل ''عہد نامہ قدیم'' عبرانی زبان میں موجود نہیں ہے۔ آپ کا دورخ والا مسئلہ ہے۔ لہٰذا نقل نویسی کی غلطیوں کی موجودگی تعجب انگیز نہیں۔ مگر الحمد اللہ قرآن کا اصل عربی متن موجود ہے۔ الحمدللہ آپ سائنسی لحاظ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اصل متن

ہی ہے۔

جہاں تک سوال ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کے نزول کا تو اس حوالے سے کچھ دیر پہلے اپنے جوابات اور تقریر میں بھی بیان کر چکا ہوں کہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کی سورہ رعد سورۃ نمبر 13 آیت نمبر 38 میں بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی الہامی کتابیں نازل کیں۔صرف 4 کا تذکرہ ہے، تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔تورات وحی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی: زبور وحی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی: انجیل وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور قرآن آخری و قطعی وحی ہے جو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔لیکن موجودہ بائیبل وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جیسا کہ ہمارا ایمان ہے۔

سیموئیل نعمان:

مہربانی۔اب ڈاکٹر کیمپبیل کی باری ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبیل:

مگر ہمیشہ سے رہنے والی انجیل ہی موجودہ انجیل ہے۔جس کے 75 فیصد حصے 180 عیسوی کے جان John کے تحریر کردہ ہیں۔جو اس نے اپنی زندگی میں خود تحریر کئے۔اس وقت جاننے والے افراد حیات تھے۔جن کے بارے میں ان کے آباؤ اجداد بذریعہ Jhon ایمان لائے تھے۔یہ اچھی شہادت اور اچھا متن ہے۔بائیبل مستند تاریخ ہے۔آپ کے پیش کردہ امکان کا جو سوال ہے یہ خوب شماریات ہیں۔مہربانی۔مگر خدا کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔

خدا مکمل اختیار کا حامل ہے اور اپنی مرضی سے انتخاب کر سکتا ہے۔امیری یا غریبی یا کوئی دیگر معاملہ اہمیت نہیں رکھتا۔آپ کا مفروضہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ یسوع غریب تھے۔ان کو منتخب کیا گیا۔انہوں نے کہا "آدم کی اولاد کے پاس سر رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔" مجھے اس بارے میں یقین نہیں ہے۔شماریات کے اس بارے میں کچھ کہنے کے حوالے سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔شماریات تو اس حوالے سے تھی کہ کتنے افراد ان پیشن گوئیوں کی تکمیل کر سکے۔اس بات کے معاون ہونے کے بارے میں میں امید رکھتا ہوں۔مہربانی

سیموئیل نعمان:

مہربانی......ڈاکٹر نائیک اب آپ ازراہ کرم بات کریں۔

شکریہ!

ڈاکٹر ذاکر: ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو قرآن جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر جدید سائنس غلط ہو تو پھر کیا ہو؟ کیا قرآن سائنسی تبدیلیوں کے عکاس کے طور پر ہمیشہ تبدیل ہوتا رہے؟ یہ ایک بہت اچھا اور اہم سوال ہے۔ اور ہم مسلمانوں کو قرآن اور جدید سائنس میں ہم آہنگی دکھاتے وقت بہت احتیاط برتنی چاہیے اسی لیے اپنی گفتگو کے آغاز میں میں نے واضح کیا تھا کہ صرف ایسے سائنسی حقائق کے بارے میں بات کروں گا جو کہ تسلیم شدہ ہیں۔ اور ایک تسلیم شدہ سائنسی حقیقت، مثال کے طور پر، زمین کا گول ہونا کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ تسلیم شدہ سائنس 180 کے زاویے پر نہیں مڑ سکتی۔ لیکن غیر تسلیم شدہ سائنس جیسے قیاس اور نظریات مڑ سکتے ہیں میں ایسے مسلم عالموں سے واقف ہوں جو ڈارون کے نظریے کو قرآن سے ثابت کرنے کی احمقانہ کوشش کر چکے ہیں۔ پس ہمیں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور جدید سائنس کی ہر بات کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں احتیاط کے ساتھ جانچنا چاہیے کہ بات تسلیم شدہ ہے یا غیر تسلیم شدہ۔ اگر یہ ثابت شدہ ہے، سائنسی ثبوت کے ہمراہ تو الحمد للہ قرآن کبھی اس سے متضاد نہیں ہوگا۔ مفروضے کی صورت میں صحیح و غلط دونوں کے امکانات نہیں۔ عظیم دھماکے کا نظریہ پہلے مفروضہ تھا۔ کچھ عرصہ قبل مفروضہ تھا مگر آج آسمانی مادے کے ٹھوس ثبوت کے بعد اسٹیفیسن ہاکنگ وغیرہ کے مطابق یہ حقیقت بن چکا ہے۔ لہٰذا عظیم دھماکہ اگر کل مفروضہ تھا آج حقیقت ہے جب ایک بات حقیقت بن جاتی ہے تو میں اس سے مستفید ہوتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ کچھ مفروضات کہتے ہیں ''بنی نوع انسان جینز کے صرف ایک جوڑے سے بنے ہیں،'' آدم اور حوا میں اس سے استفادہ نہیں کرتا کہ یہ قرآن کی مطابقت میں ہے کہ ہم

آدم وحوا کے جوڑے کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔ پس قرآن اور سائنس میں نسبت قرار دیتے وقت یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ صرف اُن سائنسی حقائق کو بیان کریں جو کہ تسلیم شدہ ہیں ...... نہ کہ مفروضات وقیاسات۔ کیونکہ قرآن جدید سائنس کے مقابلے میں بہت ہی عظیم تر ہے۔ میں قرآن کو سائنس کی مدد سے کلام خداوندی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا...... میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ ہم مسلمانوں کے لیے قرآن ایک حتمی معیار ہے۔ دہریوں اور غیر مسلموں کے لیے ممکن ہے سائنس حتمی معیار ہو۔ میں یہ معیار بیان کر رہا ہوں ملحد کا پیمانہ بمقابلہ مسلمانوں کا پیمانہ ... قرآن۔ میری کوشش تو صرف یہ ہے کہ میں دلیل کے ذریعے قرآن کی عظمت ظاہر کرتا ہوں کہ سائنس کی بتائی ہوئی کل کی بات قرآن نے 1400 سال قبل بیان کردی تھی۔ میری سعی یہ ہے کہ ہمارا معیار...... مسلم معیار...... قرآن آپ کے معیار کی نسبت بہت عظیم تر ہے لہٰذا آپ کو قرآن پر ایمان لانا چاہیے جو کہ عظیم تر ہے۔ امید ہے جواب مل گیا۔

سیموئیل نعمان: مہربانی ذاکر نائیک۔

ڈاکٹر محمد: ڈاکٹر کیمپبل کی باری۔

سموئیل نعمان: آخری سوال ہے۔

ڈاکٹر محمد: معذرت چاہوں گا، آخری دو سوال مقررین کے لیے باقی ہیں ہماری سامعین سے گذارش ہے کہ چند منٹ اور ہمارے ساتھ گزاریں۔ ہمارے پاس کاغذ پر آخری سوال ڈاکٹر کیمبل کے لیے اور پھر ڈاکٹر ذاکر کے لیے ہے۔

اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اختتامیہ کا انتظار کریں۔

(سوال برائے ڈاکٹر ولیم کیمبل)

سوال: یہ تو بالکل گزشتہ سوال کی مانند ہے۔ ڈاکٹر ولیم کیمبل نے تسلیم کیا کہ ڈاکٹر ذاکر نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی وہ غلط نہیں ہیں اور یہ کہ وہ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں لہٰذا کیا

ڈاکٹر کیمبل تسلیم کرتے ہیں کہ غلطیوں کی موجودگی کے سبب بائبل میں مکمل خدا کا کلام نہیں ہے؟

ولیم کیمبل: بائبل میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں ...... جن کا فی الوقت میرے پاس جواب نہیں ہے۔ اور میں اس بات کی خواہش رکھتا ہوں کہ کوئی جواب آئے۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں جن کی تصدیق آثارِ قدیمہ نے کر دی ہے اور بائبل کی حقانیت بھی ......

قصبوں کی بات اور یہ کہ کون بادشاہ تھا اور ان جیسے امور ثبوت کے طور پر کافی ہیں کہ بائبل ایک مستند تاریخ ہے۔

سیموئیل نعمان:

(سوال برائے ڈاکٹر ذاکر)

سوال سوال کیا گیا ہے کہ "کیا بائبل میں مزید ریاضیاتی تضادات موجود ہیں؟" یہ کیا ہے ...... بائبل یا اسلام؟ ...... معذرت۔ "کیا اسلام میں مزید ریاضیاتی تضادات ہیں؟ کیا مزید بھی ہیں؟

یہاں بائبل ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں نے تضادات کی بات کی ہے۔ خیر اسلام کے حوالے سے سورۃ نساء سورۃ نمبر 4 آیت نمبر 82 میں قرآن کہتا ہے۔

"کیا وہ نہیں سمجھے قرآن کو غور سے؟ اس میں بہت تضادات ملتے اگر یہ اللہ کی بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا۔"

بائبل میں تضادات کی نشاندہی کے لیے 5 منٹ کم ہیں۔ اگر 5 دن بھی بات کروں تب بھی کم ہیں۔ تاہم بعض کا ذکر کروں گا کتاب دوئم سلطنت باب نمبر 8 آیت نمبر 26 میں کہا گیا ہے۔ "Ahezia بائیس سال کا تھا جب اس نے حکمرانی شروع کی۔" 2nd Chronicles کے باب نمبر 22 آیت نمبر 2 میں ہے کہ "وہ 42 سال کا تھا۔ جب اس نے

حکمرانی شروع کی۔'' اس کی عمر 22 سال تھی۔ یا 42 سال؟ ریاضیاتی تضاد۔ مزید 2nd Chronicles کے باب نمبر 21 آیت نمبر 20 میں کہا گیا ہے۔ Ahezia کے باپ Joaram نے 32 سال کی عمر میں حکمرانی کا آغاز کیا اور 8 سال تک حاکم رہنے کے بعد فوت ہو گیا 40 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ فوراً ہی Ahezia 42 سال کی عمر میں اگلا حکمران بن گیا۔ باپ کے 40 سال کی عمر میں وفات کے بعد فوراً بیٹا 42 سال کی عمر میں اقتدار سنبھالتا ہے کس طرح بیٹا باپ سے 2 سال بڑا ہو سکتا ہے؟ یقین کریں ہالی وڈ کی فلم میں بھی ایسا بیٹا معرض وجود میں لانا ناممکن ہے۔

ہالی وڈ کی فلم میں آپ (ایک سینگ والا افسانوی گھوڑا) وجود میں لا سکتے ہیں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ آپ بائبل میں مذکور اژدھے اور سانپ پیش کر سکتے ہیں۔

لیکن ہالی وڈ میں آپ ایسا بیٹا نہیں دکھا سکتے جو اپنے باپ سے عمر میں دو سو سال بڑا ہو۔ معجزات میں بھی ناممکن ہے......! معجزے میں آپ کنواری کا پیدا کیا بیٹا دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن معجزے میں آپ کو اپنے باپ سے دو سال بڑا بیٹا نہیں دکھائی دے سکتا۔ اگر آپ مزید مطالعہ کریں تو بائبل 2nd Samuel کے باب نمبر 24 آیت نمبر 9 میں بیان ہے کہ ''بنی اسرائیل کے آٹھ لاکھ لوگوں نے جبکہ یہودا کے پانچ لاکھ لوگوں نے حصہ لیا۔''

دوسرے مقام پر دیکھیں 1st Chronicle باب نمبر 21 آیت نمبر 5 میں بیان ہے۔

''ایک ملین دس لاکھ افراد نے بنی اسرائیل کی طرف سے حصہ لیا۔ دس ہزار چار سو ساٹھ افراد نے یہودا کی طرف سے حصہ لیا۔''

بنی اسرائیل کے 8 لاکھ افراد نے جنگ میں حصہ لیا یا دس لاکھ افراد نے؟ یہودا کے 5 لاکھ یا 10460 افراد نے جنگ میں حصہ لیا؟

ایک صاف تضاد نیز بائبل 2nd Samuel کے باب نمبر 6 آیت نمبر 23 میں کہا

گیا ہے۔

"Michael جو کہ Sauf کی بیٹی تھی کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔" 2nd Samuel کے باب نمبر 21 آیت نمبر 8 میں مذکور ہے۔

"Michael جو کہ Saul کی بیٹی تھی کے پانچ بیٹے تھے۔"

ایک مقام پر بتایا جاتا ہے کہ کوئی اولاد نہیں دوسرے مقام پر پانچ بیٹے مزید اگر آپ مطالعہ کریں میتھیو کی انجیل باب نمبر 1 آیت نمبر 16 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شجرہ کا ذکر ہے جبکہ Luke باب نمبر 3 آیت نمبر 23 میں یوسف کو یسوع کا باپ بیان کیا گیا ہے جس کا باپ یعقوب تھا ۔میتھیو کی انجیل باب نمبر 1 آیت نمبر 16 اور Lauke باب نمبر 3 آیت نمبر 13 میں بیان ہے کہ یسوع کا باپ یوسف اس کا باپ ہیلے تھا۔ کیا یسوع کے باپ یوسف کے دو باپ تھے؟ آپ ایسے شخص کو کیا کہتے ہیں جس کے دو باپ ہوں؟ کیا ہیلے تھا یا یعقوب؟ مکمل متضاد بیانات۔

سیموئیل نعمان:

مہربانی ڈاکٹر نائیک، آپ کا بے حد شکریہ۔

ڈاکٹر محمد:

کیا آپ مزید دو منٹ ہمارے ساتھ رک سکیں گے؟ یہاں مشہور بین الاقوامی عالم ڈاکٹر جمال بدوی موجود ہیں اور اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کی طرف سے، ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ وہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تازہ ترین کتاب "قرآن اور جدید سائنس، ہم مطابقت آہنگ یا غیر ہم مطابقت" کی عام نمائش کے لیے رونمائی کریں گے۔

ڈاکٹر جمال بدوی کتاب کی عام نمائش کے لیے جو کہ حال ہی میں اس کی رونمائی ہوئی۔

ڈاکٹر جمال بداوی:

اس سے بہتر اور کوئی بات نہ ہوگی کہ دوستی کے اظہارِ جذبات کی غرض سے ڈاکٹر ذاکر یہ کتاب ڈاکٹر کیمبل کو خود پیش کریں۔

ڈاکٹر محمد:

کیونکہ اس کتاب کے ہمارے پاس بہت محدود نسخے ہیں اس لیے صرف غیر مسلم سامعین سے گذارش ہے کہ اگر انہیں دلچسپی ہو تو وہ ہال سے باہر جاتے تھے وقت براہِ کرم یہ کتاب بغیر ادائیگی کے لے جائیں۔ ہمیں دلی مسرت ہوگی۔ اب میں شکریہ کے اظہار کے لیے ڈاکٹر سبیل احمد کو دعوت دیتا ہوں۔

ڈاکٹر سبیل احمد:

ایک بار پھر شمالی امریکہ کے اسلامی حلقے کی طرف سے آپ سب کا صبر پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بہت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

کیا
قرآن مجید اللہ تعالیٰ
کا کلام ہے

حصہ اوّل

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا سامعینِ مباحثہ سے خطاب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، اَمَّا بَعْدُ!
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥

قابلِ صدر توقیر مہمان خصوصی جناب رفیق داد صاحب، دوسرے معزز مہمانانِ ذی وقار، عزیز دوستو، بھائیو اور بہنو!

آپ کو میری جانب سے اسلامی طریقہ سے ہدیۂ سلام وتہنیت قبول ہو، یعنی اسلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کی اِس پروقار مجلس میں ہماری گفتگو کا عنوان ہے کہ ’’کیا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے‘‘۔

ہماری اس دنیا میں اکثر بہت سی چیزوں کے بارے میں غلط تصوارت قائم ہو جاتے ہیں اور بے شمار لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان تصورات کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح آج دنیا میں بے شمار لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مذہب اسلام کے بانی ہیں حالانکہ اس تصور یا نظریے کا حقیقت سے کچھ بھی تعلق نہیں کیونکہ اِسلام کا آغاز تو اسی وقت سے ہو گیا تھا جس وقت اِس کرۂ ارض پر اوّلین انسان نے قدم رکھا تھا۔ دنیا میں بے شمار انبیاء مرسلین اللہ

تعالیٰ کی جانب سے معبوث ہوکر آتے رہے اور ان انبیاء اور مرسلین کی وساطت سے اللہ کریم کا پیغامِ ہدایت انسانوں تک بذریعہ وحی پہنچتا رہا۔ دنیا کے تقریباً ہر خطے میں انبیاء معبوث ہوکر آئے اور حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آنے والے پیغمبرانِ خدا کا پیغام زمانی اعتبار سے بھی ایک خاص اور محدود عرصے تک کے لیے تھا۔

ہم سب کتابوں سے پڑھ کر اور علمائے کرام سے سن کر سب ان باتوں سے واقفیت رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام و مرسلینِ عظام کو اللہ کریم نے بے شمار معجزات عطا کیے۔ جیسے عصاء کی ضرب سے سمندر کے پانی کا پھٹ جانا اور موسیٰ علیہ السلام کو راستہ دے دینا، اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مریضوں کو شفایاب اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ جس طرح اِن انبیاء کے زمانے میں لوگوں کی ذہنی وفکری سطح تھی اسی طرح کے ان کی طرف مبعوث پیغمبر خدا کو معجزات دیئے جاتے رہے، اور ان معجزات کی نوعیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ اس خاص دور اور خاص پس منظر میں تو دلیل بن سکتے تھے لیکن آج کسی طرح بھی یہ بات ممکن نہیں ہوسکتی کہ ان معجزات کا تحلیل و تجزیہ کرکے ان کو ثابت کیا جاسکے۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاتم الانبیاء والمرسلین کی حیثیت سے معبوث ہوئے۔ ان کی بعثت تک زمانہ نشو وارتقاء کے مراحل و مدارج طے کرتے کرتے یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ اب کسی ایک ہی پیغمبر کی آواز، کسی ایک ہی ہادی کا پیغام ہدایت پوری دنیا میں پہنچ سکتا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ کو ساری انسانیت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور آپ ؐ کی نبوت اب ابدی و دائمی یعنی قیامت تک کے لیے تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (انبیاء۔ 107)

''اے نبیؐ! ہم نے تو آپ ؐ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری پیغمبر اور خاتم الانبیاء والمرسلین تھے اور پھر آپ ؐ پر نازل ہونے والا خداوندی پیغام بھی پوری کائنات کے انسانوں کے لیے تھا جو کہ ہر عہد، ہر زمانے کی ضرویات کے لیے کافی و مکمل پیغام ہدایت تھا۔ اسی بنا پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عقلاً اور منطقاً معجزہ بھی ایسا ہی مرحمت کیا جانا تھا جو ہر عہد کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو اور ابدی و سرمدی طور پر ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔

اِسی بنا پر سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کبھی اپنے معجزات پر زور نہیں دیا جبکہ

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ آپ ؐ کی ذاتِ اقدس سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا۔ آپ ؐ کے اِن معجزات کی تفصیلات سیرت و احادیث کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور نبی کریمؐ کے امتی ہونے کے ناطے اِن سب معجزات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک ہی معجزے کو فخریہ انداز میں بیان کرتے ہیں جو قرآن مجید کی صورت میں اللہ کریم نے اپنے حبیبِ کریمؐ کو مرحمت فرمایا۔ قرآن مجید ایک ابدی، دائمی، سرمدی اور مستقل معجزہ ہے۔ چودہ صدیاں بیت گئیں مگر قرآن حکیم کے اعجاز کی سرسبزی و شادابی اور حسن و رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہم آج بھی اس معجزے کو جانچ اور پرکھ سکتے ہیں اس لیے کہ یہ معجزۂ ربانی آج بھی پوری طرح محفوظ اور موجود ہے۔

دنیا کے سبھی انسان خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان سب کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے متن کو ساتویں صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ سرزمینِ حجاز میں محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے نطقِ مقدس کی وساطت سے بیان فرمایا تھا۔

قرآن حکیم کس سرچشمہ اور منبع سے اخذ کیا گیا ہے؟ اِس ضمن میں بالعموم تین طرح کے تصورات و نظریات لوگوں سے میں دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں سے پہلا تصور تو یہ ملتا ہے کہ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اسے تحریر کتاب کی مصنف ہے اور قرآن حکیم شعوری یا لاشعوری طور پر بہرحال آپ ؐ کی اپنی ہی تحریر کردہ تصنیف ہے۔ دوسرا مفروضہ اِس ضمن میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جناب محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ مذہبی والہامی متون اور دیگر انسانوں (علمائے عیسائیت و یہودیت) کی معاونت سے تحریر کر دیا ہے۔ تیسرا امکانی نظریہ اِس ضمن میں یہ پایا جاتا ہے کہ قرآن کسی بھی انسان، جن یا فرشتے کی تصنیف نہیں بلکہ اس کا نزول وحی کی شکل میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی جانب سے ہوا ہے۔

آج کی اِس علمی مجلسِ مباحثہ میں ہم ان تینوں نظریات اور مفروضات کا دلیل و برہان اور عقل و منطق کی روشنی میں تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ اِن میں سے کون سا نظریہ مبنی بر حقیقت ہے۔

سب سے پہلی فرض کی گئی صورت یہ ہے کہ قرآن مجید شعوری، لاشعوری یا تحت الشعوری طور پر جنابِ رسولِ مکرم و معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اور انھوں نے خود ہی اپنی کاوش سے یہ کتاب تحریر کی ہے۔ پہلی بات تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بطورِ خود اہمیت و وقعت کے حامل کسی کام کی تخلیق سے دستبرداری اختیار کرتا ہے اور صاف صاف اعلان کر دیتا ہے کہ اِس کام کی تخلیق

وتشکیل سے میرا کوئی تعلق نہیں تو پھر ایسی صورت میں اس کے دعوے کو جھٹلانا ویسے ہی ایک غیر منطقی صورتحال قرار پاتی ہے لیکن مغربی اربابِ علم اور مستشرقین عموماً قرآن مجید کے متعلق لکھتے یا گفتگو کرتے وقت ایسا ہی طریق کار اپناتے ہیں۔ یہ لوگ تعصب وعناد کے پیشِ نظر قرآن کی اصلیت کے متعلق شکوک وشبہات کی تخم ریزی کر کے یہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآنِ حکیم کے لکھاری ہیں۔

درحقیقت یہ لوگ ایسی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ منسوب کرر ہے ہوتے ہیں جس کا دعویٰ آپؐ نے کبھی نہیں فرمایا بلکہ برعکس طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہی کہتے رہے تھے کہ قرآن اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی وحی ربانی ہے اور اس تاریخی صداقت کے باوجود مستشرقین کی طرف سے اس کے الٹ دعویٰ کرنا ایک نہایت بودی اور غیر منطقی روش ہے اور ان کے اِس دعوے کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ معاذ اللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے متعلق سچ نہیں فرمایا تھا۔ یہ طرزِ عمل سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک شدید افتراء ہے اور مستشرقین کی اپنی خودساختہ کذب بیانی ہے جس کو کسی دلیل وبرہان کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے اور آپؐ کی ولادت باسعادت سے لے کر وصالِ اقدس تک پوری حیاتِ طیبہ کا مکمل اور مستند ریکارڈ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں کبھی کذب بیانی یا دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ نبوت سے پہلے آپؐ حجاز مقدس میں کامل چالیس برس گزار چکے تھے اور پوری مدت میں کفار ومشرکین جیسے کٹر دشمن بھی آپ کو صادق اور امین کہتے اور سمجھتے تھے۔ آپؐ مکہ مکرمہ کے شریف، متقی، باکردار اور پرہیزگار انسان کے طور پر معروف تھے۔ اور دوست دشمن سب آپؐ کی اِن صفات عالیہ کے معترف تھے۔ آپؐ کی دیانت وامانت پر لوگوں کا اس قدر اعتماد اور یقین تھا کہ آپؐ کی نبوت کی تکذیب کرنے کے باوجود کافر اور مشرکین اپنی قیمتی چیزیں بطور امانت آپؐ کے پاس ہی رکھوایا کرتے تھے اور اعلانِ نبوت کے بعد بھی آنحضرتؐ کی راست گفتاری، دیانت داری اور صداقت پر انھیں برابر یقین واعتماد تھا۔

جب صورتِ حال ایسی ہو تو اُن سے یہ بات منسوب کرنا کیسی بودی حرکت اور غیر عقلی رویہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو پیغمبر بنا کر پیش کیا جبکہ وہ درحقیقت پیغمبر نہیں تھے۔ بھلا آپؐ جیسا

راست گو اور ایمان دار شخص کوئی جھوٹا دعویٰ کر سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ پیغمبر ہے، اس پر کلامِ حق کا نزول بصورتِ وحی ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ کیا کسی شریف انسان کی عقل باور کر سکتی ہے کہ آپؐ نے ایسا کیا ہوگا۔

بعض مستشرقین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ نے ایسا دعویٰ مادی منفعت اور مال و دولت کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ یعنی نبوت کے دعوے کا اصل مقصد جلبِ زر اور دُنیاوی مفادات کا حصول تھا۔ مجھے تسلیم ہے دنیا میں ایسے لوگ بھی یقیناً ہوتے رہے ہیں اور ہیں جو دولت و ثروت یا دیگر دنیاوی مفادات کے حصول کے پیشِ نظر نبوت یا ولایت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور یوں لوگوں کو اپنے تقدس اور بزرگی کا چکمہ دے کر ان سے مال و زر اینٹھتے ہیں اور یوں پُرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔ اس نوع کی مثالیں آپ کو دنیا کے ہر خطے میں مل جائیں گی اور خود ہمارے وطن ہندوستان میں بھی ایسے لوگوں کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

جبکہ اِس کے برعکس جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ نبوت و بعثت کے اعلان سے پہلے تو آپ ﷺ کسی قدر فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے کیونکہ آپؐ کی شادی مکہ مکرمہ کی ایک رئیس اور مالدار خاتون سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے ہوگئی تھی۔ نکاح کے وقت آپؐ کی عمر مبارک محض 25 سال کی تھی یعنی بعثتِ رسالت اور اعلان نبوت سے کم و بیش پندرہ برس پیشتر آپؐ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعثتِ مبارکہ کے بعد بھی آپؐ کی معاشی صورتحال کبھی غیر معمولی اور قابلِ رشک نہیں رہی۔ امام النووی نے اپنی کتابِ احادیث ''ریاض الصالحین'' کی حدیث نمبر 492 کے تحت بیان کیا ہے کہ:

> ''حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو مہینوں تک مسلسل ہمارے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔''

گویا دو دو مہینے کے طویل عرصے تک خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور آپؐ کے دیگر اراکینِ خانہ کو بھی گھر کا پکا ہوا کھانا تناول کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اکثر اوقات آپؐ محض پانی اور کھجوروں سے گزر اوقات کر لیتے تھے۔ کئی دفعہ اہلِ مدینہ بکریوں کا دودھ آپؐ کی خدمت میں بھجوا دیا کرتے تھے اور آپؐ وہی نوش کر لیا کرتے تھے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ کسی خاص محدود یا عارضی وقفے میں ایسی صورتحال آپؐ کو پیش آئی ہو بلکہ آپؐ نے طرزِ حیات ہی ایسا اپنا

رکھا تھا۔ ''ریاض الصالحین'' میں ایک اور مقام پر روایت ہے:

''حضرت بلال رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب کبھی سرکار رسالت مآبؐ کو تحفے (ہدیے) موصول ہوتے تو آپؐ بلا توقف انھیں حاجت مندوں اور غرباء ومساکین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے، اور ان میں سے کچھ بھی اپنے لیے بچانے کے روادار نہیں تھے۔''

اب جب پیغمبرؐ کی طرزِ معاشرت اور گھریلو زندگی میں ایثار، سادگی اور سخاوت کا یہ حال ہو تو ان کے بارے میں اس طرح کی بات کہنا ایک متعصبانہ جسارت اور نازیبا روش ہے کہ انھوں نے مادی فوائد کے حصول کے لیے جھوٹ بول دیا ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ٥

(البقرۃ:۷۹)

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت ہے۔''

یہ آیت مبارکہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھ کر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی لکھی ہوئی یہ عبارت وحی خداوندی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی من مانی کے لیے وحی الٰہی میں کسی نہ کسی طرح سے تحریف یا تبدیلی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دیکھیے اور سوچیے کہ اگر ذرا بھر بھی اِس بات کا امکان ہوتا کہ قرآن مجید نبی کریمؐ کی تصنیف کردہ کتاب ہے یا اس میں جناب رسالت مآبؐ نے اپنی مرضی سے تبدیلی و تحریف کی ہے تو اِس صورت میں کیا یہ آیتِ مبارکہ قرآن مجید میں موجود پائی جاتی؟ قطعاً ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ اِس طرح تو حضرت محمدؐ خود اپنے آپ کی برائی بیان کرنے والے ہوتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ جاہ وحشمت اور شان وشوکت، اقتدار کے لیے کیا تھا لیکن آپ خود فیصلہ کریں اور بتائیں کہ جن لوگوں کو جاہ وحشمت یا اقتدار وتسلط یا دولت وثروت کی خواہش ہوتی ہے ان کا طرز حیات بھلا کس طرح کا ہوتا ہے؟ ایسے انسان بلند وبالا اور پرشوکت محلات میں رہتے ہیں، قیمتی پوشاکیں پہنتے ہیں، وہ نوکروں اور خادموں کے حصار میں ہٹو بچو کے شور میں آتے جاتے ہیں۔ جبکہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ زیست بھی ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ اپنی بکریوں کا دودھ خود ہی نکال لیا کرتے تھے، اپنے لباس کو خود ہی ٹانکا لگالیا کرتے تھے، اپنے پاپوش کو خود ہی سی لیا کرتے تھے حتیٰ کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے نہایت چھوٹے چھوٹے کام بھی اپنے مبارک ہاتھوں سے کیا کرتے تھے۔ آپؐ کا انداز معاشرت اور اسلوب زیست سادگی، عجز اور انکسار کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر زمین پر ہی نشست فرما ہوتے تھے۔ آپؐ کا کوئی محافظ دستہ نہیں تھا۔ گھریلو سودا سلف خریدنے کے لیے تن تنہا بازار تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی نہایت کمزور اور مفلس آدمی بھی آپؐ کی دعوت کرتا تو آپؐ اس کی دعوت کو ضرور قبول فرمالیتے تھے اور جو کچھ بھی وہ اپنی حیثیت کے مطابق دعوت میں پیش کرتا آپؐ خوشی خوشی اسے تناول فرمالیتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے طرزِ حیات اور پاکیزہ اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(التوبة:٦١)

’’ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی ﷺ کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو، وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے۔ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایماندار ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسولؐ کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔‘‘

چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشرکین کی طرف سے عتبہ نامی ایک عرب سردار قریش کا ترجمان اور نمائندہ بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور آپؐ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ: ''اگر آپؐ نے مال و دولت اکٹھا کرنے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو ہم آپؐ کے قدموں میں مال وزر کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور اگر حکمرانی کی خواہش ہے تو ہم متفقہ طور پر آپؐ کو تمام خطۂ عرب کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں لیکن تم توحید کی دعوت سے کنارہ کشی اختیار کرو۔'' آپؐ نے اُس کی باتیں اطمینان سے سنیں اور بڑی بے نیازی کی شان سے ان سب پیش کشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ آپؐ جانتے ہیں کہ قریشِ مکہ کے بار بار کہنے پر ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب نے بھی آپؐ کو دعوتِ حق کے ابلاغ سے باز رہنے کے لیے کہا تھا لیکن آپؐ نے بڑے رقت آمیز انداز میں نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں جواب دیتے ہوئے انھیں کہا تھا کہ:

> ''اے میرے عم محترم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں پھر بھی میں ابلاغ رسالت کے فریضے سے باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ میری موت واقع ہو جائے۔''

اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے انسان کو اس قدر تکلیف اور قربانی والی زندگی گزارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپؐ چاہتے تو اپنی خواہش اور مرضی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ذات میں اس قدر شرافت اور عجز وانکساری کی صفات موجود تھیں کہ آپؐ نے اپنی ہر کامیابی کے موقع پر ایسے کلمات ارشاد فرمائیے کہ میری یہ سب کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور ان میں میری ذاتی صلاحیتوں کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح کچھ مستشرقین نے ایک نیا شوشہ چھوڑ رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) کسی دماغی مرض کا شکار تھے، اس عارضے کو وہ Mythomania کا نام دیتے ہیں۔ اور جو انسان اِس عارضے میں مبتلا ہوتا ہے وہ شخص کذب بیانی اور جھوٹ بولنے سے کام لیتا ہےجب کہ اسے خود اپنے جھوٹ پر مکمل یقین ہوتا ہے۔ اس طرح اِن مستشرقین کے مطابق پیغمبرِ اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کارِ رسالت اور ابلاغِ دین کے لیے جھوٹ بولتے تھے لیکن آپؐ کو اِس جھوٹ پر پورا یقین ہوتا تھا۔

Mythomania کے مرض میں مبتلا شخص کا اگر کوئی ماہر نفسیات علاج کرنا چاہے تو وہ

کیا کرے گا۔ اس صورت میں وہ صرف یہ کرے گا کہ مریض کو حقائق کا مقابلہ کرنے پر مجبور کردے۔ مثلاً کوئی شخص شاہِ انگلستان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس بات پر مُصِر ہے کہ وہ انگلینڈ کا بادشاہ ہے تو معالج اسے اس کی دیوانگی یا پاگل پن کا طعنہ نہیں دے گا بلکہ وہ اس سے دریافت کرے گا کہ اچھا مان لیا کہ تم انگلینڈ کے بادشاہ ہو مگر یہ بتاؤ کہ آپ کی ملکہ محترمہ کہاں ہیں؟ آپ کے وزیر، مشیر اور درباری کدھر ہیں؟ آپ کے باڈی گارڈ اور دربان کدھر ہیں۔ ماہر نفسیات ایک ایک کر کے جب حقائق کو اس کے پیش نظر لائے گا تو آخر Mythomania کے مریض اِس بادشاہ کو خود ہی کہنا پڑے گا کہ میرا خیال ہے کہ میں انگلینڈ کا بادشاہ نہیں ہوں۔"

قرآن مجید فرقان حکیم بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، یہ کتاب مبین لوگوں کے سامنے حقائق رکھ دیتی ہے پھر ان سے ان حقائق کے بابت سوال کرتی ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) نفسیاتی عارضے Mythomania میں مبتلا نہیں تھے اور ہرگز نہیں تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ؐ کی رسالت و نبوت کے منکرین ہی اِس مرض میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک سچے رسولِ خدا کی دعوتِ حق کا انکار کررہے ہیں اور اپنے اِس غلط روّیے کا انھیں پختہ یقین بھی ہے کہ یہ درست ہے۔ قرآن حکیم ایسے منکرین اور متشککین لوگوں کے سامنے سوالات رکھتا ہے کہ اگر تم کسی شک شبے میں گرفتار ہو، اگر تمھیں ان کی صداقت اور راست گوئی کا یقین نہیں تو پھر ایسا کرو اور ویسا کرو۔ یا اگر قرآن حکیم منزل من اللہ نہ ہوتا تو پھر یوں صورتحال ہوتی۔ قرآن اِن منکرین و متشککین سے بے شمار لوع بہ لوع سوالات کرتا۔ جن کے متعلق ہم انشاء اللہ آئندہ آگے چل کر بات کریں گے۔ اور کسی نتیجہ خیز مرحلے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن حکیم درحقیقت مذہبی واہموں پر مشتمل ہے یا پھر بعض لاشعوری خیالات کا مرقع ہے۔ ان لوگوں کے مطابق معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیر شعوری انداز و اسلوب میں اپنے ذہنی وفکری خیالات کو قرآن کی شکل دے کر لوگوں کے سامنے پیش کردیتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں کے مطابق تو معاذ اللہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دماغی توازن ہی درست نہیں تھا۔

دراصل یہ معترضین اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں اور وہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ہی بار نازل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا نزول 23 برس کے طویل عرصے میں نجماً نجماً ہوتا رہا، ہاں اگر پیغمبر اسلامؐ نے یکبارگی پورا قرآن معترضین کے سامنے پیش کیا ہوتا تو انھیں اعتراض کا موقع مل سکتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ قرآن کا نزول 23 سالوں کے

عرصے میں بتدریج ہوا تھا۔ منکرین و معترضین کے اعتراضات کے مطابق اگر یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہوتا تو اِس صورت میں اس کلام میں روانی اور یکسانیت قطعاً مفقود ہوتے۔ اگر معترضین کے دعووں کے مطابق قرآن مجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لاشعوری یا تحت الشعوری خیالات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاذ اللہ غیر متوازن دماغ کا نتیجہ فکر ہوتا تو ضروری تھا کہ اِس کتاب میں جگہ جگہ تضاد ہوتا اور دوسرے یہ کہ 23 سال کے طویل عرصے تک ایک بات کا دعویٰ کرنا اور پھر اس پر بلا انقطاع مسلسل قائم رہنا ممکن ہی نہیں تھا اگر یہ آپ ؐ کا دعویٰ محض لاشعوری خیالات کا ثمرہ اور حاصل ہوتا۔ بلکہ قرآن حکیم سے ہی اِس دعوے کی کافی وشافی تردید ہوجاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید نے کئی ایک تاریخی واقعات وحوادث کا حوالہ دیا ہے جو اس کے نزول کے وقت لوگوں کے علم میں قطعاً نہیں تھے لیکن قرآن حکیم کی پیش گوئی کے مطابق بعد میں وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ قرآن مجید نے اپنی آیات کریمات میں کئی ایک پیش گوئیاں بھی کی تھیں اور وہ تمام کی تمام پیش گوئیاں پوری ہوئیں اور سچ ثابت ہوئیں۔ بعینہٖ بہت سے سائنسی حقائق کا ذکر بھی قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور وہ حقائق اور انکشافات اس کے نزول کے وقت کے لوگوں کے علم میں نہیں تھے جبکہ عصر حاضر میں ان کی سائنسی بنیادوں پر تصدیق ہوچکی ہے۔ اور پھر عقلی سطح پر تو یہ ممکن ہی نہیں کہ لاشعوری خیالات کے بل پر اس نوع کی سچی اور حقیقی پیش گوئیاں کی جاسکیں۔

جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کردی ہے کہ:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ (الاعراف: 184)

”اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنوں کا کوئی اثر نہیں ہے، وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (برا انجام سامنے آجانے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کررہا ہے۔“

پھر سورۃ القلم میں ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ٥ (القلم: 2)

”تم ؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ٥ (التکویر: 22)

''اور اے اہل مکہ تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے۔''

تو حاضرین کرام! وقت کی کمی کے پیش نظر اِس خطابی دورانیےمیں تمام نظریات کا آپ کے سامنے لانا ممکن نہیں ہے، وقفۂ سوالات میں البتہ آپ سوالات کر سکتے ہیں اور اس وقت میں آپ کے سوالات کے جوابات دینے کی پوری کوشش کروں گا۔

اسی طرح ایک مفروضہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید دوسری الہامی کتب کی معاونت سے یا دیگر انسانی ذرائع سے مدد لے کر لکھا ہے۔ معاذ اللہ کیسے کیسے افتراء پیغمبر علیہ السلام کی ذات پر گھڑے جاتے ہیں۔ اس نظریے کے بطلان کے لیے تو ایک تاریخی حقیقت پیش کر دینا ہی کافی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے اور پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ٥ (العنکبوت: 48)

''اے نبیؐ! آپؐ اِس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

یہ بات خدائے قدوس وعلیم کے علم میں تھی کہ لوگ قرآن مجید کے بارے میں شک میں پڑیں گے اور اِسی بنا پر رب علیم وحکیم نے اپنی مشیت بالغہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آخری رسول جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمی کی حیثیت سے معبوث فرمایا یعنی آپؐ دنیا کی رسمی تعلیم سے نا آشنا تھے۔ اگر آپؐ اُمی کی بجائے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ انسان ہونے کی حیثیت سے معبوث ہوتے تو باطل پرست اور غیر سنجیدہ لوگ ایسی باتیں ضرور تراشتے اور انھیں ایسی ریشہ دوانیوں کا موقع ضرور مہیا ہو جاتا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیتوں سے متصف ہوتے تو منفی ذہنیت کے حاملین ضروری ایسے دعوے کرنے کی کوشش کرتے کہ معاذ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسانی ذریعے سے یہ معلومات حاصل کر کے قرآن کی صورت میں دنیا والوں کے سامنے پیش کر دی ہیں مگر اللہ کریم کی مہربانی سے ان معترضین کے ہاں ایسے الزامات کی کوئی صورت بنتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ ان کے اِس مزعومے کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ

ہے:

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ (السجدة: ۱تا۳)

''الف۔لام۔میم۔اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ پروردگار عالمین کی طرف سے ہے، کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے، نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

معزز سامعین! ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب بیان دیگر الہامی صحائف کے اسلوب سے کلیتاً مختلف ہے۔ دیگر مذہبی کتابیں عموماً داستانوی اسلوب لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ کسی انسان کی تصنیف کردہ داستان کا آغاز کیسے ہوتا ہے۔ یہ بالعموم اس طرح شروع ہوتی ہے:

''ایک مرتبہ کا ذکر ہے... ''

اسی طرح ہم اگر دوسرے الہامی و مذہبی متونِ مقدسہ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی ابتداء بھی کچھ اسی انداز پر ہوتی ہے۔ یعنی:

''سب سے پہلے خدا کی ذات تھی، اس نے زمین و آسمان کی تخلیق کی......''

یا پھر یوں کہ

''سب سے پہلے لفظ تھا......''

جبکہ قرآن حکیم کا اسلوب انسانی اسلوب و انداز سے قطعاً مختلف ہے اسی طرح ہم اگر دوسرے مذہبی صحیفوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ایک خاص تصنیفی و تالیفی ترتیب سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں اگر کسی شخص کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اس کے خانوادے، اہل خانہ اور دیگر متعلقین کا ذکر بھی ہوگا۔ اس کی اولاد کا تذکرہ ہوگا اور اِسی طرح ترتیب وار واقعات کا بیان ہوتا چلا جائے گا۔ سب سے پہلے پہلا باب پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا گویا اس طرح آخر تک ترتیب چلی جائے گی۔

قرآن مجید بھی لوگوں کے متعلق، ان کے خاندان کے متعلق بات کرتا ہے لیکن قرآن کا اسلوبِ بیان انسانی اندازِ نگارش سے کلیتاً مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز بیان کسی انسان کی تحریر کردہ کہانیوں کی کتاب سے بالکل الگ اور جدا ہوتا ہے۔ قرآن کا اسلوبِ بیان نہایت ارفع و اعلیٰ اور انفرادیت کا حامل ہے۔ قرآن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد اور جداگانہ کتاب ہے۔

قرآن حکیم کے منکرین اور مخالفین جب قرآن کو انسانی تحریر ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ایک نئے دعوے کے ساتھ منظرِ عام پر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دھوکا ہے۔ ان کو اپنی بات کے ثبوت کے لیے کوئی ایک معمولی سی دلیل بھی نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنی بات پر مُصر رہتے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکے میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی اِس حالات کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے فرض کریں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ فلاں شخص میرا مخالف اور دشمن ہے۔ اگرچہ میرے پاس اس ضمن میں کوئی ثبوت یا شہادت بھی نہیں ہے لیکن اِس کے باوجود مجھے اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ جب وہ شخص میرے سامنے آتا ہے تو میں اس سے دشمنوں جیسا سلوک کرتا ہوں۔ جس سے فطری سی بات ہے کہ اس کا جوابی روّیہ بھی میرے ساتھ خراب ہو جاتا ہے اور وہ میرے ساتھ دشمنوں جیسا برتاؤ کرنے لگتا ہے اب اس صورتحال کے پیشِ نظر میں کہتا ہوں:

"دیکھو! میں تو پہلے ہی یہی گمان رکھتا تھا کہ یہ شخص میرا مخالف اور دشمن ہے اس لیے کہ اس کا روّیہ اور برتاؤ میرے ساتھ دشمنوں جیسا ہے۔"

اسی مثال کے مصداق بعض لوگ ایک غلط بات کو تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر نادانوں اور کم عقلوں کی طرح اس پر بضد ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کا دعویٰ کیا ہے کہ وحی انسانی عقل کے مطابق ہے لیکن بعض لوگوں کو اِس بات پر اصرار ہے کہ مقدس متون انسان عقل سے ماورا ہیں۔ اگر ان کے کہنے کے مطابق یہ مقدس متون واقعتاً انسانی عقل اور فہم سے بلند اور ماورا ہیں تو پھر ان کی تفہیم کیسے ممکن ہو گی! یہ کس پیمانے اور معیار سے جانچا جا سکے گا کہ کون سا مذہبی متن واقعی وحی خداوندی ہے اور کون سا متن وحی خداوندی نہیں ہے بلکہ کسی انسان کی تخلیق ہے۔

قرآن مجید انسان کو غور و فکر اور تفکر و تدبر کی دعوت دینے والی کتابِ برحق ہے۔ یہ کتاب مکالمے اور ڈائیلاگ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ بہت سے مسلمانوں کی سوچ یہ ہے کہ ہمیں مذہبی بحث و مباحثے سے احتراز کرنا چاہیے اور جہاں کہیں بھی مذہبی معاملہ درپیش ہو وہاں کسی نوع کے بھی

مباحثے یا مناظرے سے اجتناب برتنا ہی درست طرزِ عمل ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسے لوگوں کا یہ طرزِ عمل اور یہ رویہ سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ قرآن حکیم کی سورۂ نحل میں ارشادِ ربانی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ o

(النحل: 125)

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

اسی بنا پر ہمیں حیرت واستعجاب نہیں کرنا چاہیے کہ عربی لفظ ''قالوا'' کا استعمال قرآن حکیم میں 332 مرتبہ ہوا ہے۔ اِس لفظ کا معنی ہے ''وہ کہتے ہیں''۔ اسی ایک دوسرا لفظ ''قل'' کا استعمال بھی کم بیش 332 مقامات پر ہوا ہے اس لفظ کے معنی ہیں ''کہو''۔ ان دو الفاظ کے کثرتِ استعمال سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن مجید مباحثے اور مکالمے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور ان کو ایک مثبت طرزِ عمل قرار دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور نظریہ ہے جس کو "Exhausting the Alternatives" کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی بھی دعوے کے متبادل تمام کے تمام دعوے ختم کر دینا یعنی متبادل صورتیں رد کر دینا، اس طرزِ عمل سے اصل دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم کا اپنے بارے میں دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اگر تمہیں اس دعوے کا اقرار نہیں ہے تو پھر تم ہی بتاؤ کہ قرآن آخر کیا ہے؟ آپ کوئی سا بھی متبادل دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ کہیں گے کہ قرآن مجید درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ لیکن قرآن ان لوگوں کے اِس دعوے کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مادی مفادات کے حصول کے لیے قرآن پیش کیا تھا جبکہ ان کا یہ دعویٰ بھی دلائل سے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نوع بہ نوع اعتراضات کی متبادل شکلیں پیش ہوتی ہیں اور ان کی دلائل سے تردید بھی

ہوتی چلی جاتی ہے اوران تمام متبادل دعووں کی تردید کے بعد اس سوال کا محض ایک ہی جواب باقی بچتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کلام پاک ہے کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو بصورت دیگر پھر یہ کیا ہے؟

چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد ہوتا ہے:

حٰمٓ o تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ o

(الجاثية: 1-2)

''ح۔م۔اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

قرآن مجید کے بہت سے مقامات پر اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآن مجید اللہ کریم کا کلام ہے۔متعدد مقامات پر قرآن مجید میں اس بات کو دھرایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ

(الانعام: 19)

''اور یہ قرآن میری طرف وحی کے ذریعے بھیجا گیا ہے، تا کہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو خبردار کردوں۔''

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (یوسف: 102)

''اے پیغمبرؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کررہے ہیں۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

طٰهٰ o مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى o اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى o (طٰهٰ: ۱-۳)

''طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے ہراس شخص کے لیے جو ڈرے۔''

پھر فرمایا:

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝

(النمل: 6)

"بلاشبہ تم یہ قرآن ایک علیم وحکیم ہستی کی جانب سے پا رہے ہو۔"

سورۃ السجدہ میں اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں:

الٓمٓ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ (السجدۃ: 1تا3)

"ا۔ل۔م۔اس کتاب کا نزول بلاشبہ پروردگارِ عالمین کی طرف سے ہے۔کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا۔شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔"

سورۃ یٰسین میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے:

يٰسٓ ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝

(یٰسین: 1تا5)

"یٰسین، قسم ہے قرآن حکیم کی کہ آپؐ یقیناً مرسلین میں سے ہیں آپؐ سیدھے راستے پر ہیں۔(اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے:

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (الزمر: 1)

"اس کتاب کا نزول اللہ زبردست ودانا کی طرف سے ہے۔"

سورۃ جاثیہ میں اسی سے ملتی جلتی آیتِ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (الجاثیہ: 2)

''اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے جو زبردست اور دانا ہے۔''

سورۃ الرحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o (الرحمٰن: 1۔2)

''نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ o فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ o لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ o تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ o

(الواقعۃ: 77تا80)

''یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔''

اِسی طرح سورۃ الدھر میں ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا o (الدھر: 23)

''(اے پیغمبرؐ!) ہم نے ہی یہ قرآن آپؐ پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔''

اسی طرح قرآن کے اور بھی بہت سے مقامات پر ارشاد ہوا ہے کہ قرآن حکیم دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے اور اگر تمہارے دعوے کے مطابق ایسا نہیں تو پھر تم ہی بتاؤ کہ قرآن کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اگر سائنسی نقطۂ نگاہ سے اس بات کو لیا جائے تو سائنسی دنیا اپنا ایک طریق کار رکھتی ہے۔ کسی نئے نظریے کے بارے میں ان کا رویہ اور طرز عمل اس طرح کا ہوگا کہ اگر اس کا کوئی تردیدی امتحان نہیں ہوسکتا تو وہ ایسے کسی نظریے پر قطعاً متوجہ نہیں ہوں گے۔ میں تفصیلات میں نہیں جا سکتا کیونکہ وقت کی کمی مانع ہے۔ مختصر طور پر آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ نظریہ تردیدیت "Falsification Theory" کہلاتا ہے۔ سائنسدان اس نقطہ نظر کے حامل ہوتے ہیں کہ اگر آپ اپنے پیش کردہ کسی نئے نظریے کا تردیدی ٹیسٹ نہیں کر سکتے تو پھر اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اسی بات کے پیش نظر جب بیسویں صدی میں معروف سائنسدان آئن سٹائن نے ایک نیا

نظریہ پیش کیا تھا تو ساتھ ہی اس نے تین تردیدی ٹیسٹ بھی پیش کر دیئے تھے کہ اگر اس کا پیش کردہ نظریہ درست نہیں ہے تو ان تین طریقوں سے اس نظریے کی غلطی ثابت کر دی جائے گویا اس کے پیش کردہ مذکورہ تینوں تردیدی ٹیسٹ ایسے تھے جن سے اس کے پیش کردہ نظریے کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔ اور اس عہد کے سائنس دانوں نے مسلسل چھ برس تک اس کے پیش کردہ نظریات کے ہر پہلو پر غور و فکر کرنے کے بعد تسلیم کر لیا کہ البرٹ آئن سٹائن کا پیش کردہ نظریہ درست ہے۔ اس بات سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ البرٹ آئن سٹائن کی شخصیت کوئی بے مثال اور عظیم شخصیت رہی ہو گی البتہ یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا پیش کردہ نظریہ قابل توجہ اور لائق اعتناء ہے۔

قرآن مجید کی صداقت کو جانچنے کے معاملے میں ایسے بے شمار تردیدی ٹیسٹ پائے جاتے ہیں۔ آپ جب کبھی بھی کسی سے آئندہ مذہب کے متعلق گفتگو کریں تو اپنے مخاطب سے ایک سوال ضروری پوچھیں اور وہ یہ کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسا امتحان یا ٹیسٹ ہے جس کی مدد سے اس کے مذہب کو باطل ثابت کیا جا سکتا ہو۔

آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میں نے بے شمار لوگوں سے یہی سوال کیا ہے اور آج تک کسی ایک فرد نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ ہاں اس کے پاس اس کے اپنے مذہب کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹیسٹ موجود ہے۔ جبکہ قرآن مجید کا معاملہ نرالا ہے۔ قرآن مجید اس نوع کے بے شمار پیمانے اور ایسے تردیدی امتحان پیش کرتا ہے کہ جن کی بنیاد پر اس کی صداقت یا عدم صداقت کی جانچ ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید کے پیش کردہ کچھ ٹیسٹ اور امتحان تو محض ماضی کے لیے کارآمد تھے اور ان کو ماضی میں ہی برتا جا سکتا تھا لیکن اس کے بہت سے ٹیسٹ اور امتحان ہر عہد اور ہر زمانے میں کام دے سکتے ہیں۔

آیئے میں آپ کے سامنے چند مثالیں رکھتا ہوں۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا کا نام ابولہب تھا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید ترین مخالف اور کٹر دشمن تھا۔ وہ اپنی عادتِ بد کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کیا کرتا جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے آدمی، کسی اجنبی کو حق کی دعوت دے رہے ہوتے تو ابولہب آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد اس شخص سے جا کر ملتا اور پوچھتا کہ محمد بن عبداللہ نے تم سے کس نوع کی باتیں کی ہیں۔ اور پھر اپنی طرف سے ان کے الٹ باتیں کرتا۔ اگر رسول کریم ﷺ نے کہا ہوتا کہ روشنی ہے تو یہ کہتا نہیں تاریکی ہے، آپؐ کے دن کو یہ رات ہی بتاتا

گویا ہر بات میں آپ ؐ کی مخالفت اس کا وطیرہ تھا۔

آپ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں سورہ لہب کے نام سے ایک پوری سورہ پائی جاتی ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں یہ بتا دیا گیا کہ ابولہب کو اپنی بیوی سمیت اپنے بُرے اعمال کے سبب جہنم کی دھکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس کے بارے میں یہ پیشین گوئی کر دی گئی کہ یہ کبھی بھی ایمان لا کر مسلمان نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کافر ہی رہے گا۔ اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ یہ سورہ ابولہب کی موت سے تقریباً دس سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس سورہ کے نزول کے بعد ایک طویل عرصے تک ابولہب زندہ رہا۔ اس عرصے میں بہت سے لوگ اس کے دوستوں میں سے ایمان قبول کر کے مسلمان ہو گئے جب کہ وہ لوگ بھی ابولہب ہی کی طرح آنحضورؐ کے کٹر مخالف اور دشمن تھے۔

ابولہب کو آپ ؐ کی ذات سے چونکہ سخت عداوت تھی وہ آپ ؐ کی ہر بات کی مخالفت کرتا تھا اور ہر بات کو غلط ثابت کرنے کی تگ و دو کیا کرتا تھا۔ بس اسے اتنا ہی کرنا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیتا، اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیتا، اسے اسلام کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی بھی ضرورت نہیں تھی یعنی مسلمانوں جیسے کام اختیار کرنا اس کے لیے ضروری نہ تھا۔ صرف قبولِ اسلام کا اعلان و اظہار کر کے ہی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ غلط قرار دے سکتا تھا۔ وہ اِس بات کا دعویٰ کرتا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور یوں وہ قرآن کے دعوے کی تغلیط کر سکتا تھا۔ یہ کام ابولہب کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا وہ پہلے بھی جھوٹ اور دروغ گوئی سے کام لیتا تھا۔ اب ایک مزید جھوٹ ہی تو اس نے بولنا تھا۔ یہ گویا کہ ایک ایسا ہی عمل تھا جیسے خود نبی کریم اسے اِس بات کی دعوت دے رہے ہوں کہ تم میرے مخالف ہو، مجھے جھوٹا اور غلط ثابت کرنا تمہاری خواہش ہے تو پھر آؤ اِسلام کی قبولیت کا اعلان کرو اور اِس سے میرا دعویٰ غلط ثابت ہو جائے گا۔ میں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ کام انتہائی آسان تھا لیکن ابولہب اِس کام کو نہیں کر پایا۔ یہاں یہ بات بھی باوثوق انداز میں کہی جا سکتی ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی کتاب میں اِس نوع کا کوئی دعویٰ کرنے کی یا ایسا بیان دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ تو اس سے یہی بات ثابت ہو رہی ہے کہ قرآن مجید یقیناً خداوند اقدس کا کلام ہے۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں ایک اور مثال ہم دیکھتے ہیں یہاں اللہ کریم کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

(البقرۃ: 94-95)

''ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے لیے ہی مخصوص ہے تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اِس خیال میں سچے ہو، یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے اس لیے کہ اپنے ہاتھ سے انھوں نے جو کچھ کما کر وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضاء یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں)، اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔''

ایک مرتبہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان گفتگو ہورہی تھی۔ اِس گفتگو میں یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آخرت کا گھر یعنی جنت تو صرف یہود کے لیے ہی ہے۔ کسی اور کے لیے ہرگز نہیں۔ ان کے اِس دعوے کے بعد یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور اِس میں ان سے کہا گیا کہ اگر واقعی جنت صرف اور صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے اور صرف وہی جنت میں جائیں گے تو پھر انھیں چاہیے کہ وہ موت کی آرزو کریں اور مرنے کے لیے جلدی کریں تا کہ اپنی مزعومہ جنت میں جلد پہنچ سکیں اب اِس مقام پر فقط یہی کرنا تھا کہ کوئی بھی ایک یہودی سامنے آتا اور وہ علی الاعلان کہتا کہ ہاں میں مرنے کے لیے بیتاب ہوں محض دعویٰ ہی تو درکار تھا۔ واقعی کوئی مرتو نہیں جاتا تھا۔ محض زبان سے اقرار کرنا تھا کہ میں موت کی خواہش رکھتا ہوں اور اس طرح وہ قرآن حکیم کے اس بیان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرسکتے تھے۔ لیکن ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کوئی یہودی آگے نہ بڑھا، کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہاں میں موت کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ یہ ایک طرح سے ایک بیّن تردیدی ٹیسٹ (Falsification Test) تھا جو دنیا کے سامنے قرآن حکیم نے پیش کیا۔

اس پر آپ کے ذہن میں ایک اعتراض کی بات آسکتی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام امور ماضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ امتحان تو ماضی میں ہی لیا جاسکتا تھا۔ تو کیا موجودہ دور اور زمانہ حال کے لیے بھی کوئی ایسا ٹیسٹ پایا جاتا ہے جس کی مدد سے قرآنِ حکیم کو معاذ اللہ غلط قرار دیا جاسکے۔

تو اِس پر میں آپ سے کہوں گا کہ ہاں بالیقین ایسے تردیدی ٹیسٹ بھی ہیں جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہیں جن کو ہر زمانے، ہر عہد میں آزمایا جا سکتا ہے، جو آج سے چودہ صدیوں قبل کے لیے بھی تھے اور آج بھی اسی طرح کار آمد ہیں بلکہ آئندہ زمانوں میں بھی قابلِ عمل رہیں گے۔

دنیا میں بہت سے لوگ اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ رب العالمین کا کلام نہیں ہے۔ قرآن حکیم ایسے لوگوں کو چیلنج کرتا ہے کہ:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (بنی اسرائیل: 88)

''کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔''

قرآن مجید کی اس آیتِ مبارکہ میں ایک چیلنج کیا گیا ہے کہ پوری نوعِ انسانی اور سارے کے سارے جنات مل کر قرآن مجید کے مثل ایک کتاب بنانا چاہیں تو وہ اِس سلسلے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے خواہ وہ سب انسان اور سارے کے سارے جنات مل کر ہی یہ کوشش کر دیکھیں۔ مسلمان اور غیر مسلم گویا جمیع انسانیت اِس بات پر متفق ہے کہ قرآن مجید پوری کائنات میں عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین، نادر اور منفرد نمونہ ہے۔ قرآن میں استعمال ہونے والی عربی زبان اِس قدر قابلِ فہم، واضح وبیّن، معجزاتی اور ناقابلِ تقلید و پیروی ہے کہ پوری کائنات میں ڈھونڈنے سے بھی اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ ان نادرۂ روزگار خصوصیاتِ قرآنی کے باوصف قرآن مجید کا ہر بیان حق، صداقت، سچائی اور راستی کے مطابق ہوتا ہے۔

زبان و بیان کا یہ بلند ترین اسلوب و انداز ہے جو اس کلام برحق کو وحی خداوندی کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ قرآن مجید کی ہر آیتِ مبارکہ ایک ہی وقت میں ایک جاہل، ان پڑھ اور بدو شخص پر بھی ویسا ہی اثر کرتی ہے جیسا کہ ایک عالم فاضل اور تعلیم یافتہ شخص کو کوئی آیت متاثر کرتی ہے۔ جبکہ یہ بات بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن شاعری بھی نہیں۔ نہ ہی قرآن مجید ردیف،

قافیے اور اوزان سے کام لیتا ہے۔ یہ درحقیقت رب کریم کی جانب سے اس کے آخری پیغمبرؐ پر نازل کردہ ایک معجزاتی کتاب ہے۔ اسی چیلنج کو دوسری دفعہ قرآن مجید میں باایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ o فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ o (الطور: 33-34)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔"

اس آیت مبارکہ میں اس Test کو انسان کے لیے اور بھی سہل اور مزید آسان کر دیا گیا ہے بلکہ سورۃ الھود میں تو اللہ کریم کا ارشاد پاک ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o

(ھود: 13)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم (بھی) بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔"

لیکن گذشتہ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی اس خدائی چیلنج کا جواب نہ دے پایا۔ اور قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

اس امتحان اور چیلنج کو سورۂ یونس میں اور بھی آسان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o

(یونس: 38)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے خود اسے تصنیف کر لیا ہے؟ کہو اگر تم اپنے اس

الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اِس جیسی بنا لاؤ اور ایک خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو۔"

اس آسان چیلنج کا بھی کوئی جواب ان منکرینِ حق سے نہیں بن پایا۔ کوئی بھی ان میں سے ایک سورۃ ہی بنا کر نہیں لا سکا۔

پھر اس ٹیسٹ کو مزید آسان کر کے ان کو دعوت دی گئی کہ اس آسان چیلنج کا ہی کوئی جواب فراہم کر سکتے ہو تو کرو۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ o (البقرۃ: 23-24)

"اگر تمھیں اِس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بھی بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ شروع میں تو قرآن نے چیلنج دیا کہ جاؤ اِس جیسی کوئی ایک کتاب بنا کر دکھاؤ، پھر اس آزمائش کو آسان کر کے کہا کہ چلو دس سورتیں ہی اِس کی سورتوں جیسی بنا لاؤ اس کے بعد اس چیلنج کو مزید آسان اور سہل کر کے فرمایا کہ اگر وہ نہیں تم سے ہو سکتا تو پھر قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو، اِس کام میں تم اپنے دوستوں اور ہمنواؤں کو بھی شریک کر لو۔ اور پھر آخر میں کہا کہ اس جیسی نہیں اس کی مانند ہی ایک سورت تو بنا کر دکھاؤ۔ کئی مقامات پر مِثْلِهٖ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں مِنْ مِّثْلِهٖ کا لفظ استعمال کر کے چیلنج دیا کہ اس سے ملتی جلتی ہی کوئی سورہ تو بنا کر دکھاؤ۔ لیکن مشرکین مکہ اس کا بھی کوئی جواب دینے سے قاصر رہے۔

ارباب علم جانتے ہیں کہ عربی زبان و ادب اپنی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے حوالے سے قرآن مجید کے نزول کے دور میں بھی پورے عروج اور شباب پر تھا۔ اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے بہت سے کفار و مشرکین نے سر مارا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی کتب میں ان لوگوں کی بعض مساعی کا حال ملتا ہے جسے پڑھ کر اہل علم آج بھی مسکرا دیتے ہیں کہ کیسی کیسی نادانیاں ان منکرینِ حق سے سرزد ہوتی رہیں تھیں۔

قرآن حکیم نے یہ چیلنج اپنے نزول کے زمانے میں دیا تھا۔ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ آج دنیا میں ایک کروڑ چالیس لاکھ (1,040,0000) قبطی عیسائی پائے جاتے ہیں۔ ان قبطی عیسائیوں کی مادری زبان عربی ہے۔ خدائے کریم کی کتابِ برحق کا یہ چیلنج آج اُن کے سامنے بھی موجود ہے۔

اگر وہ قرآن مجید کے اِس چیلنج کو قبول کر کے قرآن پاک کے اِس دعوے کو (معاذ اللہ) غلط ثابت کرنا چاہیں تو ان کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ قرآن مجید کی کسی ایک سورت جیسی کوئی سورت بنا کر لے آئیں۔ اگر ہم قرآن مجید کے متن پر غور کریں تو قرآن پاک میں بعض سورتیں تو انتہائی چھوٹی ہیں اور چند لائنوں پر مشتمل ہیں جن کے بس چند ہی الفاظ ہیں لیکن اِن سب آسانیوں کے باوجود نہ تو آج تک کسی میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت ہوئی ہے اور نہ ہی اِن شاء اللہ آئندہ کوئی ایسا کر پائے گا۔ اس موقع پر آپ میں سے بعض حضرات کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مادری زبان چونکہ عربی نہیں ہے اور ہم اِس زبان کو جب جانتے ہی نہیں تو پھر ہم یہ امتحان کیوں کر دے سکتے ہیں۔

قرآن اس سلسلے میں عربی زبان نہ جاننے والوں کے لیے بھی ایک کسوٹی مہیا کر دیتا ہے۔ دنیا کا کسی خطے یا علاقے کا شخص بھی خواہ اس کی کوئی سی بھی زبان ہو، اس معیار پر قرآن کو غلط ثابت کرنے کی سعی کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اِس میں کامیاب نہیں ہو پائے گا کہ ایک انسان بھلا کس طرح اپنے خالق کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ سورہ نساء میں اللہ کریم کا ارشاد پاک ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ (النساء: 82)

"کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔"

یہاں قرآن کے چیلنج کی نوعیت ذرا تبدیل ہو کر سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی قرآن مجید کو معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہے تو وہ صرف اتنا کرے کہ قرآن میں کہیں تضاد یا اختلاف بیانی کی کوئی ایک آدھ مثال ڈھونڈ کر دکھائے۔ قرآن مجید کی کوئی غلطی اختلاف یا تضاد بیانی سامنے لائے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ قرآن مجید اللہ پاک کا کلام نہیں ہے اور یہ تو انتہائی سیدھی سی پیشکش ہے جو قرآن کی جانب سے منکرینِ حق کو کی گئی ہے۔ میرے علم میں ہے کہ بہت سے لوگ ایسی کوشش کر بھی چکے ہیں۔ وہ لوگ قرآن میں اپنے زعم کے مطابق اغلاط اور تضادات کی نشان دہی کر چکے ہیں لیکن آپ میری بات کا یقین کریں کہ سو فی صد صورتوں میں ان لوگوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ سیاق و سباق کو توڑ مروڑ کر اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں ترجمہ کرنے میں غلطی کی ہے یا پھر فریب دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ اِس پندرہ سو سالہ تاریخ میں کوئی بھی شخص قرآن مجید میں کسی ایک بھی غلط بیانی یا تضاد کا ثبوت فراہم کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک صاحب عالم دین ہیں اور وہ اسلام کی تاریخ پر بھی کامل عبور رکھتے ہیں لیکن جدید سائنسی علوم سے نابلد ہیں۔ ایسے بہت سارے علمائے دین سے میں اچھی طرح واقف ہوں جو دینی علوم میں بھی یگانہ روزگار ہیں اور سائنسی علوم سے بھی گہری شناسائی رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں میں آپ کے سامنے ایک ایسے عالمِ دین کی مثال پیش کر رہا ہوں جو دینی علوم میں تو یکتا ہے لیکن اسے سائنسی علوم کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں۔ تو اِس صورت میں اگر کسی ایسے ہی عالمِ دین کے روبرو یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ قرآن مجید میں فلاں فلاں مقامات پر سائنسی اسقام پائے جاتے ہیں اور یہ عالم دین اپنی کم علمی اور سائنسی علوم سے عدم واقفیت کی بنا پر جواب نہ دے پائے یا کسی عقدے کی وضاحت نہ کر سکے تو اس سے ہم بھی یہ مطلب اخذ نہیں کریں گے کہ قرآن مجید میں حقیقتاً اغلاط پائی جاتی ہیں اور اس بنا پر ہم معاذ اللہ قرآن مجید کے کلامِ خداوندی ہونے کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن مجید تو حکم دیتا ہے کہ:

فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (الفرقان: 59)

''(اگر تم نہیں جانتے تو) جاننے والے سے پوچھو۔''

اس سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ہم قرآن کے کسی سائنسی بیان کا حقیقی فہم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کسی ایسے شخص سے اس سلسلے میں رجوع کرنا پڑے گا جو سائنس کے علوم میں

ماہرانہ دسترس رکھتا ہوگا۔ اسی صورت میں ہم پر بات واضح ہو سکے گی کہ قرآن کے کلام کا حقیقی مفہوم و مطلب کیا ہے۔

اسی طرح اگر سامعین کرام میں سے کوئی صاحب قرآن مجید میں نعوذ باللہ گرامر کی غلطیوں کے بارے میں انکشاف کرتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اگرچہ عربی زبان میں گہری دسترس اور ماہرانہ بصیرت نہیں رکھتا بلکہ میں تو قرآن مجید کا اور عربی زبان کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اس صورت میں اگر تو میں سوال کا جواب دے پاتا ہوں تو مجھے اللہ کی ذات کا شکر ادا کرنا چاہیے بصورت دیگر اگر میں اپنی کم علمی اور عربی زبان میں دسترس و مہارت نہ رکھنے کی بنا پر جواب نہیں دے سکتا تو اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ حقیقتاً قرآن میں کوئی غلطی موجود ہے۔ بلکہ جو بھی شخص اس شعبے میں اختصاصی مہارت رکھتا ہوگا وہی اس سوال کا جواب دے پائے گا۔ آج تک الحمد للہ کوئی بھی انسان قرآن حکیم میں کسی غلطی کا ثبوت مہیا نہیں کر سکا اور آئندہ بھی إن شاء اللہ ایسا امکان صفر کے درجے میں ہے۔

اب اس مذکورہ بالا بات چیت کے بعد کوئی بھی اللہ کی ذات پر ایمان رکھنے والا شخص یہ بیان نہیں دے سکتا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، اور یہ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب نہیں ہے۔ اور وہ لوگ جن کا اللہ کی ذات پر ایمان نہیں ان کی بات دوسری ہے لیکن جو خدائے واحد کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں خواہ ان کا تعلق غیر مسلموں سے ہی کیوں نہ ہو وہ اوپر بیان کیے گئے دلائل کے بعد یہ کہنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو سکتے کہ قرآن مجید اللہ کریم کا کلام نہیں ہے۔ لہٰذا اس پوری بحث و تمحیص کے بعد ہمارے پاس تین بنیادی نظریات میں سے آخری نظریہ ہی رہ جاتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے لہٰذا یہ کلام خداوندی پر مشتمل صحیفہ الہامی ہے۔

رہے خدا کے منکرین دہریئے، جو کسی خدا پر یقین و ایمان رکھنے کی صفت سے عاری ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات پر یقین نہ رکھنے والے ایسے حضرات جو اس محفل میں شریک ہیں میں اپنی جانب سے انھیں مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ میں ایسے دہریے حضرات کی خدمت میں یہ مبارکباد اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ وہ اپنی عقل سے کام لے رہے ہیں، اپنی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ جو لوگ خدا کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں ان کی اکثریت خدا کی ذات پر اندھا ایمان (BLIND FAITH) رکھتی ہے۔ ایک انسان عموماً اسی وجہ سے عیسائی ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش کسی عیسائی کے گھر ہوئی تھی اور ایک ہندو بھی اسی لیے ہندو ہوتا ہے کہ اس نے کسی ہندو کے گھر جنم لیا ہوتا ہے بعض مسلمانوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ وہ محض پیدائشی حادثے کی بنیاد پر مسلمان ہیں

کیونکہ ان کے والدین کا تعلق مسلمانوں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بے شمار لوگوں کا عقیدہ اندھی عقیدت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

جبکہ دوسری طرف ایک دہریہ، لامذہب انسان غوروفکر سے کام لیتا ہے۔ اس کا تعلق اگر کسی مذہبی خاندان سے بھی ہو تو بھی وہ غوروخوض سے کام لیتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح کے خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟ ایک ایسے خدا پر جو اپنی ذات میں انسان سے مشابہ صفات رکھتا ہے ایسی خصوصیات جو خود میری ذات میں بھی موجود ہیں تو پھر میں کسی ایسے خدا پر کس لیے ایمان لاؤں؟ اسی بنا پر وہ خدا کے نہ ہونے کا مدعی بن جاتا ہے، یوں وہ اللہ کریم کی ہستی سے انکار و اعراض کی روش اپنا لیتا ہے۔ بعض مسلمان مجھ سے سوال کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب ایک دہریے اور لامذہب آدمی کو آپ کس بات پر مبارک باد دینے پر کمر بستہ ہو رہے ہیں؟

میں اس دہریے کو اس وجہ سے مبارکباد دینا چاہ رہا ہوں کہ وہ کلمۂ شہادت کے شروع کے حصے کا اقرار کر چکا ہے وہ لا الٰہ کو مان چکا ہے اب اس کے لیے بس اِلَّا اللّٰہ کا اقرار کرنا باقی ہے۔ جس کی بابت ہم اِن شاء اللہ بات چیت کریں گے۔ وہ کلمہ طیبہ کے پہلے حصے کے بارے میں غوروخوض کر چکا ہے، چونکہ وہ خدا کے کسی غلط تصور کو ماننے کے لیے تیار نہیں اس لیے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کے سامنے خدا کی ذات کا حقیقی تصور رکھیں اور رب جلیل، خدائے واحد کے وجودِ برحق کا اس کو ثبوت دیں۔

جب کبھی بھی کوئی دہریہ میرے سامنے خدا پر اپنے ایمان نہ رکھنے کی بات کرتا ہے، تو میں اس سے پوچھا کرتا ہوں کہ ذرا یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاں خدا کی تعریف کیا ہے؟ اور پھر وہ جواب دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ فرض کر لیں کہ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک قلم ہے اور جواباً آپ کہہ دیتے ہیں کہ "نہیں یہ تو قلم نہیں ہے۔" تو اس موقع پر ضروری ہے کہ یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ قلم کیا ہوتا ہے۔ آپ کو قلم کی Definition اور اس کا حدود اربعہ معلوم ہونا چاہیے۔ عام صورت حال میں اگر ہم قلم کی تعریف سے لاعلم ہیں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا لیکن اگر صورت یہ ہو کہ آپ کہہ رہے ہوں کہ "یہ قلم نہیں ہے" تو پھر ضروری ہے کہ یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ قلم ہوتا کیا ہے یعنی قلم کی تعریف کیا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی دہریہ شخص یہ کہتا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے تو یہ بات ضرور اس کے علم میں ہونی چاہیے کہ خدا کہتے کس کو ہیں اور لفظ خدا کا معنی کیا ہے؟ اور جب میں ایسے کسی لامذہب شخص سے

پوچھتا ہوں تو وہ مجھے جواب دیتا ہے کہ صاحب دیکھیں! ان لوگوں کی حالت پر غور کریں کہ یہ کس کی پوجا کر رہے ہیں ایک ایسی ہستی کی جو انسانی صفات سے متصف ہے اس لیے میں کسی ایسے خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور نہ اسے خدا تسلیم کرتا ہوں۔ کچھ لوگوں کا خدا کا تصور غلط ہوتا ہے۔ اور ایک لامذہب یا دہریہ شخص ایسے تصور خدا کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اسے ردّ کر دیتا ہے جبکہ میں مسلمان ہونے کے باوجود بھی ایسے کسی غلط تصور کو درست نہیں کہتا اور اس کی تائید نہیں کرتا اور میں بھی خدا کے بارے میں اپنائے گئے اِس غلط تصور کا استرداد کر دیتا ہوں اور یہ لَآ اِلٰـهَ کا مرحلہ ہے۔ اب جبکہ میں لَآ اِلٰـهَ کے مرحلے تک خدا کے تصور سے متفق ہوتا ہوں تو اس وقت میرے لیے ضروری ٹھہرتا ہے کہ میں ایک منکر خدا دہریے کے سامنے خدا کا حقیقی اور درست تصور وضاحت سے پیش کروں۔ اللہ کے حقیقی اور صحیح درست سے کسی لامذہب کو آگاہ کرنا میری ذمہ داری ہے۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک آدمی مسلمان نہیں ہے بلکہ وہ اسلام سے نفرت رکھتا ہے، اگر اس سے دریافت کیا جائے کہ وہ کیوں اسلام کی مخالفت پر آمادہ ہے تو وہ جواباً کہتا ہے کہ سنیے جناب میں اِس لیے اسلام کا مخالف ہوں کہ

- اسلام ایک بے انصافی کا دین ہے
- یہ مذہب بے رحمانہ تعلیمات پر مبنی ہے
- دہشت گردی کی ترویج اس مذہب کا نصب العین ہے
- یہ مذہب خواتین کے حقوق غصب کرتا ہے
- اور یہ مذہب سائنس کے اصولوں کا مخالف ہے۔

اگر ایک غیر مسلم شخص مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اسلام کے خلاف ہے تو میں اس کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ جس مذہب میں آپ کی بیان کردہ باتیں موجود ہوں میں بھی اس مذہب کو تسلیم کرنے کا روادار نہیں۔ میں بھی کسی ایسے مذہب کو نہیں مانتا جو خواتین سے انصاف نہ کرتا ہو، جو اُن کے حقوق غصب کرے لیکن اس کے ساتھ میں اس پر یہ بھی واضح کروں گا کہ اسلام کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے درحقیقت یہ تصویر اسلام کی نہیں ہے اور یہ اسلام کی خصوصیات نہیں ہیں جو آپ نے بیان کی ہیں۔ اور میں اس کو اسلام کے درست اور حقیقی تصور سے روشناس کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس پر واضح کروں گا کہ اسلام تو امن وسلامتی اور رحم پر زور دینے والا مذہب ہے۔

دہشت گردی اِس مذہب کا مقصود ہرگز نہیں ہے اور یہ مذہب عورتوں کے ساتھ بھی انصاف اور برابری کا برتاؤ کرتا ہے ان کو مساوی حقوق مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام اور سائنسی نظریات میں بھی کوئی تصادم یا آویزش نہیں پائی جاتی۔

اگر میں اس کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر رکھ دوں گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اللہ کی مہربانی سے اِسلام کو ضرور تسلیم کرے گا۔ بحیثیت مسلمان یہ ہماری ملی اور دینی ذمہ داری ہے کہ ہم لوگوں تک اِسلام کا درست اور حقیقی تصور پہنچانے پر کمر بستہ ہو جائیں بعینہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی تصور بھی لوگوں تک پہنچانا مسلمانوں کی دینی اور مذہبی ذمہ داری ہے۔

اللہ پاک، خدائے بزرگ و برتر کی سب سے عمدہ اور دل نشین تعریف میرے خیال میں وہ ہے جو قرآن مجید کی سورۂ اخلاص میں بیان ہوئی ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد پاک ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص : 1تا4)

”کہو وہ اللہ ایک ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔“

قرآن مجید کی ان آیات کریمہ میں اللہ کی ذات و صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ واحد اور یکتا ہے، اکیلا ہے۔ وہ بے نیاز ہے، ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے مگر اسے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ پاک دنیاوی رشتہ داریوں سے پاک ہے نہ اس کے ماں باپ ہیں نہ ہی بیٹے اور بیٹیاں۔ گویا وہ والدین اور اولاد جیسے رشتوں سے بے نیاز ہے۔

اس کی برابری کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس کا مقابل کوئی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی اس جیسا ہے۔ بلکہ اگر خدا کا کسی سے موازنہ یا تقابل کیا جا سکے تو وہ حقیقت میں خدا کہلا ہی نہیں سکتا۔

اس سورہ میں مختصر لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی چار سطری تعریف بیان کی گئی ہے۔ اگر کسی بھی غیر مسلم کا تصورِ خدا قرآن کی اِس سورہ میں بیان کردہ خدا کے تصور کے مماثل ہے تو ہمیں بحیثیت مسلمان اس طرح کے تصور خدا پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ دنیا میں جو اور جہاں جہاں خدائی کے دعویدار ہیں ان کو سامنے آ کر اِس Test پر پورا اترنا پڑے گا۔ خدا کا

دعویدار کون ہے۔کون خدائی کا علمبردار بنا ہوا ہے۔

ہمارے دیش میں بعض لوگ گرور جنیش یعنی اوشو کو خدا سمجھتے ہیں تو آیئے اِس بھارتی خدا کو سورۃ الاخلاص کی کسوٹی پر پرکھ کر جانچتے ہیں کہ وہ اِس پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اللہ کی پہلی صفت وحدانیت کی ہے یعنی اکیلا اور واحد ہونا۔ کیا گرور جنیش اکیلا اور یکتا تھا۔ نہیں بلکہ اس سے ملتے جلتے ہزاروں لاکھوں انسان دنیا میں موجود ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں اس جیسے بے شمار انسان موجود ہیں لیکن ممکن ہے گرور جنیش کے کسی ماننے والے کو اصرار ہو کہ نہیں گرور جنیش تو ایک منفرد ہستی تھا۔ وہ ایک ہی تھا۔ اس طرح ہم اسے ایک چانس مزید دے دیتے ہیں اور دوسری صفت کے مطابق اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں خدا کی دوسری صفت بے نیاز ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے۔ اسے کسی بھی انسان یا دیگر مخلوقات کی قطعاً حاجت نہیں بلکہ وہ حاجات سے مبرا ہے جبکہ ساری کائنات کی ضرورتیں اس کی ذات سے وابستہ ہیں۔

اور گرور جنیش کے بارے میں ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ سانس کی تکلیف کا شکار تھا۔ اسے شوگر کا عارضہ بھی تھا۔ اسے اپنی بیماری کا خاتمہ کرنے پر بھی قدرت حاصل نہ تھی۔ وہ آپ کا اور میرا کیا علاج کرے گا۔ میرے اور آپ کے عوارض کیسے اس سے دور ہو سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس کا امریکہ جانا ہوا تو امریکی حکومت نے اس کو گرفتار کر کے جیل میں بھجوا دیا تھا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ وہ کیسا خدا ہے جو قید میں مجبور پڑا ہے۔ کیا کسی انسان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ خدا کو قید میں ڈال سکے۔ وہ خدا جو خود محبوس پڑا ہو اور اپنی آزادی کے لیے انسانوں کا محتاج ہو وہ آپ کو یا مجھے کیسے آزادی عطا کر سکتا ہے۔ ہماری حاجات، مشکلات اور مسائل اس سے کیسے دور ہو سکتے ہیں۔ ہماری بلاؤں اور مصیبتوں کو وہ کیسے ٹال سکتا ہے۔

ایک مرتبہ گرور جنیش کا اِس نوعیت کا بیان بھی منظرِ عام پر آیا تھا کہ اسے کسی نے زہر دے دیا ہے۔ اب سوچیے وہ کیسا خدا ہے جس کو زہر دیا جا سکتا ہو۔ اسی طرح جب وہ یونان میں اپنے مشن کے ابلاغ کے لیے گیا تو وہاں کے لاٹ پادری نے اس کے خطرے کو بھانپ کر اپنے ملک کی حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر اس کو یونان سے جلاوطن نہ کیا گیا تو اس کے ماننے والوں کے گھر منہدم کر دیئے جائیں گے۔ اور اِس دھمکی کے پیشِ نظر یونانی حکومت نے اُسے دیس نکالا دے دیا۔ کیا اسی کا نام بے نیازی ہے۔ کیا یہی صمدیت کا مقام ہے۔

خدا تعالیٰ کی تیسری صفت یہ ہے کہ خدا نہ تو کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد

ہے۔یعنی نہ تو اس کے والدین ہیں اور نہ ہی بیٹے بیٹیاں۔میں اس بات کا پورا پورا علم تو نہیں رکھتا کہ گرو رجنیش کی کتنی اولاد تھی البتہ اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ اس کے والدین یعنی ماں اور باپ دونوں تھے۔11 دسمبر 1931ء کو اس کی جبل پور میں ولادت ہوئی اور 19 جنوری 1990ء کو وہ وفات پا گیا۔لیکن آپ کا کبھی اس کے روحانی مرکز (آشرم) میں پونا میں جانا ہو تو وہاں آپ کو ایک تحریر نظر آئے گی،اس میں لکھا ہے:

بھگوان رجنیش

''جس کی نہ تو کبھی پیدائش ہوئی اور نہ ہی اس کی کبھی وفات ہوئی۔اس نے 11 دسمبر 1931ء سے 19 جنوری 1990ء تک اِس دنیا کا وزٹ کیا۔''

لیکن اِس عبارت میں اِس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کم وبیش اکیس (21) ممالک میں اس کے لیے ویزے کی ممانعت ہوگئی تھی۔وہ ان اکیس ملکوں میں جانے کا خواہش مند تھا لیکن ویزے کی مجبوری آڑے آئی اور وہ بیچارا ان میں نہیں جاسکا۔ذرا خدا کا حال تو دیکھیں کہ خود اپنی دنیا کے دورے پر نکلا ہے اور خود اپنی ہی کائنات کے 21 ملکوں میں جانے کی خواہش رکھتا ہے لیکن ویزے نہ ملنے کے باعث جانے سے مجبور ہے۔کیا آپ اسی قسم کے خدا کے تصور پر ایمان رکھتے ہیں۔

اب ہم تصور خدا کی آخری شرط کی طرف آتے ہیں اور اس کا جائزہ لیتے ہیں۔آخری شرط یہ ہے کہ خدا کا مثل اور ہمسر کوئی اور نہیں ہے۔اس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔اس ذات کا کسی سے موازنہ و مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔اگر ایسا ہو کہ ہم خدا کا تصور قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلیں یا اس کی شبیہ تیار کرلیں اس کی تصویر بنالیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تجسیم ناممکن ہے۔

اس کے برعکس ہم سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ گرو رجنیش کے سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ایک لانبی لہریے دار واڑھی اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔اس کی واڑھی کے بال سفید ہوچکے تھے۔ایک لمبا سا چوغہ اس نے زیب تن کر رکھا ہوتا تھا۔یعنی بڑی آسانی کے ساتھ اس کا تصور ہمارے ذہنوں میں آسکتا ہے اور جو تصور میں آجائے اُسے ہرگز ہرگز خدا نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ خدا کا کسی سے بھی موازنہ یا تقابل ممکن ہی نہیں۔ہم فرض کرلیتے ہیں کہ ایک شخص

مثال کے طور پر کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے ہزاروں گنا زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ مسٹر یونیورس آرنلڈ شوارزینیگر کے بارے میں سب کو علم ہے کہ وہ دنیا بھر کا ایک طاقتور ترین انسان تھا۔ شوارزینیگر کی طرح ہی دارا سنگھ بھی ایک نہایت طاقت ور پہلوان کی حیثیت سے معروف تھا۔ جب آپ اس نوع کے جملے زبان سے نکالیں گے کہ خدا شوارزینیگر سے، یا کنگ کانگ سے، یا دارا سنگھ سے ہزاروں درجے زیادہ طاقت کا حامل ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ آپ کا اختیار کردہ خدا کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ خواہ آپ کا دعویٰ یہ ہو کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقت ور ہے تو پھر بھی آپ خدا کا تقابل اور موازنہ کر رہے ہوں گے اور خدا کی یہ لازمی صفت ہے کہ اس سے کسی کا موازنہ یا تقابل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

''اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔''

اب اس مرحلے پر پہنچ کر میں اپنے قابل صد توقیر سامعین اور اربابِ علم و دانش سے درخواست گزار ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے اذہان میں خدا کا تصور کس طرح کا ہے۔ اور یہ بھی کہ کیا ان کا تصورِ خدا اِن مذکورہ بالا شرائط پر پورا اترتا ہے۔ کیا ان کے اِس تصور میں یہ چاروں خصوصیات موجود ہیں جن کی وضاحت قرآن حکیم کی سورۃ اخلاص کی آیات نے کر دی ہے۔ اگر آپ ہاں میں جواب دیتے ہیں تو ہم مسلمانوں کے لیے آپ کا تصور خدا قابلِ قبول ہے۔ ہمیں اِس تصورِ خدا پر کسی نوع کا بھی اعتراض نہیں ہے اور ہمارے نزدیک یہی ذات باری تعالیٰ کا حقیقی تصور ہے۔ دوسری صورت میں بھی فیصلے کا اختیار خود آپ کو حاصل ہے۔ لیکن اِن دلائل و براہین کی سماعت کے بعد بھی کوئی لا مذہب یا کوئی خدا بیزار شخص یا پھر کوئی دہریہ آپ کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ اس کا دعویٰ ہوگا کہ میں اِن دلائل کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ میرے نزدیک حتمی اور فائنل نتیجے تک پہنچانے والی کسوٹی اور معیار ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے سائنس۔ یعنی سائنسی اصولوں کی روشنی میں مجھ پر تصورِ خدا کی حقانیت واضح کرو۔

اِس بات سے تو مجھے بھی انکار نہیں کہ عصر حاضر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ تو ہم آج کی اِس پر وقار تقریب میں سائنسی علوم کے تناظر میں کتابِ خداوندی یعنی قرآن مجید کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہریوں کا موقف بھی یہی ہے کہ وہ صرف اسی دعوے کو درست تسلیم کرتے ہیں جو سائنس کے حقائق کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ دوسری صورت میں ہم خدا کے تصور کو تسلیم کرنے کے

لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں۔

میں آج ان سب اربابِ علم و دانش اور اصحاب حکمت و بینش سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا جو خدا کی ذات پر تو ایمان نہیں رکھتے لیکن سائنسی اصولوں اور کلیات پر اُن کو کامل یقین ہے۔ سوال کی صورت کچھ یوں ہے کہ اگر آپ ایک ایسی مشین دیکھیں جس کے متعلق اس سے پہلے نہ کبھی سنا ہو نہ پڑھا ہو اور نہ ہی دیکھنے کی نوبت آئی ہو تو آپ کے اندازے کے مطابق وہ کون سا موزوں شخص ہو سکتا ہے جو اِس مشین کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچا سکے۔ فرض کریں یہ مشین ایک خدا بیزار مُلحد کے سامنے ہے جو صرف سائنس پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے نزدیک وہ کون ہوگا جو اِس مشین کی کارکردگی اور اس کی ہیئت کے بارے میں مکمل علم مہیا کر سکتا ہو؟

اپنے طور پر میں نے یہ سوال بے شمار دہریوں، لامذہب لوگوں سے کیا ہے۔ قدرے تامل کے بعد ان کا جواب بالعموم اِس نوعیت کا ہوتا ہے۔

''شاید اِس مشین کا ''خالق'' ہی اس کے متعلق حتمی معلومات مہیا کر سکتا ہے۔'' بعض لوگ ''موجد'' کہتے ہیں، کچھ ''بنانے والا'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس مشین کا تیار کنندہ ہی درست معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ لاتعداد لوگوں سے سوال کرنے پر بھی مجھے ایک جیسے اور ملتے جلتے جوابات ہی ملے ہیں۔ تاہم ان کی جانب سے جو کچھ بھی جواب دیا گیا میں اس کو مان لیتا ہوں۔

مشین کو بنانے والے کے علاوہ دوسرا شخص کون ہو سکتا ہے جو اس کے بارے میں درست معلومات مہیا کر سکتا ہے۔ یہ کوئی ایک انسان بھی ہو سکتا ہے جسے بنانے والے نے آگاہ کر دیا ہو یا پھر کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جو اپنی تحقیق کے بل بوتے پر حتمی اور حقیقی نتائج تک پہنچ گیا ہو لیکن پہلا ہر صورت میں وہی ہوگا جو اس مشین کا صانع اور بنانے والا ہے۔ جو اس مشین کو ایجاد کرنے والا اور اس کا تیار کرنے والا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر میں اس خدا بیزار لامذہب، خدا کے منکر سے جو صرف اور صرف سائنس پر اعتقاد رکھتا ہے ایک مزید سوال کرنا چاہوں گا کہ تم بتاؤ کہ یہ کائنات کس طرح وجود پذیر ہوئی؟

اس سوال کے جواب میں وہ سائنسی انداز میں کہے گا کہ دراصل پہلے صرف مادے کا ایک مجموعہ تھا جس کو پرائمری نیبولا (PRIMARY NEBULA) کا نام دیا گیا ہے۔ پوری کائنات اسی پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا زوردار دھماکہ (BIG BANG) ہو گیا جس

کی بنا پر مزید تقسیم عمل میں آئی اور کہکشاؤں کا وجود منظر عام پر آیا۔ ستاروں اور سیاروں کو وجود ملا، اور یہ کرۂ ارض بھی معرضِ وجود میں آیا جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس پر میں اس سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ جنوں اور پریوں کے افسانے تم نے کہاں سے اخذ کیے ہیں۔ وہ جواباً کہتا ہے نہیں جناب یہ جنوں اور پریوں کے افسانے اور لایعنی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ تو سائنس کے مسلمہ حقائق ہیں جو چند دن پہلے ہمارے علم میں آئے ہیں۔ سائنس کی زبان میں "کل" سے مراد 50 سال یا ایک سو سال کا طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ 1973ء کی بات ہے کہ دو سائنس دانوں کو Big Bang Theory دریافت کرنے پر نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ ان کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے "عظیم دھماکے کے نظریے" کو دریافت کیا تھا۔

میں ان کی بات کو تسلیم کر لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں لیکن اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ اسی بات کو قرآن حکیم میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے بیان کر دیا گیا تھا تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ سورۃ الانبیاء میں اللہ پاک کا ارشادِ پاک ہے:

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

(الانبیاء: 30)

"یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی، کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟"

آپ جانتے ہیں کہ قرآن مجید آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل نازل ہوا تھا اور اس بات کے علمی ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو ڈیڑھ ہزار برس پہلے نازل ہوئی تھی۔ تو پھر آپ غور کریں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکا کہ اِس کتابِ برحق میں "Big Bang Theory" کے متعلق اشارہ موجود ہے۔

سورۃ الانبیاء کی اس آیت کریمہ میں انتہائی مختصر طور پر عظیم دھماکے کا نظریہ بیان ہوا ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ نظریہ آج سے نصف صدی یا ایک صدی پیش تر منظر عام پر آیا ہے تو پھر آپ اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار برس پیشتر اس کا تذکرہ قرآن حکیم میں کیسے آ گیا؟ خدا بیزار دہریے اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ "کسی نے تخمینہ لگا لیا ہوگا۔" میں اس

مسئلے پر الجھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے آگے چلتا ہوں۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ کرۂ ارض جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کی شکل وصورت کیسی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ پہلے تو لوگوں کا یہی خیال تھا کہ زمین چپٹی ہے اِسی بنا پر وہ کسی طویل سفر سے خدشات محسوس کرتے تھے کہ کہیں ایسی صورت نہ پیش آ جائے کہ زمین کے کنارے پر پہنچ کر ہم نیچے لڑھک جائیں جہاں سے باہر نکلنا ہمارے لیے ناممکنات میں سے ہو۔ لیکن بعد کی سائنسی معلومات کی روشنی میں آج ہمارے پاس بے شمار سائنسی شواہد پائے جاتے ہیں کہ زمین درحقیقت چپٹی نہیں ہے بلکہ گول ہے یعنی کرّے کی شکل رکھتی ہے۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں کہ یہ بات آپ کو کب معلوم ہو پائی؟

تو اس کا جواب دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ماضی قریب میں کوئی ایک صدی یا دو صدی پہلے یہ نظریہ معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن اگر جواب دینے والی شخصیت تعلیم یافتہ ہو تو اس کے جواب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ فرانسس ڈریک وہ پہلا سائنس دان تھا جس نے یہ نظریہ متعارف کروایا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ کروی ہے اور یہ 1597ء کی بات ہے۔

میں اس کو جواباً کہتا ہوں کہ وہ قرآن مجید کی اِس آیت پر غور کرے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

(لقمان:29)

”کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک وقتِ مقرر تک چلے جارہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے کہ) جو کچھ بھی تم کرتے ہوئے اللہ اس سے باخبر ہے۔“

یہاں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پروتے ہوئے لانے کا مطلب ہے ایک آہستہ رو اور تدریجی تبدیلی کا عمل۔ گویا رات رفتہ رفتہ بتدریج دن میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے اور اِسی طرح دن آہستہ آہستہ رات میں بدل جاتا ہے۔ اگر زمین چپٹی ہو تو رات

اور دن کی تبدیلی کا یہ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی شکل کروی ہو۔ اسی طرح کی ایک اور چشم کشا آیت کریمہ ہمیں ایک دوسرے مقام پر بھی قرآن مجید میں ملتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہو رہا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ○ (الزمر: 5)

''اس ذات نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات کو اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک مقررہ وقت تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو! وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔''

رات کو دن پر لپیٹنے اور دن کو رات پر لپیٹنے کا یہ عمل اسی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ اگر زمین کی شکل کروی ہو بصورتِ دیگر یعنی زمین اگر چپٹی ہو تو یہ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ نظریہ کہ زمین کروی ہے 1597ء میں منظر عام پر آیا تو پھر آپ اِس بات کا کیا جواب دیں گے کہ یہی بات تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے قرآن عظیم میں بھی موجود تھی۔ اس پر بھی وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک اتفاق تھا، محض ایک اتفاق یعنی ایک تخمینہ جو صحیح ٹھہرا۔ میں اِس مرحلے پر بھی کسی بحث میں نہیں پڑتا بلکہ بحث کو آگے لے چلتا ہوں۔

میں اس سے اگلا سوال یہ دریافت کروں گا کہ بتاؤ کہ چاند سے جو روشنی زمین تک آتی ہے یہ روشنی کس چیز کی ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہے گا کہ بات دراصل یہ ہے کہ پہلے ہم یہی باور کرتے تھے کہ یہ روشنی چاند کی ذاتی روشنی ہوتی ہے لیکن آج سائنس کی نوبہ نو تحقیقات نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ یہ روشنی چاند کی ذاتی نہیں ہوتی بلکہ یہ سورج کی روشنی ہوتی ہے جو چاند کی سطح سے منعکس ہو کر زمین تک پہنچتی ہے گویا چاند اپنی ذات سے خود روشن نہیں ہے بلکہ اس کی روشنی سورج سے مستعار ہے۔ جو آئینے کی طرح سورج سے روشنی لے کر بطرزِ انعکاس زمین تک اِس روشنی کو پہنچاتا ہے۔

اس مقام پر میں اپنے اِس فاضل دوست سے ایک اور سوال پوچھنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ

قرآن مجید کی سورۃ الفرقان میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ٥ (الفرقان: 61)

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک قمرِ منیر روشن کیا۔''

عربی زبان میں چاند کے لیے ''قمر'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی کے لیے ''منیرا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ منیرا کا مطلب ہے منعطف روشنی۔ ''نور'' کا لفظ اِسی نوع کی روشنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اب آپ کا دعویٰ ہے کہ اس حقیقت کا سراغ تم نے آج اِس دور میں لگایا ہے تو پھر تم خود ہی اِس بات کی ذرا وضاحت کرو کہ یہ آیت پھر کیوں کر قرآن مجید میں جگہ پا سکی اور وہ بھی آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے۔ اِس سوال کا جواب وہ فوراً نہیں دے پائے گا بلکہ اسے کچھ دیر کے لیے غور و فکر کرنا پڑے گا اور آخر کار اس کی جانب سے جو جواب موصول ہوگا وہ وہی ''اتفاق'' والا ہی ہوگا۔ یعنی یہ بھی ایک طرح کا تخمینہ یا اندازہ تھا یا دوسرے لفظوں میں تکا لگ گیا تھا۔ قرآن کی صداقت کے بالمقابل اُن کے پاس محض تخمینے، اندازے اور تکے کی دلیل ہے۔

تاہم اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں اس مقام پر اس سے بحث میں نہیں الجھوں گا۔ گفتگو کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے مناظرہ بازی اور لفظی بازی گری سے اجتناب برتوں گا۔ میں اس کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ اگر تمہارے پاس اس کا جواب یہی ہے تو میں تم سے بحث سے اجتناب کرتے ہوئے آگے چلتا ہوں اور میں اس سے مزید سوال کرتا ہوں۔

میں اس کو بتاتا ہوں کہ میں نے 1982ء میں میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس وقت ہمیں ہمارے اساتذہ نے بتایا تھا کہ سورج اپنے مقام پر ایک ساکن وجود ہے یعنی وہ اپنے محور کے گرداگرد تو بلا توقف حرکت کر رہا ہے جبکہ اپنے مقام کے اعتبار سے وہ غیر متحرک یعنی ساکن ہے اس مقام پر ممکن ہے وہ مجھ سے سوال کرے کہ کیا قرآن کی تعلیم بھی یہی ہے تو میں اس کو جواب دوں گا کہ ہرگز نہیں بلکہ اس کے متعلق تو ہمیں سکول میں بتایا گیا تھا، اب میں اس سے دریافت کروں گا کہ کیا واقعی یہی بات حقیقی ہے؟

وہ اس کے جواب میں کہے گا نہیں جناب بلکہ آج تو سائنسی علوم کافی سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگئے ہیں، بڑی بڑی سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں کئی ایک جدید انکشافات اہلِ علم کے سامنے آئے ہیں۔ اب ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد گردش کرنے کے ساتھ ساتھ مداری حرکت بھی کر رہا ہے۔ سورج جب اپنے مرکز کے گرد حرکت کرتا ہے تو اس کا آپ کو مشاہدہ ہوسکتا ہے مگر اس کے لیے آپ کے پاس ضروری نوعیت کے آلات کا ہونا ضروری ہے۔ آج ہم سائنسی انکشافات کی روشنی میں جانتے ہیں کہ سورج کی سطح پر سیاہ رنگ کے داغ دھبے پائے جاتے ہیں، ان دھبوں کی حرکت سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد تقریباً پچیس دنوں میں ایک چکر مکمل کر لیتا ہے۔ لیکن اس حرکت کے ساتھ سورج ایک مدار میں بھی حرکت کر رہا ہے۔ تو کیا قرآن مجید سورج کے ساکن ہونے کی بات کرتا ہے؟ ممکن ہے وہ ملحد جس سے میں محو کلام ہوں اس موقع پر مسکرا دے اور میری بات کا تمسخر اڑانے کی کوشش کرے لیکن پھر میں اس کو وضاحت سے بتاتا ہوں کہ قرآن مجید میں اِس ضمن میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ (الانبیاء: 33)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

قرآن مجید اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ یہ سب ایک فلک میں ایک مدار میں حرکت کر رہے ہیں۔ یہاں فطری طور پر میرا سوال یہ ہوگا کہ اگر یہ بات آج کی سائنسی تحقیقات کا نتیجہ ہے تو پھر آج سے کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال پیشتر یہ بات قرآن میں کیسے بیان کردی گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس دہریے پر سکوت طاری ہوجاتا ہے پھر کچھ سوچ کر وہ کہنا شروع کرتا ہے کہ عرب کے باشندے علومِ فلکیات میں ماہرانہ بصیرت و دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کسی صاحبِ علم عرب نے یہ بات آپ کے پیغمبرؐ کے سامنے بیان کردی ہو اور انھوں نے اِس بات کو قرآن مجید میں لکھ دیا ہو۔

مجھے اِس بات کے اقرار میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ علم فلکیات میں عرب نہایت ترقی یافتہ مقام پر فائز تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس دہریئے کو اِس بات کی طرف بھی لاتا ہوں کہ وہ تاریخ کو گڈ مڈ کرنے پر کمر بستہ ہے۔ بلاشبہ عربوں نے علمِ فلکیات میں قابلِ رشک مقام حاصل کرلیا

تھا لیکن ان کی یہ ترقی نزولِ قرآن سے بہت بعد کی بات ہے جبکہ قرآن اس سے بے شمار سال پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے بل پر ہی تو عربوں نے فلکیات میں فقید المثال ترقی کے زینے طے کیے۔ فلکیات کا علم عربوں کی وجہ سے قرآن میں نہیں آیا بلکہ عربوں نے اِس علم کو قرآن مجید سے حاصل کیا تھا۔ قرآن بے شمار سائنسی حقائق پر روشنی ڈالتا ہے۔

علم جغرافیہ کے تناظر میں آبی چکر "Water cylcle" کے پس منظر میں قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ○

(الزمر: 21)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا پھر اِس پانی کے ذریعے سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔"

قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمات میں اِس آبی چکر کا ذکر ہوا ہے اور اس کی پوری تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ قرآن میں اِس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ سمندروں کی سطح سے پانی بخارات کی صورت میں اوپر اٹھتا ہے۔ اس کے بعد یہ بخارات بادلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر بادلوں کی سطح کثیف ہو جاتی ہے۔ ان میں رعد و برق کے عوامل ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان ہی بادلوں سے بارش بھی برسنے لگتی ہے۔ اِس بات کا ذکر قرآن مجید کی بے شمار آیات میں ہوا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ○ (المؤمنون: 18)

"اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرادیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کرسکتے ہیں۔"

اسی طرح سورۃ روم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ o (الروم: 48)

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ یکا یک خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

پھر سورۂ نور میں اللہ پاک فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ o

(النور: 43)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکے چلے آتے ہیں۔''

اسی طرح سورۂ روم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ o (الروم: 24)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے

ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

اس طرح قرآن حکیم نے متعدد آیات میں آبی چکر کی تفصیلات بیان کی ہیں اور ہم نے دیکھا کہ اِسی آبی چکر کو Bernard Palacy نامی ایک سائنسدان نے 1580ء میں ایک نظریے کے طور پر پیش کیا۔ جس آبی چکر (Water Cycle) کو سائنس نے 1580ء میں دریافت کیا وہی آبی چکر اِس دریافت سے تقریباً ایک ہزار سال قبل قرآن مجید میں بیان ہوا۔ بتایئے اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کے بعد ہم ارضیات Geology کی بات کرتے ہیں۔ علم ارضیات میں ایک نظریے کا بیان ملتا ہے جسے Folding کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ ہم جس کرۂ ارض پر رہائش پذیر ہیں اس کی باہر والی پرت نہایت باریک ہے۔ اس پرت میں جب بل پڑتے ہیں تو پہاڑوں کے سلسلے وجود میں آتے ہیں۔ ان پہاڑوں سے زمین کو استحکام مہیا ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ نباء کی روشنی میں مَیں اس ملحد کو بتاتا ہوں کہ اس میں یہ بیان موجود ہے کہ:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ○ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ○

(النباء: 7-6)

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔"

گویا قرآن مجید کی رُو سے پہاڑوں کی حیثیت میخوں کی سی ہے عربی زبان میں خیمہ کھڑا کرنے کے لیے جو میخ یا کیل استعمال کی جاتی ہے اس کو "اوتاد" کہا جاتا ہے۔ جبکہ عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات بھی اِس نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ یعنی پہاڑوں کا وجود خیموں کی میخوں سے مشابہت رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ الانبیاء میں ارشاد ربانی ہے:

وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ○ (الانبیاء: 31)

"اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور

اِس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔"

قرآن کی اِس آیت کریمہ کی رُو سے پہاڑوں کی تخلیق کی غرض و غایت یہ قرار پاتی ہے کہ وہ اِس لیے بنائے گئے ہیں کہ تاکہ زمین کہیں ڈھلک نہ جائے اور محفوظ رہے۔"

اسی طرح میرے مزید استفسار پر وہ بے خدا ملحد یہ دعویٰ بھی کرے گا کہ اس کے علم میں بات یہ بھی ہے کہ سمندر میں میٹھا اور کھاری پانی بعض مقامات پر الگ الگ رہتے ہیں۔ ان کے مابین ایک طرح کی رکاوٹ اور مزاحمت موجود ہوتی ہے جو اِن دو اقسام کے پانیوں کو باہم ملنے سے روکے رکھتی ہے اور ان کا آپس میں ملنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں اسے قرآن حکیم کی یہ آیت مبارکہ گوش گزار کرتا ہوں:

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ٥

(الفرقان: 53)

"اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں جبکہ دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک آڑ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔"

اِسی سے ملتی جلتی بات سورۃ الرحمٰن کی ایک آیت مبارکہ میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ٥

(الرحمٰن: 19-20)

"دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔"

عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات اور جدید اکتشافات بھی اِس بات کے مؤید ہیں کہ سمندروں میں بعض مقامات پر میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے ان کے مابین ایک طرح کی آڑ پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے اِس ممکن پر میرا مخاطب ملحد مجھے جواب دے کہ "شاید کسی عربی شخص نے سمندر میں ڈبکی لگا کر اِس آڑ کا راز پا لیا تھا اور اِسی بنا پر قرآن نے اِس کے لیے برزخ کا لفظ

استعمال کیا ہے کہ اس عرب نے یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دی ہو گی۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں جس آڑ یا رکاوٹ کا بیان ہو رہا ہے وہ تو غیر مرئی ہے یعنی وہ نظر نہیں آتی بلکہ وہ تو ایک دیکھی نہ جاسکنے والی رکاوٹ اور آڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کے لیے برزخ کے لفظ کو برتا ہے۔

اس طرح کا مظاہرہ کھلی نگاہوں سے ''کیپ ٹاؤن'' کے مقام پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے یعنی افریقہ کے جنوب میں، اسی طرح مصر کے ملک میں بھی جہاں دریائے نیل سمندر میں گرتا ہے یہی صورت حال ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ان دونوں مقامات کے علاوہ خلیج عرب میں بھی ہزاروں میلوں تک دونوں طرح کا پانی پایا جاتا ہے جبکہ وہ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہونے پاتا بلکہ علیحدہ علیحدہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔

جیسا کہ سورۃ انبیاء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ

o (الانبیاء: 30)

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کریم کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے۔''

اب آپ ذرا وسعت قلب و ذہن سے کام لیتے ہوئے اِس بات پر غور فرمائیں کہ عرب کے ریگستانوں اور صحراؤں میں جہاں پانی کی نہایت کمی ہوتی ہے وہاں اس نوع کی بات ہو رہی ہے۔ اس ماحول میں یہ بات کس کے ذہن میں آسکتی تھی کہ ہر چیز کو پانی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ عرب کے صحرانشین بدّو اگر کسی چیز کا خیال دل میں لا ہی سکتے تو وہ پانی کے علاوہ ہر چیز پر غور فکر کر سکتے تھے لیکن کسی صورت میں بھی پانی کے واعیہ کا ان کے ذہنوں میں پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں پانی کی شدید قلت اور کمی تھی۔ عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہر زندہ چیز کا وجود خلیوں کا رہینِ منت ہے، ان خلیات کا بنیادی عنصر سائٹو پلازم ہوتا ہے جس کا اسی فی صد وجود پانی سے ترکیب پاتا ہے۔ اس کائنات کا ہر زندہ وجود پچاس سے نوّے فی صد تک پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اب

یہاں فطری طور پر پھر یہی سوال سامنے آتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اس بات کو قرآن مجید میں کیسے بیان کر دیا گیا۔ اب اس ملحد کے منہ پر مہرِ سکوت لگ چکی ہوگی اور وہ اس بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔

شماریات بھی عصر حاضر کا ایک معروف شعبۂ علم ہے۔ اس علم کا ایک نظریہ ہے جو Theory of Probability کے نام سے معروف ہے۔ اس نظریے کو آپ ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے فرض کریں ایک ایسا سوال ہے جس کے دو ممکنہ جوابات ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک جواب درست ہوگا جبکہ دوسرا جواب غلط ہوگا۔ اگر ہم محض تخمینہ لگا کر جواب دینے کی کوشش کریں تو اِس بات کا اِمکان ففٹی ففٹی ہے کہ آپ کا جواب درست ہو۔ جیسا کہ ٹاس کرتے وقت دونوں طرف کے آنے کا ففٹی ففٹی چانس ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم دو مرتبہ ٹاس کریں تو اِس بات کا کس قدر امکان ہو سکتا ہے کہ دونوں دفعہ ہی آپ کا جواب صحیح نکلے۔ تو اِس صورت میں پہلی مرتبہ تو ففٹی ففٹی یعنی دو میں سے ایک مرتبہ جبکہ دوسری بار ٹاس کرنے کی صورت میں اس پچاس فی صد کا پچاس فی صد امکان ہوگا یعنی چار میں ایک امکان یا دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پچیس فی صد امکان اس بات کا ہے کہ آپ دونوں مرتبہ صحیح جواب دے پائیں گے۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ میں ٹاس کرنے کے لیے ایک پانسہ پھینکتا ہوں اور اس پانسے کے چھ پہلو ہیں یعنی 1، 2، 3، 4، 5 اور 6۔ میں اگر اب تخمینہ لگانا چاہوں تو اِس تخمینے کے صحیح ہونے کا امکان چھ میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر میں دو مرتبہ ٹاس کرنا چاہوں اور ایک مرتبہ پانسہ پھینکوں تو اِس بات کا کس قدر امکان موجود ہے کہ ہر مرتبہ میرا جواب صحیح نکلے گا۔ یہ امکان 6×1×2×1×2 گویا کہ 24 ہو سکتا ہے گویا چوبیس میں سے ایک امکان یہ ہو سکتا ہے کہ میرا جواب ہر بار درست ثابت ہوگا۔

اب ہم اگر اسی نظریہ Theory of Probability کو قرآن پر استعمال کر کے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنی گفتگو کو تسلسل دینے کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ قرآن میں جو معلومات بیان کی گئی ہیں وہ محض تخمینے، اٹکل پچو اور اندازے تھے جو محض اتفاق سے درست نکلے۔ اس موقع پر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اِن اندازوں کی درستی کا امکان کس قدر موجود تھا؟

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ زمین چپٹی نہیں ہے بلکہ کرہ نما اور بیضوی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کی ہیئت کے سلسلے میں کیسے کیسے تخمینے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اور کسی بھی انسانی ذہن میں

زمین کے بارے میں کون کون سی صورتیں آسکتی ہیں؟ اس سلسلے میں فرض کیا جاسکتا ہے کہ زمین تکونی ہے، یا چکور ہے، یا چپٹی یا اس کے چھ پہلو ہیں یا پھر آٹھ پہلو رکھتی ہے۔ اس پر قیاس کر کے زمین کی ڈھیر ساری ممکنہ صورتیں انسانی ذہن میں آسکتی ہیں۔ ہم مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ زمین کی فقط تیس امکانی صورتیں ممکن ہیں۔ اب اس کے بعد اگر کوئی شخص محض تخمینے سے کام نکالنا چاہتا ہے تو اس کے تخمینے کے صحیح ہونے کا امکان 30 میں سے ایک ہوسکتا ہے۔

اسی طرح چاند کی روشنی کے معاملے کو لیجیے۔ چاند کی روشنی یا تو اس کی ذاتی ہوسکتی ہے یا پھر مستعار اور منعکس ہوگی، تو اس صورت میں دو باتیں ہی ممکن ہیں اور یہاں تخمینے کی درستی کا مکان دو میں سے ایک ہے۔ لیکن اس بات کا امکان کہ کسی بھی شخص کے دونوں تخمینے صحیح ٹھہریں گے، ساٹھ میں صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر ایک فطری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات چیز کس مادے سے تخلیق پذیر ہوئی ہے؟ اور یہ تخمینہ بھی ایک صحرا نشین بدوی عرب انسان نے قائم کرنا ہے تو اِس صورت میں اس کے ذہن میں کیا کیا جواب آسکتے ہیں۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں اس کا جواب، ریت، لکڑی، لوہے کسی دھات، کسی گیس یا تیل کی صورت میں متشکل ہو۔ وہ شخص اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے دس ہزار تخمینے قائم کرسکتا ہے۔ اور ان دس ہزار میں بھی اس کا آخری تخمینہ پانی کی بابت ہوسکتا ہے جبکہ قرآن مجید اعلان کر رہا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء: 30)

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

پھر ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۝ (النور: 45)

''اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا''

اسی بات کو محض تخمینے یا اندازے کی بنیاد پر کہا جائے تو اِس تخمینے یا اندازے کی درستی کا اِمکان دس ہزار میں ایک ہوسکتا ہے۔ اب اِس بات کا اِمکان کہ کوئی بھی شخص ان مذکورہ صدر تینوں امور کے متعلق محض تخمینے سے جواب دے اور ہر مرتبہ اس کا تخمینہ صحیح نکلے، چھ لاکھ میں سے ایک ہوسکتا ہے۔ گویا کہ 0,00017 فی صد۔ اب میں اِس بات کو سامعین کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں کہ اِن

ساری باتوں کے بعد بھی آپ قرآن مجید پر اس Theory of Probability کا انطباق کرنا پسند فرمائیں گے یا نہیں۔

قرآن حکیم میں ایسے بے شمار حقائق کا ذکر پایا جاتا ہے جو نزولِ قرآن کے زمانے میں لوگ میں تسلیم شدہ نہیں تھے۔ اگر ان تمام بیانات کو تخمینے کے طور پر لیا جائے تو ان تمام تخمینوں کی درستگی کا امکان صفر کے درجے میں رہ جاتا ہے۔ اور یہی امکان Probability کے نظریے کی رُو سے درست بھی ہے۔

بدیہی طور پر یہ گفتگو سن کر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر تو قرآن حکیم کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے پر زور آزمائی کر رہا ہے۔ تو اس موقع پر میں یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ قرآن مجید سائنس کی کتاب ہرگز نہیں بلکہ یہ تو سائنز کی کتاب ہے: گویا کہ

Quran is not a book of Science, It is a book of SIGNS.

قرآن تو نشانیوں اور علامات کی کتاب ہے۔ یہ آیات کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے کچھ زیادہ آیات مبارکہ پائی جاتی ہیں، ان چھ ہزار آیات کریمات میں سے تقریباً ایک ہزار سے قدرے زائد آیات ایسی ہیں جن میں سائنسی علوم اور سائنسی حقائق کا بیان ہوا ہے۔ میں سائنسی پیمانوں کو قرآن کے اثبات کے لیے نہیں برت رہا کیوں کہ کسی بھی چیز کے اثبات کے لیے آپ کو کسی معیار، کسوٹی اور پیمانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایک مسلمان کے نزدیک یہ کسوٹی اور فائنل معیار خود یہ کتابِ مبین ہی ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے لیے فرقان کا درجہ رکھتا ہے جو حق و باطل کو پرکھنے کا معیاری پیمانہ ہے۔ اسی قرآنی معیار پر ہی ہم مسلمان کسی بات کی صحت یا عدم صحت کو جانچتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق ہی ہم درست یا نادرست کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

جبکہ کسی خدا بیزار ملحد کے لیے، یا عصرِ حاضر کے کسی ایسے تعلیم یافتہ انسان کے لیے کہ جو خدا کی ذات پر ایمان سے عاری ہے تو ان کے لیے آخر کیا پیمانہ اور کیا کسوٹی ہونی چاہیے۔

ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے تو آخری کسوٹی سائنس ہی قرار پائے گی۔ اسی لیے میں اس قسم کے لوگوں کے سامنے اپنی بات انھی کی مطلوبہ کسوٹی پر پیش کر رہا ہوں۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں ہے کہ سائنس کے نظریات اکثر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر ہم نے صرف ان حقائق کی بنیاد پر بات کی ہے جن کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے اور محض مفروضات اور صرف نظریات کی اساس پر اپنی

بات ان کے سامنے نہیں رکھی، گویا میں نے ایسے نظریات کو بطور دلیل برتنے سے اجتناب کیا ہے جن کی اساس مفروضات پر ہے۔ میں نے اس پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو چیز آپ کے معیار اور کسوٹی نے آج سے پچاس ساٹھ سال یا ایک صدی پہلے ثابت کی ہے قرآن نے وہی بات انہی مصدقہ پیمانوں پر ڈیڑھ ہزار برس پیشتر بیان کر دی تھی۔ اور اسی بنیاد پر بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سارے علوم میں برتر اور مافوق حیثیت قرآن حکیم ہی کو حاصل ہے اگر قرآن کے علوم اور سائنسی علوم کا تقابل کیا جائے گا تو آخرالامر فوقیت اور تفوق قرآن مجید کے حصے میں آئے گا۔ قرآن مجید نے بے شمار سائنسی حقیقتیں اپنی آیاتِ بیّنات میں بیان فرمائی ہیں جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ربانی ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ (طٰهٰ: 53)

”وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بنایا اور اس میں تمہارے چلنے کے لیے راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے نباتات کے جوڑے نکالے۔“

جبکہ سائنسی طور پر یہ بات ماضی قریب میں سامنے آئی ہے کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ پھر سورہ انعام میں ارشاد پاک ہوتا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ○ (الانعام: 38)

”زمین پر چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے اِن کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔“

جبکہ سائنسی سطح پر یہ بات کچھ عرصہ پہلے ثابت ہوئی اور قرآن مجید نے اس کو ایک ہزار

پانچ صد سال پہلے ہی بیان کر دیا تھا۔

سورۃ نحل میں شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وہ شہد بنانے کے لیے پھولوں اور پھلوں سے رس جمع کرتی ہے اور اس کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا ہے یعنی شہد بنانے کا کام نر مکھی انجام نہیں دیتی بلکہ مادہ مکھی کے ذمے یہ کام ہے۔ سائنس دانوں کو اس بات کا سراغ حال میں کہیں ملا ہے جبکہ اس سے پہلے سائنس دانوں کا غالب خیال یہی تھا کہ شہد بنانے کا کام نر مکھی کے ذمے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مکھیاں تو صرف نئے دریافت ہونے والے پھولوں اور پودوں کی اطلاع اپنی ساتھی مکھیوں کو فراہم کرتی ہیں۔

چنانچہ سورۃ عنکبوت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

o (العنکبوت: 41)

''اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر، مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔''

یہاں اِس بات کا اظہار محض اِس پس منظر میں نہیں ہو رہا ہے کہ مکڑی کا گھر یعنی اس کا جالا ظاہری طور پر کمزور ہوتا ہے بلکہ یہ آیت مبارکہ مکڑی کی گھریلو زندگی کی خاصیت پر بھی روشنی ڈال رہی کہ تعلقات کے اعتبار سے بھی سب سے ناپائیدار گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے اور وہ اِس لیے کہ اکثر اوقات مادہ مکڑی اشتعال میں آ کر اپنے نر پارٹنر کو قتل کر دیتی ہے۔

چیونٹیاں بھی اس زمین پر پائی جانے والی ایک نہایت کمزور مخلوق ہیں اور سورہ النمل کی آیات سترہ اور اٹھارہ میں چیونٹیوں کے آپس میں گفتگو کرنے اور ہمکلام ہونے کا ذکر ہوا ہے۔ اس پر بعض لوگوں کے کان کھڑے ہو سکتے ہیں کہ یہ تو محض الف لیلیٰ کا داستانوی انداز لگتا ہے بھلا چیونٹیاں آپس میں کس طرح گفتگو کر سکتی ہیں۔ لیکن عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ حیواناتِ ارضی میں سے جس مخلوق کا طرزِ حیات انسانوں کے سب سے زیادہ قریب تر ہے وہ چیونٹیاں ہی ہیں۔ ان سائنسی اکتشافات کے مطابق چیونٹیوں کا رہن سہن کا انداز انسانی طرز معاشرت و تمدن سے نہایت قریب تر ہے۔ بلکہ چیونٹیاں اپنی مرجانے والی چیونٹیوں کی تجہیز و تکفین تک بھی کرتی ہیں۔ اور پھر سب سے نرالی اور اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ ان کا آپس میں رابطے کا ایک نہایت فعال نظام موجود ہوتا ہے اور ان کے مابین پیغامات کے ابلاغ و ترسیل کا ایک منظم اور

منصوبہ بند طریقہ موجود ہے۔

پھر سورۃ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ○ (النحل: 69)

''اس مکھی کے پیٹ سے رنگ برنگ کا ایک مشروب نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔''

قرآن مجید کی اِس آیت مبارکہ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ شہد میں انسانوں کے لیے شفاء کی خاصیت ودیعت کی گئی ہے اور آج کی عصری سائنسی تحقیقات سے بھی یہ بات مبرہن ہوتی ہے شہد اپنے اندر جراثیم کش اثرات رکھتا ہے۔ اسی بنا پر روسی فوجی جنگوں کے دوران زخمی ہونے پر اپنے زخموں پر شہد کا استعمال کرتے ہیں اس سے نہ صرف ان کے زخموں کا اندمال ہوجاتا تھا بلکہ زخموں کے نشانات بھی بالکل زائل ہوجاتے تھے۔ اسی طرح الرجی کے بعض امراض میں شہد بطور علاج استعمال کرایا جاتا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن حکیم نے دودھ کی افزائش اور دورانِ خون کی نسبت سے بھی بات کی ہے۔ سورۃ نحل کی آیت نمبر چھیاسٹھ اور سورہ مومنوں کی آیت نمبر اکیس میں ان چیزوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور سائنسی سطح پر قرآن مجید کے نازل ہونے کے چھ صدیوں بعد ایک مسلمان طبیب اور سائنس دان نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا تھا جبکہ مغربی دنیا میں مزید چار سو سال بعد یعنی قرآن حکیم کے نازل ہونے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد دوران خون کا نظریہ HARVEY نامی سائنس دان کی معرفت معرضِ وجود میں آیا۔

علم الجنین علم کی ایک ایسی شاخ ہے کہ جس میں بچے کی پیدائش، ماں کے پیٹ میں اس کے تخلیقی مراحل کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید کی اوّلین نازل ہونے والی سورۃ العلق میں اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ (العلق: 1،2)

''پڑھو (اے پیغمبرؐ) اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ کہ جس نے پیدا کیا۔ جس

نے جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

عربی لغت کی رُو سے "علقہ" کا معنی محض خون کا لوتھڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد "چپک جانے والی چیز" اور "جونک جیسی چیز" بھی اہل علم کے نزدیک ہے۔ اس آیت کو بھی اور اس نوع کی دیگر آیاتِ قرآنی کو علم الجنین کے ماہر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کیتھ مور ٹورنٹو کینیڈا سے تعلق رکھنے والے سائنس دان ہیں ان کا شمار اس شعبے کے اختصاصی ماہرین میں ہوتا ہے۔

عرب کے بعض اہل علم نے جن کو اِن آیاتِ قرآنی کی حقیقی تفہیم میں قدرے تردّد تھا، قرآنی حکم "فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا" کے جاننے والوں سے پوچھ لو کے تحت پروفیسر مور کے ہاں چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِن قرآنی آیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جواب دیا کہ قرآن کے اِن بیانات میں سے اکثر باتوں کی توجدید تحقیقات کی روشنی میں تصدیق ہوتی ہے اور وہ عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات کے مطابق سوفی صد درست ہیں جبکہ قرآن حکیم کے بعض بیانات پر وہ رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ وہ اِن امور کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتے۔ انھی آیات قرآنی میں ایک آیت وہ بھی تھی جس میں بتایا گیا کہ "ہم نے انسان کی تخلیق ایک جونک جیسی چیز سے کی ہے"۔ اس آیت کا تجزیہ کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب اپنی تجربہ گاہ میں چلے گئے انھوں نے جونک کی تصویروں اور جنین کے بالکل ابتدائی مراحل کا آپس میں موازنہ کیا۔ نہایت معیاری نوعیت کی اعلیٰ پائے کی ایک خوردبین سے تفصیلی معائنے کے بعد انہوں نے اِس امر کا اعلان کیا کہ جونک میں اور جنین کے ابتدائی مرحلوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے آن دی ریکارڈ بیان دیا کہ قرآن نے اِس ضمن میں جو بیان دیا ہے وہ صد فی صد درست اور مبنی بر حقیقت ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ڈاکٹر مور نے قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ سے اخذ کردہ یہ معلومات اپنی کتاب "The Devaloping Human" کی تیسری اشاعت میں اضافہ کیں۔ ان کی اِسی تحقیقی کتاب کو اس سال کی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر مور نے یہ بھی بیان دیا کہ علم الجنین کے حوالے سے قرآن مجید نے جو معلومات فراہم کی ہیں جدید سائنس اِن معلومات کا زمانۂ حال میں ہی کھوج لگا سکی ہے۔ اس لیے کہ علم الجنین تو طبی علوم کی انتہائی جدید شاخوں میں سے ایک شاخ ہے اور اس بات کا امکان سرے سے ہی مفقود ہے کہ علم الجنین کے متعلق یہ معلومات انسانی دسترس میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر آ گئی ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا مبنی بر حقیقت

ہے کہ قرآن مجید ایک الہامی صحیفہ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ٥ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ٥ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ٥ (الطارق: 5تا7)

''پھر انسان ذرا یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

علم الجنین کے بارے میں آج کی جدید معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے ابتدائی مراحل میں جنسی اعضاء یعنی فوطے اور رحم وغیرہ اس مقام سے تخلیق پاتے ہیں جہاں گردے ہوتے ہیں۔ گویا یہ ریڑھ کی ہڈی اور گیارھویں بارھویں پسلیوں کے درمیان بننا شروع ہوتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ کریم کا ارشادِ پاک ہے:

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ٥ (النجم: 45۔46)

''اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔''

اسی طرح قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ٥ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥

(القيٰمة: 37تا38)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

قرآن مجید کی ان مذکورہ بالا آیات کریمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بچے کی جنس

نطفے سے متعین ہو جاتی ہے۔ گویا کہ مرد نئے پیدا ہونے والے بچے کی صنف کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو جدید سائنسی تحقیقات نے ابھی حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر بھی پایا جاتا ہے کہ جنین تین تاریکیوں یا پھر دوسرے لفظوں میں تین تہوں کے اندر تشکیل پاتا ہے اور آج کی عصری تحقیقات بھی اسی بات کی موید ہیں۔

ماں کے پیٹ میں جنین جو ارتقائی مراحل طے کرتا ہے قرآن مجید نے اس پر بھی نہایت شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥ (المومنون: 13۔ 12)

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاری گروں سے اچھا کاری گر۔"

پھر سورۃ الحج میں ان مراحل پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۭ o (الحج: 5)

''لوگو، اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں، ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر آتا ہے:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ۭ o (السجدہ: 9)

''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں۔''

پھر سورۃ الدھر میں ارشاد ہوتا ہے:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا o (الدھر: 2)

''ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔''

اوپر بیان کردہ ان دونوں آیات قرآنیہ میں سماعت کی قوت کا بصارت کی قوت سے پہلے ذکر آیا ہے۔ آج کی جدید طبی معلومات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ سننے کی صلاحیت بچے میں پہلے پیدا ہوتی ہے جبکہ دیکھنے کی صلاحیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ بچے کے ماں کے رحم میں پانچویں مہینے سے سننے کا نظام بن جاتا ہے جبکہ بصارت کا سسٹم ساتویں مہینے میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔

لوگوں نے حیات بعد الموت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ جب مرنے کے بعد انسان کی ہڈیاں مٹی میں مل کر خود خاک ہو جائیں گی تو پھر ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ان مردہ انسانوں کو کیسے نئی زندگی عطا کر کے اٹھا کھڑا کرے گا؟ تو اس کے جواب میں حکم

خداوندی ہوا کہ:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ o بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ (القیٰمۃ: 3-4)

'کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ انگلیوں کی پوروں کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ گویا قرآن مجید کے مطابق قیامت کے روز خدائے خالق وقدیر انسان کی نہ صرف مردہ ہڈیوں کو انسانی ڈھانچے میں تبدیل کر کے اسے صحیح سالم انسان کی صورت میں پھر سے زندہ کر دے گا بلکہ اس کو پوروں کو بھی ٹھیک ٹھیک بنا دینے پر وہ ذات مطلق قادر ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ یہاں انگلیوں کی پوروں کا ذکر کس مقصد کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ 1880ء کی بات ہے کہ دنیا میں پہلی مرتبہ انگلیوں کے نشانات کے ذریعے انسانوں کی شناخت کا طریق کار منظر عام پر آیا۔ اس طریقے کے مطابق آج کل لوگوں کی شناخت میں کافی مدد لی جا رہی ہے اور یہ اس لیے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سے کوئی سے بھی دو انسانوں کی انگلیوں کے نشانات ایک جیسے نہیں ہوتے۔

جبکہ قرآن حکیم اسی بات کا اشارہ نزول قرآن کے وقت آج سے ڈیڑھ ہزار برس قبل دے رہا ہے۔ قرآن مجید سے اسی نوع کی اور بھی بہت سے مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں بلکہ اگر آپ قرآن اور سائنس کے تناظر میں تفصیلی مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں تو میری کتاب "Quran and the Modern Science" کا ضروری مطالعہ کریں۔

اپنے خطاب کے آخر میں میں صرف آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ پروفیسر تھاگاڈا شوآن Professor Thagada Shaun تھائی لینڈ کے ایک معروف سائنس دان تھے، درد اور درد محسوس کرنے والے اعضاء کے بارے میں انھوں نے کافی گہری تحقیقات کی ہیں۔ اس سے پہلے یہ نظریہ مقبولِ عام تھا کہ درد کا احساس دماغ کو ہوتا ہے یعنی اعصاب کی معاونت سے دماغ کو درد کا احساس ہوتا ہے لیکن اس دور میں ایک تازہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ درد محسوس کرنے میں جلد کا بھی نہایت بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق جلد میں درد محسوس کرنے والے "Pain Receptors" ہوتے ہیں اور انسان ان کی مدد سے درد کا احساس

کرتا ہے۔اب اس نظریے کے بالمقابل آپ قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۝ (النساء: 56)

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کردیا ہے انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کردیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔''

قرآن مجید کی اِس آیتِ کریمہ سے بین طور پر مترشح ہورہا ہے کہ درد محسوس کرنے کے عمل سے جلد کا براہِ راست تعلق ہے۔ گویا کہ اِس آیت میں درد محسوس کرنے والے Pain Receptors کی جانب واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر تھاگاڈا نے جب یہ سنا کہ اس کتاب برحق نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے ہی اِس نوع کی معلومات مہیا کردی تھیں تو انھوں نے اسی ایک دلیل کو بنیاد بنا کر مصر کے شہر قاہرہ میں ایک میڈیکل سیمینار کے دوران سابقہ دین ترک کرکے قبولِ اسلام کا شرف حاصل کرلیا اور کھلے طور پر انہوں نے اعلان کردیا کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ

''اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔''

ایک خدا بیزار ملحد اور دہریے سے اگر یہ بات پوچھی جائے کہ بھلا اس قسم کی معلومات قرآن مجید میں کہاں سے داخل ہوگئیں تو آپ کے نزدیک اس کا جواب کس طرح کا ہونا چاہیے میرے نزدیک اس کے پاس اس سوال کا فقط ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ ایک نامعلوم مشین کے بارے میں معلومات کا حصول کس سے ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اس مشین کے بنانے والے خالق سے اس مشین کے متعلق معلومات فراہم ہوسکتی ہے۔

اسی مثال کے پیشِ نظر قرآن حکیم میں اِن سب حقائق کو بیان کرنے والا بھی اِس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کا خالق اور اس کا موجد ہی ہے۔اس ذات کے لیے انگلش میں GOD کا لفظ مستعمل ہے اور عربی زبان میں بہتر انداز میں ''اللہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

معروف سائنسدان Francis Baeon نے سچ ہی کہا تھا کہ:

"سائنس کا ادھورا علم آپ کو خدا بیزار دہریہ اور ملحد بنا دیتا ہے جبکہ اس کا وسعت آمیز اور گہرا مطالعہ آپ کو خدا کی ذات پر ایمان لانے کے قابل بنا دیتا ہے۔"

فرانسس بیکن کے اِسی مقولے کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر کا سائنس دان جھوٹے اور جعلی خداؤں کا استرداد تو کر چکا ہے یعنی لَآ اِلٰـــہَ کی منزل تک تو رسائی پا چکا ہے جبکہ "اِلَّا اللّٰہ" کی منزل اُس سے ابھی دور ہے۔

میں اپنے آج کے خطاب کا اختتام قرآن حکیم کی اِس آیت مبارکہ کے ساتھ کرنا چاہوں ہوگا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ○

(حٰمٓ السجدة: 53)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور اُن کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔"

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

حصہ دوم

سوالات اور جوابات

سوال: مسلمان، خدا کو اللہ کے نام سے کیوں یاد کرتے ہیں؟

جواب: میری عزیز بہن نے سوال کیا ہے کہ مسلمان خدا کی ذات کے لیے اللہ کے لفظ کا کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے خطاب میں میں نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی تھی۔ قرآن مجید کی سورۂ اخلاص میں اللہ کریم کی ذات و صفات کو بڑے خوبصورت اور جامع پیرائے میں بیان فرمایا گیا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص: 4-1)

"کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔"

اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید میں یہ بھی فرما دیا گیا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل: 110)

"اے نبیؐ! ان سے کہو 'اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔"

گویا کہ ہر اچھا نام اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اسی بات کو قرآنِ مجید میں دیگر کئی مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف: 180)

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اسے اچھے ناموں ہی سے پکارو۔''

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط

(الحشر: 24)

''وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی o (طٰهٰ: 8)

''وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

قرآن مجید کی ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بہترین اور خوبصورت نام اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے لیے ہیں۔ یہاں ایک بات کا ضروری خیال رہنا چاہیے کہ ایک تو اللہ پاک کے نام خوبصورت ہونے ضروری ہیں اور دوسرے یہ کہ ان ناموں سے انسان کے دماغ میں اللہ پاک کی کوئی شبیہ نہیں بنی چاہیے گویا کہ ان ناموں سے تجسیم Personification کا پہلو وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے بعد اب ہم اِس پہلو کی طرف آتے ہیں کہ مسلمان ''اللہ'' کے لفظ کو انگریزی زبان کے لفظ "God" پر کیوں کر ترجیح دیتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا لفظ ''اللہ'' ایک منفرد، یکتا اور بے آمیز لفظ ہے جبکہ عربی زبان کے لفظ God کو یہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ کیوں کہ God سے کئی اور شکلیں بھی بن سکتی ہیں God کے آخری میں حرف S کا اضافہ کردیں تو اس طرح یہ لفظ Gods بن جاتا ہے یعنی یہ پھر واحد کی بجائے جمع کے صیغے کی صورت اختیار کرلیتا ہے جبکہ عربی زبان کے لفظ اللہ کی کسی صورت میں جمع نہیں بن سکتی۔ اسی بنا پر اسلام کی سچی تعلیمات میں ایک سے زیادہ خداؤں کا تصور سرے سے ہی مفقود ہے اور اللہ واحد و یکتا ہے جیسا کہ ارشاد پروردگار عالم ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اخلاص: 1)

''کہہ دو وہ اللہ ہے یکتا۔''

اب ایک اور پہلو سے دیکھیں۔ اگر انگلش زبان کے لفظ God کے آخر میں ESS کا اضافہ کردیا جائے تو اس طرح یہ لفظ Godess کی شکل اختیار کرلے گا۔ یعنی دیوی یا مؤنث خدا اور

جیسا کہ آپ جانتے ہیں عربی زبان کا لفظ اللہ جنس کے تصور سے منزہ ہے، اس کے ساتھ اس نوع کے سابقے لاحقے نہیں لگائے جاسکتے اور تذکیر و تانیث کی نسبتوں سے اللہ کا لفظ ماوراء ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ انگلش زبان کے لفظ God کو اگر Capital "G" سے لکھیں تو اس سے مراد ہوگا ''خدا'' جبکہ اگر اس کو چھوٹے "g" سے لکھ دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے ''دیوتا'' یا ''جعلی خدا'' وغیرہ۔ جبکہ اسلام کی تعلیمات میں صرف اور صرف معبود واحد یعنی اللہ تعالیٰ کی یکتا ذات کا تصور پایا جاتا ہے اور مسلمان کسی دیوتا وغیرہ پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اسی طرح لفظ God کے ساتھ اور بھی کئی طرح کے تجربات کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم اِس لفظ God کے بعد انگریزی لفظ Father کا اضافہ کر دیں تو اِس سے ایک نیا لفظ God Father تشکیل پا جاتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص میرا گاڈ فادر ہے۔ یعنی وہ میرا نگہبان اور سرپرست ہے جبکہ عربی لفظ اللہ کے ساتھ اس طرح کا کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اِسلام میں اللہ باپ یا اللہ پاپا سے مشابہہ کوئی تصور یا عقیدہ نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح God کے لفظ کے بعد اگر لفظ Mother کو لگا دیا جائے تو یہ نیا لفظ God Mother کی صورت اختیار کر لے گا۔ اس نوع کی بھی کوئی صورت اِسلام میں نہیں پائی جاتی۔ آخر میں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کرتا چلوں کہ اگر اِس لفظ God کے شروع میں Tin کا لفظ لگا دیا جائے تو اس طرح یہ ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور Tin God بن جاتا ہے جس کا مطلب ہے جعلی یا جھوٹا خدا جبکہ عربی زبان کے اِس خوبصورت لفظ ''اللہ'' کے ساتھ جسے مسلمان اپنے خالق کے نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں کسی طرح کا کوئی سابقہ یا لاحقہ وابستہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پاک ہے۔ واحد و یکتا ہے، آپ اس ذات قدوس کو کسی بھی مناسب نام سے پکار سکتے ہیں لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ نہایت خوبصورت ہونا ضروری ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ آپ نے اپنے سوال کا تشفی بخش جواب پالیا ہوگا۔

سوال: قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت نمبر 11 اور 12 کے حوالے سے اروِن شوری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان آیات میں ورثا کے جس طرح حصص بیان کیے گئے ہیں اگر تمام حصوں کو جمع کیا جائے تو ان سب کا حاصل جمع ایک سے زیادہ برآمد ہوتا ہے۔ اروِن شوری کا دعویٰ اِس سے یہ ہے کہ قرآن کا مصنف حساب اور ریاضی کے علوم سے معاذ اللہ

نابلد تھا۔ کیا آپ اِس سوال کا جواب وضاحت سے دینا پسند فرمائیں گے؟

جواب: میرے ایک عزیز بھائی نے ارون شوری کے حوالے سے ایک سوال دریافت کیا ہے کہ قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیات 11، 12 میں ورثاء کے جو حصے بیان ہوئے ہیں ان کو اگر جمع کیا جائے تو جواب ایک سے زیادہ آتا ہے اور اِس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید کے مصنف کو ریاضی سے واقفیت نہیں تھی۔

میں نے اپنی خطابی گفتگو میں بھی اِس پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ ویسے تو دنیا میں بے شمار ایسے لوگ مل جائیں گے جو قرآن مجید میں غلطیاں بتانے کے دعویدار ہیں لیکن ان کے اعتراضات کا اگر سنجیدگی سے علمی بنیادوں پر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تمام دعاوی بے بنیاد اور بودے ہیں اور وہ اپنے کسی ایک دعوے کو بھی ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

وراثت کے متعلق قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کی حسب ذیل آیات میں وراثت کے مسئلے پر بات کی گئی ہے:

سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر 180

سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر 240

اور اسی طرح سورۃ النساء کی آیت نمبر 19

جبکہ وراثت کے تمام حصص کی مکمل تفصیل سورۃ نساء کی آیت نمبر 11 اور 12 اور پھر آیت نمبر 167 میں دی گئی ہے۔ ارون شوری نے اپنی کتاب میں جو مزعومہ دعویٰ کیا ہے اس کا تعلق سورہ نساء کی آیت نمبر 11، اور 12 سے ہے۔ جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ

أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝)

النساء۔۱۱۔۱۲)

''تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کے وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ اور تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے۔ جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے جب کہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ دانا بینا اور نرم خو ہے۔''

ان آیات کریمہ میں پہلے اولاد کے حصے بیان ہوئے ہیں اولاد کے بعد والدین کے حصص کا بیان ہوا ہے اور آخر میں دیگر حق دار رشتہ داروں کے حصے بیان کیے گئے ہیں۔ اسلام میں وراثتی امور کے ضمن میں نہایت تفصیل سے جامع رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی ان آیات میں اصولی چیزوں کا بیان آ گیا ہے جبکہ مزید تفاصیل کے لیے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات و ارشادات (احادیث مبارکہ) سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ وراثت کا موضوع اس قدر تفصیلی اور اہم ہے کہ اِس کا پورا فہم حاصل کرنے کے لیے انسان کی پوری زندگی بھی ناکافی ہے۔ اور حال یہ ہے کہ ارون شوری نے محض دو آیتوں کے پیشِ نظر اس مفصل قانون پر رائے زنی شروع کر دی ہے۔

ارون شوری کی مثال اس طرح کی ہے کہ ایک شخص حساب کے گنجلک اور مشکلات سوالات کو حل کرنے کا خواہاں ہے مگر وہ حسابی علم کی مبادیات سے بھی واقفیت نہیں رکھتا جیسا کہ آپ نے BODMAS کے کلیے کے سلسلے میں سن رکھا ہوگا جس کی وضاحت حسب ذیل انداز سے کی جا سکتی ہے:

BO = Brackets off (بریکٹ کھولیں)

D	=	Division	(تقسیم کا عمل)
M	=	Multiplication	(ضرب کا عمل)
A	=	Addition	(جمع کا عمل)
S	=	Subtraction	(تفریق کا عمل)

اس ترتیب کو BODMAS کا عمل کہا جاتا ہے۔ لیکن اِس ترتیب کو اُلٹ دیا جائے اور پہلے تفریق اس کے بعد ضرب اور اس کے بعد جمع کا عمل کیا جائے تو اِس صورت میں جواب یقیناً غلط برآمد ہوگا۔ وراثت کے سلسلے میں اردن شوری کی صورتحال بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔

اسلام میں وراثتِ املاک کا اصول تو بالکل سیدھا سادا ہے کہ سب سے پہلے والدین، پھر میاں اور بیوی کے حصے نکالنے کے بعد آخر میں ترکہ اولاد کے درمیان بانٹ دیا جائے گا۔ اور اِس طرح عمل کرنے سے یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام حصص کا میزان ایک سے بڑھ جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس جواب سے مطمئن ہو گئے ہوں گے۔

سوال: میں نئی نئی مسلمان ہوئی ہوں۔ 1980ء میں میں نے عیسوی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرلیا تھا۔ میرے والدین کا اِصرار ہے کہ قرآن مجید انجیل مقدس کی نقل ہے۔ میں ان کو کیسے مطمئن کرسکتی ہوں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے کہ قرآن مجید انجیل مقدس کی نقل ہو؟

جواب: ایک نومسلم بہن کی طرف سے سوال پوچھا گیا ہے۔ سوال کے ساتھ انھوں نے اِس بات کی وضاحت کی کہ پہلے وہ عیسائیت سے متعلق تھیں اور پھر بعد میں 1980ء میں انھوں نے اسلام اختیار کرلیا۔ میں نہایت مسرت سے اپنی جانب سے اپنی اس بہن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور محض ایک مرتبہ ہی نہیں بلکہ تین مرتبہ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے دینِ حق کو قبول کیا ہے۔ اپنے خطاب کے دوران میں نے کہا تھا کہ میں تو ایک ملحد اور مذہب بیزار شخص کو بھی مبارک باد کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں کہ اس نے لَآ اِلٰهَ کا مرحلہ طے کرلیا ہے اور اپنی اِس نومسلمہ بہن کو تین مرتبہ مبارک باد اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ انھوں نے نہ صرف لَآ اِلٰهَ کی منزل میں قدم رکھا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اِلَّا اللّٰه کا بھی اقرار کرلیا ہے اور محمد رسول اللہ پر بھی ایمان لے آئی ہیں۔ گویا انھوں نے اس کلمہ حق کو تسلیم کرلیا ہے کہ:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہ

''اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔''

اِس موقع کی مناسبت سے میں اس نومسلمہ بہن کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور اب ان کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

انھوں نے پوچھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو کیسے قائل کریں کہ قرآن مجید بائیبل مقدس کی نقل نہیں اور اِس کتاب برحق نے اِس کتاب سے کچھ اخذ واقتباس نہیں کیا۔

میں نے اپنے خطاب کے دوران بھی غالباً یہ بات کہی تھی کہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی کامل روشنی میں معبوث ہوئے اور ان کی زندگی کا جملہ ریکارڈ تاریخ کے صفحات میں موجود اور محفوظ ہے اور اس کے مطابق پیغمبر آخر الزمانؐ تعلیم یافتہ نہیں تھے بلکہ اُمّی یعنی اَن پڑھ تھے۔ اور یہی ایک حقیقت ہے کہ جو اس طرح کے تمام دعووں کے غبارے سے ہوا نکال دیتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ ○

(الاعراف: 157)

''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اِس پیغمبر نبی اُمّیؐ کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔''

اسی طرح بائیبل مقدس میں بھی لکھا ہے:

''اور پھر وہ کتاب کسی ان پڑھ کو دیں اور کہیں اس کو پڑھ اور وہ کہے میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔'' (یسعیاہ: باب 29۔12)

قرآن مجید کے مطابق اس چیز کا ذکر انجیل میں پایا جاتا ہے اور اگر آپ انجیل پڑھیں گے تو شہادت دیں گے کہ ہاں واقعی انجیل میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ایسے مستشرق اور اسلامی علوم کے مغربی فاضلین جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انجیل سے نعوذ باللہ اخذ واکتساب کیا تھا وہ اس بات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ اس وقت تک تو انجیل کا کسی بھی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔

عہد نامہ عتیق کا جو سب سے پرانا ترجمہ ملتا ہے وہ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صدیوں بعد ہوا تھا جبکہ عہد نامہ جدید کا عربی زبان میں ترجمہ تو مصدقہ روایات کے مطابق 1616ء میں ہوا تھا یعنی بعثتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کم و بیش دس صدیاں بعد۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ جزوی سطح پر ان دونوں کتابوں کی تعلیمات میں کہیں کہیں یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہیں لیکن اس مماثلت کی وجہ اخذ استفادہ نہیں بلکہ دراصل یہ ایک تیسرا ذریعہ ہے جو کہ دونوں کتابوں کا حقیقی منبع ہے۔

آپ اور ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ منزل من اللہ تمام الہامی صحیفوں اور کتب مقدسہ کا اساسی منشور یعنی توحید تو سب میں یکساں ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام الہامی کتب کا پیغام مشترک ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن کے علاوہ دیگر آسمانی کتابیں ایک محدود وقت تک کے لیے تھیں اس سے پہلے میں اپنے خطاب میں بھی بالوضاحت بتا چکا ہوں کہ گزشتہ کتب ساویہ ایک مخصوص عرصے، مخصوص علاقے اور مخصوص قوم کے لیے تھیں اسی بنا پر وہ اپنی حقیقی حالت میں باقی نہیں پائی جاتیں اور ان میں بوجوہ تحریف و تدلیس کر دی گئی ہے۔ موجودہ دور میں پائی جانے والی اِن کتب مقدسہ میں انسانی تحریفات اور اضافہ جات شامل ہیں۔ چونکہ ان تمام کتب ساویہ کی اصل و بنیاد ایک ہی تھی اس لیے ان میں مشترک باتوں کا وجود ایک قابلِ فہم بات ہے۔ اور ان مشابہتوں یا مماثلتوں کو بنیاد بنا کر یہ کہہ دینا نہایت غیر منطقی طرزِ عمل ہے کہ قرآن مجید میں بائیبل مقدس یا دیگر الہامی کتب سے اخذ و اکتساب کیا گیا ہے۔ الزام کی ایک صورت یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انجیل مقدس سے نقل کر کے قرآن مجید کی تصنیف و تالیف کر دی تھی (معاذ اللہ)۔

اِس بنیاد پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے عہد نامہ قدیم سے نقل کر کے عہد نامہ جدید کو لکھا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی جائے کہ چونکہ ان دونوں میں بہت ساری چیزیں مشترک ہیں اس لیے ایسا ہونا ممکن ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی عہد نامہ قدیم سے اخذ و اکتساب لازماً کیا ہوگا، نعوذ باللہ من ذالک۔ جبکہ حقیقت صرف اور صرف یہ ہے کہ اِن دونوں کتبِ ساویہ کا حقیقی ماخذ و سرچشمہ ایک ہی ہے۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ کوئی شخص نقل کرتا ہے، کسی امتحان میں ایک آدمی کسی دوسرے کی نقل کرتا ہے تو اِس صورت میں کیا وہ اپنے جواب میں اس شخص کا حوالہ دینا پسند کرے گا جس سے وہ نقل

کررہا ہے جبکہ قرآن مجید میں ربِّ قدیر نے بالوضاحت سیدنا موسیٰ کلیم اللہ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام کا ذکرِ خیر فرمایا ہے بلکہ قرآن حکیم تو جمیع انبیائے عظام کا بیان تکریم کے ساتھ کرتا ہے اور اس بات کا مدّعی ہے کہ یہ سب اللہ کریم کے فرستادہ پیغمبر تھے۔ فرض کیجئے اگر قرآن ان ہی انبیاء پر اترنے والے صحائف کی نقل ہوتا تو کم از کم ان کا ذکر کبھی قرآن مجید میں نہ ہوتا۔ یہ بات بطریقِ اَحسن ثابت کرتی ہے کہ قرآن مجید انجیل کی نقل نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کریم کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب ہے۔

ہاں میں اِس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ محض تاریخی حقائق کے بیان سے کسی بھی شخص کے لیے اِس بات کا فیصلہ کرنا مشکل قرار پاسکتا ہے کہ قرآن اور انجیل میں سے کون سی کتاب درست ہے۔ اس لیے ہم اِس ضمن میں سائنسی علوم سے استفادہ کر کے اس بات کا یقین کرسکتے ہیں۔

طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو قرآن مجید اور بائیبل مقدس میں بہت سے واقعات بہت سی باتیں، ڈھیروں قصے اور نکات ایک جیسے معلوم ہوں گے لیکن اگر ذرا گہری نگاہ سے تجزیہ کیا جائے تو دونوں کتابوں میں موجود فرق نکھر کر منظر عام پر آسکتا ہے۔ جیسا کہ انجیل مقدس کی کتاب پیدائش میں بتایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی تھی اور اس سے مراد اسی دنیا کا 24 گھنٹے والا دن ہے جبکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے کہ کائنات کو چھ ایام میں تخلیق کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ○ (الاعراف: 54)

”درحقیقت تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں تخلیق کیا۔“

اسی سے ملتی جلتی بات سورۂ یونس کی آیت نمبر 3 اور بعض دیگر مقاماتِ قرآنی میں بھی بیان کی گئی ہے کہ پروردگارِ عالم نے چھ ایام میں کائنات کی تخلیق فرمائی۔ عربی کا لفظ ”اَیَّام“ حقیقت میں لفظ ”یَوْم“ کی جمع ہے اور اس سے مراد دن بھی لیا جاتا ہے اور ایک لمبی مدت بھی۔ اسی لیے جب چھ ایام سے چھ طویل زمانے یا لمبی مدت مراد لی جائے تو آج کی عصری سائنسی تحقیقات بھی اس دعوے کو تسلیم کرتی ہیں لیکن اس کے برعکس بائبل کا بیان ہے کہ یہ کائنات محض 24 گھنٹوں میں تخلیق کی گئی تھی

اور کوئی بھی سائنسدان اس بیان کی صداقت کی تصدیق نہیں کرے گا۔

بائیبل میں یہ بھی بتایا گیا ہے دن اور رات ان چھ دنوں میں سے پہلے دن ہی تخلیق کر دیئے گئے تھے اور سورج کی تخلیق چوتھے روز ہوئی تھی۔ اَب آپ خود ہی بتائیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سبب تو بعد میں ظاہر ہو جبکہ نتیجہ اور ثمرہ پہلے ہی برآمد ہو جائے آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ روشنی کا ذریعہ سورج ہے سورج نہ ہو تو دن اور رات کا تصور ہی ممکن نہیں جبکہ بائیبل کتاب پیدائش کے آغاز میں اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ روشنی سورج کے وجود میں آنے سے تین دن پہلے تخلیق پا گئی تھی۔ بھلا اِس غیر عقلی اور غیر منطقی بات کو کون سی عقل باور کرے گی۔

اسی طرح یہ بھی ایک غیر علمی، غیر منطقی اور غیر سائنسی دعویٰ ہے کہ دن اور رات کا وجود تو پہلے قائم ہو جائے جبکہ زمین بعد میں تخلیق پائے۔ اور یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ دن اور رات تو حقیقت میں زمین کی گردش کا نتیجہ ہیں اور بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بائیبل کا دعویٰ یہی ہے کہ دن اور رات پہلے بن گئے تھے اور زمین کی تخلیق بعد میں ہوئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں سورج کی تخلیق اور روشنی کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن بائیبل کی طرح قرآن مجید یہ غیر سائنسی اور ناممکن ترکیب سامنے نہیں لاتا۔ آپ کے خیال میں کیسے ہونا چاہیے۔ کیا اب آپ یہ کہنا پسند کریں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں لیں تو بائیبل سے ہی تھیں لیکن ان کی اصلاح وتجدید کر دی لیکن حقیقت کی دنیا میں اِس کا امکان نہیں، تاریخی طور پر ہم جانتے ہیں کہ بعثت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ان باتوں کا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔

بائیبل مقدس میں ایک مقام پر آتا ہے:

> ''خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے...... سو تیسرا دن ہوا...... پس خدا نے دو بڑے بڑے نیّر بنائے ایک نیّر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیّر اصغر کہ رات پر حکم چلائے، اور اس نے ستاروں کی بھی تخلیق کی...... پس چوتھا دن ہوا۔'' (پیدائش 1:20-9)

جبکہ عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات و اکتشافات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمین اور چاند در حقیقت ایک ہی بڑے ستارے کے جزو ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ زمین سورج سے پہلے وجود پا لے۔ لیکن ابھی ابھی بیان کردہ بیانات میں آپ نے ملاحظہ کر لیا ہو گا کہ بائیبل کا

دعویٰ یہی ہے کہ زمین کی تخلیق تیسرے دن ہوئی اور سورج چوتھے دن وجود پذیر ہوا۔

بائیبل میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھلوں والے اشجار کو جو اپنی اپنی جنس کے مطابق نشوونما پائیں اور جو زمین پر اپنے ہی بیج رکھیں، اگائے اور ایسا ہی ہوا۔'' (پیدائش 1:12۔11)

بائیبل کے بیان کے مطابق اگر سورج کی تخلیق چوتھے دن ہوئی تو سورج کی روشنی کے بغیر بھلا پودوں کی نشوونما کیسے ہوسکتی ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ ایک نیر اکبر ہے اور دوسرا نیر اصغر یعنی ایک بڑا روشن جسم ہے جبکہ دوسرا چھوٹا۔ اس بیان کے مطابق بائیبل چاند کو بھی از خود روشن جسم بتا رہی ہے۔ جبکہ قرآن مجید کی سورۃ الفرقان کی ایک آیت مبارکہ کے مطابق چاند کی روشنی اپنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ تو کیا کوئی عقل مند انسان یہ باور کرسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے ان باتوں کو بائیبل سے اخذ کیا اور اس کی تمام سائنسی اغلاط کو درست کردیا۔ معاذ اللہ۔ ایسا کسی صورت بھی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح اگر ہم قصص و واقعات پر نظر ڈالیں جو قرآن مجید اور بائیبل مقدس میں مشترک ہیں تو ان میں بھی ہمیں واضح اور نمایاں فرق ملے گا۔ مثلاً بائیبل سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام زمین پر سب سے پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ ہی بائیبل حضرت آدم علیہ السلام کی زمین پر تشریف آوری کا وقت متعین کردیتی ہے جو کہ آج سے کم و بیش 8500 سال پہلے کا زمانہ قرار پاتا ہے۔ لیکن آج کی سائنسی تحقیقات سے یہ امر مبرہن ہو چکا ہے کہ ہزاروں برس پہلے بھی انسان اِس دھرتی پر موجود تھا۔

بائیبل مقدس سیدنا نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ ان کے زمانے میں آنے والے طوفان کا تذکرہ بھی بائبل میں پایا جاتا ہے اس کے مطابق یہ طوفان پوری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے تھا گویا پوری زمین اِس طوفان کی زد میں آ گئی تھی اور اس پر موجود ہر طرح کی زندگی کا اِس طوفان کی وجہ سے خاتمہ ہو گیا تھا صرف وہی بچ سکے جو سیدنا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے اندازے کے طور پر بائیبل مقدس اِس طوفان کے وقت کا تعین کرکے بتاتی ہے کہ یہ سیدنا مسیح علیہ السلام سے اکیس بائیس صدیوں پہلے کا واقعہ ہے جبکہ آج آثار قدیمہ کے ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں ان کے مطابق اِس طوفان کے وقت مصر پر گیارھواں

خاندان حکمرانی کر رہا تھا جبکہ بابل میں تیسرے خاندان کی حکومت تھی۔ اور پھر ان علاقوں میں بقول بائیبل اِس عالمگیر طوفان کے آثار نہیں پائے جاتے۔ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والی کتاب مقدس قرآن حکیم میں بھی سیدنا نوح علیہ السلام کے طوفان کا تذکرہ ہے لیکن قرآن نے اس کا کوئی وقت متعین نہیں کیا اور یہ بات بھی قرآن ہی بتاتا ہے کہ اس طوفان کی نوعیت عالمگیر طوفان کی نہیں تھی بلکہ یہ ایک مقامی طوفان تھا اور صرف قوم نوح کے علاقے میں آیا تھا اور قرآن کے اِس بیان پر آج کی جدید تحقیقات کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اَب تک جو باتیں، جو دلائل اور جو مسلمہ حقائق میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں ان کی روشنی میں آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ قرآن مجید میں بائیبل مقدس سے اخذ و اکتساب کیا گیا ہے یا نہیں۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ میری اِن معروضات میں آپ کا جواب آپ کو مل گیا ہوگا۔

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ ایک تو سارے کے سارے ہندو گرو رجنیش کو خدا نہیں مانتے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر صاحب سے استفسار کرنا چاہوں گا کہ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ خدائی ہدایت ہر قوم کی طرف بھیجی گئی تھی تو کیا اس سے یہ باور کر لیا جائے کہ وید بھی الہامی کتب یا متونِ مقدسہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

جواب: میرے عزیز دوست نے اپنا سوال دریافت کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت کرنا چاہی ہے کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان نہیں مانتے۔ تو اس پر عرض ہے کہ میں نے اپنے پورے خطاب میں اِس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ سبھی ہندو گرو رجنیش کو بھگوان تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ میری ساری گفتگو آن دی ریکارڈ موجود ہے اور آپ اس گفتگو کی وڈیو ریکارڈنگ دیکھ کر بھی اپنا اطمینان کر سکتے ہیں کہ میں نے کہیں ایسی بات نہیں کی جبکہ میرا دعویٰ تھا کہ کچھ ہندو گرو رجنیش کو خدا قرار دیتے ہیں اور تمام ہندوؤں کے متعلق میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔ مجھے ہندومت اور ہندو دھرم کے مذہبی عقائد کا بخوبی علم ہے اس لیے کہ میں اکثر مقدس کتب کو زیرِ مطالعہ لا چکا ہوں۔ یہ تو تھا آپ کے پہلے سوال کے متعلق میرا جواب۔

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ پاک نے بے شمار انبیاء و رسل مبعوث فرمائے تھے اور بے شمار مقدس صحائف کا نزول بھی فرمایا تو کیا اس صورت میں وید مقدس، شاستروں اور اس کے علاوہ دوسرے مقدس متون کو بھی الہامی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور

کیا میرا یقین ویدوں، شاستروں اور دیگر مذہبی متون پر بھی ہے، کیا دوسرے انبیاء و رسل پر بھی میرا یقین ہے۔ محترم بھائی کا حقیقی سوال یہی بنتا ہے۔ مجھے ان کی بات سے اتفاق ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ (فاطر: 24)

"(اے پیغمبرؐ!) ہم نے آپ ؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔"

ایک اور مقام پر آتا ہے:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد: 7)

"اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔"

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا قرآن مجید کی ان تعلیمات کی روشنی میں میرا اعتقاد ویدوں پر یا ویدوں کے الہامی متون ہونے پر ہے؟ اور کیا دوسرے انبیاء و رسل پر بھی میرا ایمان ہے؟ درحقیقت بات یہ ہے کہ صرف 25 انبیاء کرام کا تذکرہ قرآن مجید میں نام کے ساتھ کیا گیا ہے ان میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت ایوب، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیب، حضرت سلیمان، حضرت داؤد، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ہارون علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل کر کے کل 25 انبیاء کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں جبکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات عالیہ کے مطابق انبیاء و رسل کی کل تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ ان انبیائے عظام میں سے 25 نبیوں کے نام ہم جانتے ہیں جبکہ دوسرے انبیاء کے ضمن میں محض امکانی بات ہو سکتی ہے یعنی ان کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاید پیغمبر خدا تھے یا پھر شاید وہ نبی نہیں تھے۔ گویا ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

اب ہم اِس طرف آتے ہیں کہ کیا میں ویدوں پر اعتقاد رکھتا ہوں؟ اس سلسلے میں سب

سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ قرآن کی تعلیمات اور ویدوں کے متون میں کوئی مماثلت موجود ہے یا نہیں۔ تو میرا کہنا یہ ہے کہ ان میں مطابقت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ویدوں میں ہستی باری تعالیٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یجر وید کے باب نمبر 3 کی آیت نمبر 32 میں آتا ہے کہ:

''تم خدا کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے۔''

پھر اسی یجر وید کے باب 33 کی آیت 3 میں لکھا ہے:

''خدا جسم اور شکل وصورت سے منزہ ہے۔''

اسی طرح یجر وید کے باب نمبر 40 اور آیت نمبر 8 میں بھی اسی میں ملتی جلتی بات بیان ہوئی ہے:

''خدا کا نہ تو جسم ہے اور نہ ہی شکل وصورت۔''

ایک اور مقام پر آتا ہے:

''خدا یکتا وواحد ہے، کوئی دوسرا خدا نہیں ہے، قطعاً نہیں ہے۔''

پھر رگ وید میں جلد نمبر 8، باب نمبر ایک، آیت نمبر ایک میں لکھا ہے:

''ساری کی ساری تعریفیں صرف اسی ذات کے لیے ہیں۔''

ایک اور مقام پر رگ وید کی جلد نمبر 6 باب نمبر 45 کی آیت نمبر 16 میں بیان ہوا ہے:

''صرف ایک ہی خدا ہے، اسی کی پرستش کرو۔''

ویدوں کے سلسلے میں اس نوع کے بیانات تسلیم کرنے میں ہمیں آخر کیا ہچکچاہٹ ہو سکتی ہے۔ ان بیانات کو الہامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ فی زمانہ ہمارے لیے غلط اور درست کی جانچ کے لیے ایک ہی کسوٹی موجود ہے اور وہ کسوٹی قرآن مجید ہے اس لیے قرآن مجید ہی وہ آخری مکمل اور حتمی ضابطۂ حیات ہے اور ہدایت کا ابدی وسرمدی وسیلہ ہے۔ اس بنا پر ان بیانات کو اللہ پاک کی جانب سے نازل شدہ مان لینے میں مسلمانوں کو کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اور باتیں بھی ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے خطاب میں بھی جیسا کہ بیان کیا ہے کہ ان سابقہ صحف سماویہ میں تحریف ہوتی رہی ہے اس لیے ان کتابوں کا کچھ حصہ آسمانی متن بہرحال نہیں ہے اور انسانوں کا تصنیف کردہ ہے۔ اس لیے اس حصے کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ مان لینا ہمارے لیے مشکل ہے۔ جس نوع کے غیر عقلی، غیر علمی اور غیر منطقی بیانات بائبل میں پائے جاتے ہیں اسی نوع کے بیانات ویدوں میں بھی شامل ہیں اس لیے ان پر کلیتاً یقین رکھنا ممکن نہیں ہے البتہ

یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں اِس امکان کو مان لینا چاہیے کہ یہ کتب اپنی حقیقی صورت میں الہامی درجے کی ہوسکتی ہیں۔ انجیل کے متعلق تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اپنی حقیقی شکل میں یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ صحیفہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی بابت قرآن حکیم کی شہادت ہے کہ وہ الہامی صحیفہ ہے جس کا نزول سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا تھا۔

پیغمبروں کے معاملے کو بھی اِسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے دنیا میں بیشک بے شمار پیغمبر آتے رہے۔ جہاں تک رام اور کرشن کی بابت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا وہ بھی خدا کے پیغمبر تھے تو اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نبی ہو بھی سکتے ہیں اور ان کی نبوت کی نفی بھی کی جاسکتی ہے۔ گویا ہم پورے وثوق واعتماد کے ساتھ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے، اسی طرح میں ان لوگوں سے بھی متفق نہیں ہوں جو رام علیہ السلام اور کرشن علیہ السلام کہنے کے رَوادار ہیں۔ یہ بات اصولی طور پر مناسب نہیں۔

ان کے سلسلے میں یہی بات کہنا چاہوں گا کہ ان کی نبوت کا امکان ہے اور اگر ہم فرض کرلیں کہ وہ واقعتا اللہ پاک کے ارسال کردہ نبی یا رسول تھے اور وید بھی حقیقتاً آسمانی صحائف ہیں تو اس صورت میں بھی بات وہی رہتی ہے اور کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ پیغمبر آخر الزماںؐ سے پہلے معبوث ہونے والے تمام پیغمبر کسی خاص قوم، خاص خطّے اور محدود مدت کے لیے نبی یا پیغمبر بن کر آئے تھے۔ ان کی نبوت عالمگیر اور دائمی نہیں تھی۔ بس کرۂ ارض پر قرآن مجید ہی اب وہ واحد کتاب اور اللہ پاک کا نازل کردہ کامل، حتمی اور آخری پیغامِ برحق ہے جو عالمگیر اور آفاقی بھی ہے اور اس کا دائرہ کار سب زمانوں اور تمام اقوام کو محیط ہے۔

جبکہ وید اور انجیل کے سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی حقیقی شکل میں اگر وہ الہامی صحائف تھے بھی تو ان کا دائرہ کار ایک مخصوص مدت تک محدود تھا وہ تمام اقوام، تمام علاقوں اور قیام قیامت تک کے لیے ہرگز نازل نہیں ہوئے تھے اور قرآن مجید اللہ پاک کی نازل کردہ کامل اور آخری الہامی کتاب ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر الزماں کی حیثیت سے معبوث ہوئے۔ اس لیے عصرِ حاضر میں ہمارے لیے قرآن مجید کی تعلیمات اور اسلام کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وپیروی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ امید ہے کہ میری اِن گذارشات سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ خدا کی تخلیق کس نے کی؟

جواب: ایک بہن کی جانب سے سوال سامنے آیا ہے کہ خدا کی تخلیق کس نے کی۔ درحقیقت اس نوع کا سوال خدا بیزار لامذہب اور ملحدین پوچھا کرتے ہیں۔ عقل پسندوں اور دہریوں کا اس سوال پر بڑا زور ہوتا ہے۔ اس سوال کے استفسار پر میرے ذہن میں ایک واقعے کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں میرے ایک گہرے دوست اور قریبی رفیق کار کا ایک عقل پسند سے مکالمہ شروع ہوگیا۔ میرے اس دوست نے اس کو قائل کرنے کے لیے خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیلیں دینا شروع کیں۔ اس نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کپڑا کہاں سے آیا ہے۔ قلم کہاں سے آیا ہے۔ کتاب کہاں سے آئی ہے۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں یہ ثابت کر چکنے کے بعد کہ ان سب چیزوں کا کوئی نہ کوئی بنانے والا اور صانع ہے۔ پھر اس نے سوال کا رخ بدل کر پوچھا کہ بتاؤ سورج کہاں سے آیا ہے۔ چاند کی تخلیق کس نے کی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ یہ بات مان چکے ہیں ہر چیز کسی نہ کسی بنانے والے کے ہاتھوں بن کر ہی وجود میں آئی ہے گویا تمام چیزوں کا خالق اور بنانے والا ہے اور یہ بنانے والا کوئی انسان بھی ہوسکتا ہے اور فیکٹری بھی ہوسکتی ہے اس لیے اب میرے ان سوالات کا جواب فراہم کرو کہ سورج اور چاند کس کی تخلیق ہیں۔ ان کا بنانے والا کون ہے۔

تھوڑی دیر غور و تامل کے بعد اس عقلیت پسند نے جواب دیا کہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی صانع اور بنانے والا موجود ہے لیکن یہاں ہماری ایک شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے اس بیان سے منحرف نہیں ہوں گے یعنی اِس بیان پر ثابت قدم رہیں گے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی صانع اور بنانے والا ہوتا ہے۔ اور اپنے اِس بیان سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

ان کی اِس شرط پر میرے مذکورہ دوست کو بہت خوش ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسی بنا پر اس نے ان سے دوبارہ سوالات کرنے شروع کیے۔ سورج کی تخلیق کس نے کی۔ چاند کس کی تخلیق ہے۔ میری والدہ نے مجھے جنم دیا، میری ماں کو اس کی ماں نے جنا، لیکن اب سوال یہ ہے کہ سب سے اوّلین خالق کون تھا۔

اوّلین خالق اور صانع اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے۔ ہر چیز کی تخلیق اسی نے کی۔ میرا دوست سمجھتا تھا کہ وہ اِس معاملے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس ملحد نے ایک اور سوال داغ دیا اور کہا کہ ہم اللہ پاک کو خدا تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے خالق ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں لیکن

اب بھی ہماری وہی پہلی والی شرط ہے کہ آپ اپنی دلیل سے انحراف نہیں کریں گے۔ اپنا بیان بدلیں گے نہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خالق کون ہے؟

ان کے اِس سوال سے میرا وہ دوست بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ اِس سوال کا کوئی جواب نہ دے پایا اور رات بھر اسی کش مکش میں بیتاب و بیقرار رہ کر گزاری اور اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور سارا ماجرا میرے سامنے بیان کیا۔ اس کی اِس حالت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت کے لیے وہی دلیلیں دے رہا تھا جو عہد ماسبق میں حکماء اور فلسفی استعمال کرتے رہے ہیں۔ چونکہ یہ فلاسفر ایک ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور ایک اہم نکتے کو فراموش کر دیتے ہیں گویا وہ اپنی گفتگو کا صحیح معنی میں تجزیہ نہیں کر پاتے۔

آپ نے میری یہ ساری گفتگو سماعت کی ہے اور میں نے کسی مرحلے پر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مَیں خود مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر ہی میں نے اِس نوع کی کوئی دلیل نہیں دی۔

بلکہ ایک مرتبہ میں نے ایک لامذہب سے یہ سوال کیا تھا کہ کسی بھی چیز کے متعلق معلومات کس کے پاس ہو سکتی ہیں؟ اس نے جواباً کہا کہ ظاہر ہے کہ اس چیز کے موجد اور خالق کے پاس۔ یہ جواب میری طرف سے نہیں دیا گیا تھا بلکہ اسی ملحد کی طرف سے دیا گیا تھا۔

فرض کریں کوئی بھی شخص مجھ سے سوال کرتا ہے کہ:

> ڈاکٹر صاحب! وہ ایسا کون پہلا انسان ہو سکتا ہے جو کسی بھی نامعلوم مشینری کے متعلق ہمیں تفصیلی معلومات بہم پہنچا سکے۔

تو اس سوال کے جواب میں میں اسے کہوں گا کہ کوئی بھی چیز جو بنائی گئی ہے اور جس کا آغاز ہے اس کے متعلق اور اس کے فعال و اعمال کے متعلق معلومات مہیا کرنے والا پہلا انسان اس کا بنانے والا یا صانع ہو سکتا ہے یہاں میں اپنا طرزِ استدلال استعمال کر رہا ہوں کیونکہ میں کسی مشکل کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔ اس لیے جب میں اس نوع کا جواب دیتا ہوں کہ وہ چیز جس کی ایک ابتداء بھی ہوتی ہے، جس کو کسی وقت تخلیق بھی کیا گیا ہے اس کے متعلق حتمی اور کامل علم رکھنے والی اوّلین ہستی اس کے بنانے والے کی ہی ہو سکتی ہے یعنی اس چیز کا خالق ہی اس چیز کے بارے میں پوری طرح سے معلومات فراہم کر سکتا ہے، اس طرزِ استدلال سے قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ کتاب بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

سائنسی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اِس کائنات کا ایک نقطۂ آغاز ہے۔ یہ کسی وقت عدم محض تھی پھر اس کو وجود ملا۔ اسی طرح سورج کی بھی ایک ابتداء ہے۔ چاند کا بھی ایک نقطۂ ابتداء ہے۔ یہاں پہنچ کر ایک اور سوال سر اٹھاتا ہے کہ ان چیزوں کی نوعیت اور ان کے افعال و اعمال کی بابت معلومات کون سی ہستی مہیا کرسکتی ہے تو اس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس۔

آپ کا سوال ہے کہ اللہ پاک کی تخلیق کس نے کی ہے یہ اسی نوع کا سوال ہے جس طرح کوئی آپ سے دریافت کرے:

میرے بھائی ٹام نے ایک بچے کو جنم دیا ہے، اب آپ بتائیں کہ بچہ مذکر ہے یا مؤنث۔

چونکہ میرا پروفیشن طب یعنی ڈاکٹری ہے اس لیے مجھ پر اس سوال کی نامعقولیت سوال سنتے ہی واضح ہوجاتی ہے اور میں بہ آسانی جواب دے سکتا ہوں کہ کوئی بھی مرد بچے کو جنم نہیں دے سکتا اس لیے بچے کی صنف کے متعلق سوال بے معنی اور فضول ہے۔

اسی پر قیاس کرلیں اور اس ضمن میں محتاط رہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کا سوال پوچھنا ہی درست نہیں ہے کہ اللہ کی تخلیق کس نے کی ہے۔ یہ سوال ہی سرے سے نامعقول ہے۔ خدا ہونے کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کوئی اس کا خالق نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

اس گفتگو سے میں امید کرسکتا ہوں کہ آپ نے اپنا جواب اخذ کرلیا ہوگا۔

سوال: بعض مُستشرقین نے اپنی تحریروں میں دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت عربوں کی سماجی فلاح و بہبود اور معاشرتی اِصلاح کے لیے قرآن تصنیف کیا تھا اور اس کے ساتھ الہامی ہونے کا تصور اس لیے وابستہ کردیا کہ اس کی ہردلعزیزی اور مقبولیت میں اضافہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: عزیز بھائی نے ایک سوال پوچھا ہے ان کی اِس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ بعض مُستشرقین کا واقعی یہ دعویٰ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط بیانی سے کام لیا تھا (معاذ اللہ) اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو کلام خداوندی قرار دینے سے اُن کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ عرب کے باشندوں کی اِصلاح کی جاسکے۔ اس ضمن میں سب سے

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین یا مطمحِ نظر محض عربوں کی اصلاح وفلاح تک محدود نہیں تھا بلکہ آپؐ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کی اصلاح کا پروگرام تھا۔ گویا ان کا پروگرام عربوں کے لیے محدود نہیں بلکہ ساری نوع انسانی کے لیے تھا۔

اگر ہم مستشرقین کے اس دعوے کو درست مان لیں تو، پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر آپؐ کے پیشِ نظر صرف عربوں کی اصلاح تھی تو اس مقصد کے لیے آپ غیر اخلاقی وسائل کیوں کس لیے استعمال کر سکتے تھے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی تشکیل و اصلاح غیر اخلاقی بنیادوں پر کیسے ممکن ہے؟ آپ خود سوچیں کہ اگر آپ کسی سوسائٹی یا معاشرے یا قوم کی اصلاح و درستی کا کام کرنا چاہتے ہیں تو کیا آپ اس سلسلے کی ابتداء کذب بیانی اور دروغ بافی سے کرنا پسند کریں گے کذب بیانی اور دروغ بافی سے درحقیقت اسی قماش کے لوگ کام لیتے ہیں جن کے پیشِ نظر محض اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ وہ لوگ بنیادی طور پر غلط کار ہوتے ہیں۔ اس قماش کے لوگ بلاشبہ زبانی کلامی اصلاح وتعمیرِ انسانیت کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے اندر مال و دولت کی حرص وآز موجود ہوتی ہے۔ اور میں اپنے خطاب میں بڑی تفصیل سے اِس بات پر روشنی ڈال چکا ہوں کہ پیغمبر اسلام اُس قسم کی آلائشوں سے مبرا و بے نیاز تھے۔ اس لیے اگر آپ کا مقصد سچ کی ترویج ہے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے آپ کے اختیار کردہ ذرائع بھی مبنی بر حق وصداقت ہونے چاہییں۔

قرآن حکیم میں اس ضمن میں ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۝ (الانعام: 93)

''اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا۔''

فرض کریں اگر پیغمبر اسلام دروغ بافی اور غلط روی سے معاذ اللہ کام لے رہے ہوتے تو

خود وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب میں ایسا کرنے والے کو برا بھلا نہ کہتے بلکہ اس کو تصدیق وتصویب کرتے بلکہ پوری دنیا میں کسی بھی ایسے سچے اور سچے مشن کا حامل ایسا عمل کبھی بھی اختیار نہیں کرے گا کیونکہ آگے چل کر اگر اس کے جھوٹ یا کذب بیانی کا پول کھل جائے گا تو وہ گویا خود اپنے آپ کو ہی برا بھلا کہہ رہا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ٥ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ٥ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ٥ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ٥

(الحاقۃ: 47-43)

"یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا داہاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

چنانچہ اگر پیغمبر آخر الزماںؐ نے ایسی غلط روش خود اپنائی ہوتی تو وہ کبھی قرآن مقدس میں ایسی باتوں کو شامل نہ کرتے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو زندگی کے کسی نہ کسی موقعے پر اس غلط بیانی کے پکڑے جان کا قوی احتمال تھا اور اِس صورت میں ان آیات کی تعلیمات کی کیا وقعت رہ جاتی۔ اسی نوع کی تعلیمات قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں بھی ہیں:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ٥ (الشوریٰ: 24)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مہر کردے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔ وہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔"

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○ (النحل: 105)

”(جھوٹی باتیں نبیؐ نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔“

قرآن مجید کے کئی اور مقامات بھی ایسے ہیں جہاں پر خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض باتوں کی اصلاح کی گئی ہے۔ مستشرقین کے دعوے کے مطابق اگر قرآن مجید خود آنحضرتؐ کی تالیف ہوتی تو پھر اپنے خلاف ایسی باتوں کو وہ کیوں کر اس کتاب میں آنے دیتے۔ اس نوع کی ایک بہترین مثال قرآن مجید کی سورۃ عبس میں موجود ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ○ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ○ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ○ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○ (عبس: 1-10)

”ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالاں کہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔“

اس سورۃ مبارکہ کے نزول کے وقت قریش اور کفار کے کچھ سردار نبی کریمؐ کی مجلس میں موجود تھے اور آپؐ انھیں دین حق کی دعوت دے رہے تھے اس اثناء میں ایک نابینا صحابی رسول حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ اس مجلس میں آ شامل ہوئے اور ان کی وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرے انقباض محسوس فرمایا۔ نبی کریم چونکہ ان سرداروں سے اہم امور پر بات چیت فرما رہے تھے اور حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کو وہاں دخل نہیں دینا چاہیے تھا جس سے اس مجلس میں خلل اور الجھن کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اس پر نبی پاکؐ نے ان کی فہمائش فرمائی، حضرت عبداللہ بن مکتوم کی بجائے اگر کوئی اور شخص مداخلت کر رہا ہوتا اور وہ کیسے ہی مرتبے کا حامل ہوتا تو یہ ایسی بات نہ ہوتی کہ جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ لیکن یہاں بات اللہ کے رسولؐ سے متعلق تھی۔ آپؐ

کا کریمانہ اخلاق اس قدر بلند درجے پر فائز تھا۔ آپؐ بے کس اور نادار لوگوں کے نہایت غمخوار اور خیر خواہ تھے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں۔ اس کے بعد آپؐ کا جب بھی اِن صحابی سے ملنا ہوتا تو اِس بات پر ان کے شکر گذار ہوتے کہ ان کی وجہ سے آپؐ کی اللہ پاک نے اصلاح فرمائی تھی۔ قرآن مجید میں کئی اور مقامات مثلاً سورۃ التحریم، سورۃ النحل، سورۃ الانفال میں بھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض عرب کے لوگوں کی معاشرتی اور سماجی اصلاح اور اخلاقی حالت درست کرنے کے لیے قرآن خود لکھ لیا تھا تو ظاہر بات ہے اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بار نہ پاسکتیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے سوال کا جواب پالیا ہوگا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے خطاب میں بہت سارے سائنسی حقائق کا ذکر کیا ہے جو کہ قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید میں ریاضی کے علوم کے بارے میں بھی کچھ پایا جاتا ہے؟

جواب: ایک عزیز بہن نے میرے خطاب کے حوالے سے سوال کیا ہے کہ میں نے بہت سے سائنسی حقائق و اکتشافات کے ضمن میں گفتگو کی ہے کہ جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے تو کیا کچھ ریاضیاتی علوم بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یعنی کیا قرآن مجید میں علم ریاضی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تو اس سوال کے جواب میں میں کہنا چاہوں گا کہ جی ہاں قرآن مجید نے بہت سے ایسے امور کا تذکرہ کیا ہے جن کا ریاضی سے ربط وضبط ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہم یونانی فلسفی ارسطو کے اس نظریے کی بابت کچھ گفتگو کرتے ہیں کہ اس نے کہا تھا کہ ہر بیان یا تو صحیح ہوگا یا پھر غلط ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر بیان کے غلط ہونے کا بھی امکان ہوتا ہے اور صحیح ہونے کا بھی۔ سالوں پر سال بیت گئے اور لوگ ارسطو کے اِس کلیے کو مانتے چلے آرہے ہیں۔ آج سے ایک صدی پیشتر تک اس اصول کی صحت پر لوگوں کا اعتقاد تھا۔ جبکہ ایک سو سال پہلے کسی شخص نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر ہر بیان میں غلط اور صحیح ہونے کا احتمال ہے تو پھر ارسطو کا یہ بیان بھی اِس کلیے کی زد میں آتا ہے۔ یعنی اس کا یہ بیان یا تو غلط ہوگا، یا پھر درست۔ اگر تو اس کا یہ کلیہ درست ہے تو پھر تو ٹھیک ہے ورنہ دوسری صورت میں تو ریاضی کی پوری عمارت ہی مسمار ہو جائے گی۔

اس نئے سوال کے سامنے آنے کے بعد ماہرین ریاضی نے ایک نیا کلیہ وضع کیا۔ اب انہوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ جب بھی کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کے دو ممکنہ مطلب

ہو سکتے ہیں۔ان میں سے ایک تو لغوی معنی ہوگا جبکہ دوسرا اصطلاحی معنی۔ بسا اوقات آپ کی گفتگو کسی لفظ ہی کے سلسلے میں ہو رہی ہوتی ہے اور اس کے معنی کے بارے میں نہیں ہو رہی ہوتی۔اس ضمن میں ایک مثال پیش خدمت ہے۔فرض کریں ایک بچہ ہے جس کا نام اکبر ہے۔اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ:

''اکبر چھوٹا ہے۔''

یہاں میں معنی کے اعتبار سے قطعاً درست بات کہہ رہا ہوں کہ اکبر ایک چھوٹا لڑکا ہے لہٰذا یہ بیان درست ہے کہ اکبر ایک چھوٹا لڑکا ہے۔جبکہ کوئی عربی زبان کا ماہر میری اس بات پر معترض ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اکبر چھوٹا نہیں ہے بلکہ اکبر بڑا ہے اس لیے کہ اکبر کا معنی ہی بڑا ہے۔اب یہاں پر میں تو محض ایک لفظ کا ذکر کر رہا تھا اس کا استعمال میرے پیش نظر نہیں تھا۔اسی طرح ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔فرض کریں کہ میں بیان دیتا ہوں کہ:

''3 ہمیشہ 4 چار سے پہلے ہی آیا کرتا ہے۔''

میری اِس بات پر کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ میں نے ایک صحیح بات کی ہے اور واقعات کی دنیا میں بھی ایسا ہی ہے کہ 3 ہمیشہ چار سے پہلے ہی آتا ہے۔لیکن کوئی متشکک مزاج انسان اِس پر بھی اعتراض جڑ دیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ انگریزی لغت کی رُو سے Three بالعموم Four کے بعد آتا ہے۔اس لیے کہ حرف T ہمیشہ صرف F کے بعد ہی آتا ہے۔یہاں معاملے نے برعکس صورت اختیار کر لی ہے۔میں ایک لفظ استعمال کے پہلو سے برت رہا ہوں جبکہ معترض ایک ایسی مثال دے رہا ہے جس محض ذکر ہوا ہے اور اس کا استعمال نہیں ہوا۔

گویا جب کبھی بھی آپ ایک لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس کی دو امکانی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو آپ اس لفظ کا ذکر کر رہے ہوں گے یا پھر اس لفظ کو برت رہے ہوں گے۔ میں نے اپنے خطاب میں سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ آپ کے سامنے رکھی تھی:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ○ (النساء: 82)

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

اب اس آیت مبارکہ کا مفہوم بالکل واضح ہے اور آج تک کوئی بھی معترض قرآن میں اختلافِ مطالب کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یعنی قرآن اللہ پاک کا ہی کلام ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ فرض کریں کہ ایک معترض یہاں بھی اعتراض داغ دیتا ہے کہ میں تم کو قرآن پاک میں اختلاف ثابت کر کے دکھا سکتا ہوں۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ اچھا بتاؤ کہ کہاں اختلاف ہے تو وہ جواباً کہتا ہے کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر 82 میں ''اختلاف'' کا لفظ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر قرآن کا دعویٰ غلط ٹھہرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معترض کے اعتراض کے مطابق ''اختلاف'' کا لفظ تو واقعتاً قرآن مجید میں موجود ہے تو کیا اس صورت میں یہ کوئی حقیقی غلطی ہے (معاذ اللہ) اِس مقام پر میں اُسے کہنا چاہوں گا کہ نہیں ٹھہرو پہلے اس آیت کو غور سے پڑھو کہ یہاں یہ بات ہو رہی ہے کہ بہت سے اختلاف ہوتے، جب کہ دوسری جانب تم صرف ایک جگہ پر اختلاف کا لفظ سامنے لا رہے ہو۔ تو گویا اِس صورت میں قرآن کا بیان ہی سچا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں تو بہت سے اختلافات کی بات ہو رہی ہے جبکہ اختلاف کا لفظ قرآن مجید میں ایک مرتبہ ہی برتا گیا ہے زیادہ تعداد میں نہیں برتا گیا۔

پھر بھی اِس طرزِ استدلال سے میں اس کا جواب دینے سے قاصر رہوں گا۔ کیونکہ کوئی دوسرا معترض سر اٹھائے گا اور شور برپا کرے گا کہ دیکھو قرآن میں تو یہ بات ہو رہی ہے کہ اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں ''اختلافاً کثیراً'' موجود ہوتے اور آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ ''اختلافاً کثیراً'' کے الفاظ قرآن کی اس آیت میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ثابت ہوا کہ قرآن منجانب اللہ نہیں ہے (معاذ اللہ) معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ یہاں بات ذرا گنجلک ہوگئی ہے اور اس کا سمجھنا ذرا دشوار ہو گیا ہے اس لیے میں آپ کے سامنے ایک آسان اور سہل مثال رکھتا ہوں۔ بات چونکہ مذکورہ صدر آیت مبارکہ کے ضمن میں ہو رہی تھی۔ اور اِس آیت مبارکہ میں ایسا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا کہ اگر قرآن میں کثیر اختلاف ہوں تو یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ بلکہ بات یوں ہو رہی ہے کہ:

''اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو اِس میں کثیر اختلافات ہوتے۔''

اور اِسی بنا پر معترضین کا طرز استدلال درست نہیں۔ پہلی شکل میں ان کا طرز استدلال صحیح قرار پا سکتا تھا جبکہ اللہ پاک نے بات اِس طور پر بیان ہی نہیں فرمائی اور اوپر بیان کردہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک ہی بات ہرگز نہیں ہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے اس نئی مثال کو پیش نظر رکھیں:

''بمبئی کے تمام باشندے ہندوستانی ہیں''

اگر چہ یہ ایک صدفی صد سچا بیان ہے لیکن اگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ:

''سارے کے سارے ہندوستانی بمبئی میں رہائش پذیر ہیں''

تو اِس صورت میں یہ نتیجہ نادرست ٹھہرے گا۔ کسی بھی بیان کی الٹ صورت عموماً غلط ہوتی ہے بسا اوقات ایسی صورت بھی صحیح ہو سکتی ہے لیکن بعض اوقات نہیں بھی ہوتی۔

میں اپنی اِس بات کی وضاحت ایک سادہ سی مثال سے کرنا چاہوں گا۔ قرآن پاک میں آتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ

o (المومنون: 2۔1)

''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

اس آیت کو پڑھ کر ایک شخص اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب میں ایک ایسے مسلمان نمازی سے واقف ہوں جو پانچ وقت خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ فریبی اور مکار ہے۔ لوگوں کے مال و دولت کو ناجائز لوٹتا ہے ہر معاشرے میں اس طرح کی کالی بھیڑوں کا وجود ہوتا ہے لیکن آپ غور کریں گے تو آپ کو لگے گا کہ قرآن مجید کا دعویٰ غلط ثبوت ہو رہا ہے کیونکہ قرآن مجید کی رُو سے ایک سچا مسلمان اور حقیقی مومن اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اختیار کرتا ہے:

اس کے اِس اعتراض کا میں اسے جواب یہ دوں گا کہ تم قرآن کی عبارت کا غور سے مطالعہ کرو۔ قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ حقیقی مومن اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور یہ تو وہ نہیں کہہ رہا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والا ہر شخص نجات یافتہ مسلمان ہے۔ اگر قرآن کا دعویٰ یہ ہوتا کہ نمازوں میں خشیت اختیار کرنے والے سبھی مومنین نجات یافتہ ہیں تو اِس صورت میں قرآن کا دعویٰ غلط ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ریاضی کا علم سب سے زیادہ رکھنے والی ذات ہے اس کے ازلی علم میں ہے کہ ایسے ایسے متشککین اٹھیں گے کہ جن کا کام ہی قرآن پاک سے غلطیوں کی تلاش ہوگا۔ اسی لیے

قرآن مجید چیدہ چیدہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح میں ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ○ (آل عمران: 59)

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔''

اس آیت کریمہ کا مفہوم نہایت واضح ہے۔ اس میں اس سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں کو اللہ پاک نے مٹی سے خلق فرمایا، اس کے معانی بالکل واضح، بین اور واشگاف ہیں لیکن اگر ایک اور پہلو سے غور کریں تو یہ بات بھی ہے کہ قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم علیہما اسلام دونوں کا ذکر خیر 25، 25 مرتبہ ہوا ہے۔ یعنی اپنے مفہوم کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں تو دونوں کا ذکر بھی مساوی تعداد میں ہوا۔ اس نوع کی بے شمار مثالیں قرآن پاک میں پائی جاتی ہیں۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا○

(الاعراف: 176)

''اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشِ نفس کے ہی پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو پھر بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔''

آیاتِ قرآنیہ کے جھٹلائے جانے کے متعلق قرآن مجید میں پانچ دفعہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور کتے کے لیے عربی زبان کے لفظ کلب کا استعمال بھی پانچ مرتبہ ہی آیا ہے گویا کہ مشبہ اور

مشبہ بہ کی اگر معنوی حیثیت مساوی ہے تو ان کا ذکر بھی یکساں تعداد میں کیا گیا ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں آتا ہے:

وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ (فاطر: 20)

''اور نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔''

عرب اندھیرے کے لیے ''ظلمات'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور روشنی کے لیے نور کا لفظ مستعمل ہے۔ظلمت کا لفظ قرآن مجید میں 24 بار آیا ہے جبکہ نور کا لفظ 23 مرتبہ آیا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ نہ صرف یہ دونوں الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے یکساں ہیں بلکہ ان کا ذکر بھی یکساں تعداد میں نہیں کیا گیا۔دونوں میں برابری نہیں ہے اس لیے 23 اور 24 برابر نہیں ہیں۔قرآن مجید نے جن چیزوں کو ایک گردانا ان کا تذکرہ بھی یکساں تعداد میں کیا اور جن کو مختلف سمجھا ان کا تذکرہ بھی مختلف ہے۔

مجھے کامل امید ہے آپ نے اپنے مطلوبہ سوال کا جواب پالیا ہوگا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب قرآن مجید میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے قلوب پر مہر ثبت کر دیتا ہے لیکن علمی سطح پر یہ بات ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ سوچنا دل کا فعل نہیں بلکہ دماغ کا کام ہے۔اس ضمن میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے۔

جواب: عزیز بہن نے نہایت عمدہ سوال کیا ہے۔اس نے اپنے سوال سے پہلے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے حال میں ہی اسلام قبول کیا ہے۔اس لیے میں سب سے پہلے تو اپنی عزیز بہن کو تین مرتبہ مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا۔ان کا سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ بعض لوگوں کے قلوب پر مہر لگا دی جاتی ہے اور اس طرح لوگوں کے ہدایت حاصل کرنے اور اصلاح یاب ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

مجھے اِس بات سے اتفاق ہے کہ واقعی قرآن میں اِس طرح کی آیات پائی جاتی ہیں۔

پھر انہوں نے سائنسی تحقیقات کے حوالے سے بتایا ہے کہ غور وفکر اور سوچنے کا فعل دل سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ دماغ کا ہوتا ہے تو پھر اس صورت میں قرآن دل کی بابت کیوں ایسی بات کر رہا ہے۔

دراصل ماضی بعید میں لوگوں کا یہی نظریہ تھا کہ سوچنے کا کام دل کے ذمے ہے تو اِس

صورت میں کیا قرآن مجید کی ان آیات میں معاذ اللہ کوئی غلطی در آئی ہے نہیں ایسی بات ہرگز نہیں۔ بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت مبارکہ میں ارشاد ربانی ہے:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ○ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ○
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ○ يَفْقَهُوا قَوْلِي ○

(طٰهٰ: 25تا28)

''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

اس آیت کریمہ میں بھی یہی آرزو کی جارہی ہے کہ میرا سینہ یعنی دل کھول دے۔ حقیقت میں بات یہ ہے کہ عربی کے لفظ ''صدر'' سے ایک تو سینہ مراد ہوتا ہے اور دوسرے مرکز یعنی لفظ صدر کا ایک مفہوم مرکز بھی ہے۔ اگر آپ کبھی کراچی تشریف لے جائیں تو وہاں کراچی صدر کا علاقہ آپ دیکھیں گے۔ کراچی صدر کا مطلب ہے کراچی کا مرکزی مقام۔ یعنی اِس لفظ سے مراد مرکز ہے۔ پس قرآن بھی اپنے مخاطبین کو یہی باور کروا رہا ہے کہ منکرین حق کے سوچنے سمجھنے کے مرکز پر مہر لگا دی جاتی ہے، اس مرکز سے دماغ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ اسی بنا پر میں دعا کرتا ہوں کہ میرے خالق میرے فہم وادراک کے مرکز کو کشادہ کردے۔

مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے سوال کا جواب پالیا ہوگا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب قرآن مجید میں کئی مقامات پر ابلیس کو جن قرار دیا گیا ہے اور کہیں اس کو فرشتہ بھی کہا ہے۔ کیا اِس میں تضاد نہیں پایا جاتا؟

جواب: عزیز بھائی نے دریافت کیا ہے کہ قرآن میں کئی مقامات پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا ہے اور پھر کسی دوسرے مقام پر قرآن نے اسے جن بھی قرار دیا ہے تو کیا قرآنِ حکیم کے ان بیانات میں تضاد نہیں ہے؟ محترم بھائی دراصل قرآن مجید نے کئی ایک مواقع پر سیدنا آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ قرآن کی متعدد سورتوں میں اس واقعے کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ، سورۂ اعراف، سورہ حجر، سورہ بنی اسرائیل، سورہ طٰہٰ، سورہ صٓ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مقامات پر یہ بات دھرائی گئی ہے کہ جب فرشتوں کو حکم ہوا

کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو ابلیس کے علاوہ سب جھک گئے فقط ابلیس ہی انکارِ حکمِ ربانی کا مرتکب ہوا۔ مذکورہ بالا تمام سورتوں میں اسی بات کا بیان ہوا ہے جبکہ ایک جگہ پر اس کو جن بھی کہا گیا ہے اور اسی کے پیش نظر بھائی نے سوال بھی اٹھایا ہے۔ انہوں نے متعلقہ سورۃ کا حوالہ نہیں دیا جبکہ یہ آیت سورہ کہف میں آئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؀

(الکہف: 50)

"یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا، اس لیے اپنے پروردگار کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔"

اس قرآنی آیت میں ابلیس کو جن کہا گیا ہے لہٰذا یہاں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر مقامات پر ابلیس کا تذکرہ فرشتوں کی حیثیت میں کیا گیا ہے جبکہ اس مقام پر اس کو جن قرار دیا گیا ہے تو کیا یہ اختلاف اور تضاد کی صورت نہیں ہے؟

برادران عزیز! ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے انگریزی ترجمے پڑھتے ہیں اور ان تراجم کی معاونت سے قرآن کا فہم حاصل کرتے ہیں جبکہ قرآن کا نزول عربی کی لسانِ مبین میں ہوا تھا۔ عربی زبان میں ایک قاعدہ پایا جاتا ہے جو "تغلیب" کے نام سے موسوم ہے "تغلیب" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب آپ کسی جگہ اکثریت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس میں اقلیت کا شمول خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کریں کہ آپ ایک اکثریت سے خطاب کر رہے ہیں تو اقلیت کو بھی اس اکثریت میں شامل تصور کیا جائے گا۔ مثلاً کسی جماعت میں ایک سو طلباء ہیں۔ ان طلباء میں 99 لڑکے ہیں اور ایک طالبہ ہے یعنی لڑکی۔ اب اگر کوئی ان کو عربی زبان میں کہے کہ:

"لڑکو کھڑے ہو جاؤ۔"

اس حکم کو سن کر وہ لڑکی بھی کھڑی ہو جائے گی کیونکہ تغلیب کا اصول اُس کے پیش نظر ہوگا۔ برعکس طور پر میں اگر ان طلبا سے انگلش زبان میں کہوں کہ

"All boys stand up"

تو اس صورت میں محض لڑکے ہی کلاس میں کھڑے ہوں گے جبکہ وہ لڑکی اپنی نشست پر بیٹھی رہے گی۔ اس لیے کہ انگلش زبان میں تغلیب کا قاعدہ نہیں پایا جاتا۔

چونکہ قرآن مجید کا نزول عربی زبان میں ہوا تھا اور عربی زبان میں جب ملائکہ کو آدم کے سامنے جھک جانے کے لیے کہا گیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اکثریت تو ملائکہ کی ہی تھی۔ ابلیس فرشتہ تھا یا جن یہ بات یہاں زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس حکم میں بھی شامل تھے۔

اسی لیے اِن ساری آیات کریمہ میں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ وہ جن تھا یا پھر فرشتہ۔ اس لیے کہ تغلیب کے قانون کے مطابق یہ حکم سب کے لیے تھا اور سب اس حکم پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ لیکن ایک سورۃ یعنی کہف میں یہ بات بھی بیان کردی گئی کہ وہ جنس کے اعتبار سے فرشتہ نہیں تھا بلکہ جن تھا۔

اس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ فرشتے چونکہ آزاد مرضی کے مالک نہیں ہوتے۔ ان کے لیے اپنے خالق و مالک کے ہر حکم کی تعمیل ضروری ہوتی ہے اور وہ بھی بلا چون وچرا۔ دوسری طرف جن ایک آزاد ارادہ رکھنے والی مخلوق ہے۔ اس سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ابلیس جِنات میں سے تھا اور فرشتہ نہیں تھا۔

امید کرتا ہوں کہ میری اِس گفتگو میں آپ کے سوال کا جواب آگیا ہوگا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ہمارا ایمان ہے کہ خدا کی ہستی مافوق الفطرت ہے اور اس کی قدرت کاملہ تمام امور پر حاوی ہے یعنی وہ ذات قادر مطلق ہے تو پھر اللہ پاک انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتے؟

جواب: عزیز بہن نے دریافت فرمایا ہے کہ اللہ کی ذات مافوق الفطرت بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں نہیں اختیار کر سکتا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو خدا کی ذات پر پختہ اعتقاد رکھتے ہیں وہ بھی یہی بات کرتے ہیں کہ اللہ مافوق الفطرت ہے۔ بالعموم دنیا میں جتنے لوگ بھی خدا پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ خدا کو مافوق الفطرت ہستی قرار دیتے ہیں۔ یہاں فطری طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی ذات واقعتاً مافوق الفطرت ہے۔ اللہ پاک کو مافوق الفطرت قرار دینے کا مطلب تو یہی ہے کہ خدا ایک چیز ہے اور اسی طرح فطرت ایک دوسری چیز ہے کہ جس پر خدا تعالیٰ کو فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن وسنت کے تصور خدا کے مطابق اللہ پاک

کو مافوق الفطرت قرار دینا ایک صریح غلطی ہے۔اس لیے کہ فطرت تو خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس خالق ہے جس نے اِس فطرت کو پیدا فرمایا ہے اس لیے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فطرت کا تقاضا کچھ اور ہو جبکہ اللہ کی مشیت کچھ اور۔

انسان کی فطرت کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔اللہ پاک کے متبرک ناموں میں سے ایک نام ''فاطر'' بھی ہے۔اور اِسی نام کی ایک سورہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔فاطر کا لفظ فطرت سے ماخوذ ہے۔اس کا معنی ہے پیدا کرنے والا، بنانے والا، فطرت عطا کرنے والا، تخلیق کرنے والا اور مخلوقات کی حقیقی فطرت وضع فرمانے والا۔

روزوں کے مہینے میں ہم مغرب کے وقت روزہ افطار کرتے ہیں گویا روزہ توڑ دیتے ہیں۔افطار کا معنی ہے روزے کو توڑ دینا۔فاطر کا مفہوم ہے خالق، چیزوں کو بنانے والا، صورتیں اور شکلیں عطا کرنے والا، فطرت عنایت فرمانے والا۔

انسانوں سے قرآن کا مطالبہ ہے مظاہر فطرت پر تدبر و تفکر کرو، سورج اور چاند کی حرکت پر غور وفکر کرو، یہ سب مخلوقات فطرت کے قوانین کی مطیع و منقاد ہیں، ان میں سے کوئی بھی اپنے مدار اور محور سے باہر نہیں نکلتا۔ بعینہٖ اسی طرح اللہ پاک کا تصور بھی ایک فطری داعیہ ہے جو انسان میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب: 62)

''اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

پھر سورۂ روم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ (الروم: 30)

''قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ پاک نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے۔اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔''

عصرِ حاضر میں کوانٹم فزکس اور جدید سائنسی اکتشافات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کسی دیکھنے والے کی عدم موجودگی میں کسی چیز کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔اسی طرح اِس کائنات کو بھی فضول اور

لایعنی قرار دینا پڑتا ہے اگر اس پر کوئی نظر رکھنے والی ذات موجود نہ ہو۔ اللہ پاک کا ایک نام "الشہید" بھی ہے یعنی شاہد اور گواہ۔ گویا اللہ پاک مافوق الفطرت نہیں بلکہ فطری ہے۔

اب میں اِس سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں کہ خدا اگر قادر ہے تو پھر وہ انسانی قالب کیوں نہیں اختیار کر سکتا؟

میں اس سوال کی تفہیم کے لیے خدا کی ذات پر ایمان رکھنے والوں سے ایک سوال پوچھا کرتا ہوں تاکہ ان کے لیے خدائے پاک کا تصور زیادہ نمایاں ہو سکے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہر چیز کو تخلیق کر سکتا ہے؟

وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پیدا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میرا ان سے سوال ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہاں اللہ ہر چیز کو فنا بھی کر سکتا ہے۔ پھر میں ان سے تیسرا سوال کرتا ہوں کہ

کیا اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو بنانے پر قادر جس کو وہ فنا نہ کر سکے؟

اس سوال پر وہ مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں کہ خدا کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جس کو وہ فنا نہ کر سکے تو اس سے مراد یہ ہوئی کہ وہ اپنے سابقہ بیان کا استرداد کر رہے ہیں یعنی یہ کہ اللہ پاک ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ نفی میں جواب دیں گے یعنی اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کر سکتا جسے وہ فنا بھی کر سکے تو اس صورت میں وہ اپنے پہلے بیان کی تردید کر رہے ہوتے ہیں کہ اللہ ہر چیز بنانے پر قادر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ وہ منطقی طرز پر غور و فکر نہیں کر رہے ہوتے۔ بہت سے امور ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نہیں کر سکتا۔ اللہ پاک ایک بلند قامت ٹھگنا انسان نہیں بنا سکتا کیونکہ آدمی یا تو لمبے قد کا ہوگا یا ٹھگنے قد کا۔ اللہ تعالیٰ چھوٹے قد والے کو لمبا قد دے سکتا ہے لیکن اِس صورت میں وہ ٹھگنا نہیں رہے گا۔ اسی طرح اللہ پاک لمبے قد والے کو ٹھگنا بنا سکتا ہے لیکن اِس طرح وہ بلند قامت نہیں رہے گا بلکہ پست قامت کہلائے گا۔ یا اللہ پاک اس کا قد درمیانہ بنا سکتے ہیں جو نہ تو زیادہ لمبا ہوگا نہ ہی بہت پست لیکن اللہ پاک کسی انسان کو طویل القامت ٹھگنا بنانے پر قادر نہیں۔

اسی نوع کے لاتعداد کام ہیں جو اللہ پاک نہیں کر سکتا۔ اللہ پاک عدل کے منافی کوئی کام

نہیں کر سکتے، اللہ پاک معاذ اللہ کذب بیانی نہین کر سکتے۔ اللہ یہ تمام امور انجام نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ خدا ہونے کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا، وہ ذات ظلم و جبر نہیں کر سکتی اور نہ ہی نسیان و خطا کا شکار ہو سکتی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ یہ پوری کائنات اللہ پاک کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے موت دے سکتا ہے، فنا کر سکتا ہے، ختم کر سکتا ہے جبکہ مجھے کسی ایسے مقام پر نہیں بھیج سکتا جہاں پروردگار عالم کا حکم نہ چلتا ہو۔ اللہ مجھے نیست و نابود کر سکتا ہے لیکن اپنی خدائی سے باہر نہیں بھیج سکتا۔ اس لیے کہ سب کا سب اسی کا ہے اور کائنات کی ہر چیز اور ہر مقام اس کی خدائی میں شامل ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

قرآن مجید کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے کوئی بھی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں دہرا دہرا کر کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں، سورۃ آل عمران، سورۃ فاطر میں غرض متعدد مقامات پر اس آیت کریمہ کو دہرایا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

یعنی ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

گویا پورے قرآن میں کہیں نہیں فرمایا گیا کہ اللہ پاک ہر کام کر سکتا ہے تو میرے محترم! ''اللہ ہر کام کر سکتا ہے'' اور ''اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے'' ان دونوں جملوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔

قرآن مجید تو بلکہ کہتا ہے کہ

فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ (البروج: 16)

''وہ جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔''

گویا اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے، جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے اُسی کو انجام دیتا ہے۔ جبکہ اللہ پاک صرف افعالِ الٰہیہ کا ارادہ فرماتے ہیں یعنی وہ کام جو اللہ پاک کی شانِ الوہیت کے مطابق ہوں اور ایسے کام نہیں کرتا جو اللہ پاک کی شانِ بلند سے کم درجے کے ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کا بنیادی

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی قالب کیوں نہیں اپنا سکتا؟ اللہ پاک کے انسانی قالب اختیار کرنے کو تناسخ یا حلول کہتے ہیں اور اِس عقیدے کے قائلین نے اس کے جواز کے لیے اپنی جانب سے ایک نہایت دل نشین منطق بنا رکھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ قافلۂ انسانی کی دستگیری اور رُشد و ہدایت کے لیے، انسانوں کے دکھ، تکالیف، پریشانیاں اور مسائل و مشکلات کے اِدراک کے لیے انسانی قالب اختیار کرتا ہے تاکہ اس کو معلوم ہو سکے کہ جب آپ دکھی ہوتے ہیں تو کیسا محسوس کرتے ہیں، جب آپ خوش ہوتے ہیں تو آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ اس طرح اللہ پاک انسانوں کے لیے احکامِ امر و نہی کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کو حلول یا تناسخ کا عقیدہ کہتے ہیں۔

جبکہ اگر تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی اختیار کردہ یہ منطق نہایت بودی ہے، فرض کریں میں کسی چیز کو بناتا ہوں۔ فرض کرلیں کہ میں ٹی وی یا ٹیپ ریکارڈ تیار کرتا ہوں۔ اب اس کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ٹیپ یا ٹی وی کے لیے کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری تو اِس صورت میں مجھے خود ٹیپ یا ٹی وی کی شکل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں ہدایتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھ دوں گا کہ ان دونوں چیزوں کو استعمال کرنے کا طریق کار کیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ میں کیسٹ کیسے ڈال سکتے ہیں کس بٹن سے یہ چلتی ہے اور کون سا بٹن دبائیں تو یہ رُک جائے گی۔ اِس بٹن سے کیسٹ آگے چلے گی اور دوسرے سے پیچھے ہٹے گی۔

اِسی طرح کا معاملہ اللہ تعالیٰ کا انسانوں کے ساتھ ہے کہ ان کی رشد و ہدایت کے لیے اللہ پاک کو خود انسانی روپ اختیار کرنے کی حاجت نہیں بلکہ ان کو ان کی بھلائی اور برائی اور اچھے برے کاموں سے آگاہ کرنے کے لیے ان انسانوں میں سے ہی کسی ایک برگزیدہ انسان کو چُن لیتا ہے اور پھر اس کی معرفت انھیں ہدایتی کتابچہ فراہم کر دیتا ہے۔

اس کتاب کی نوعیت کیسی ہو سکتی ہے۔ دُور نہ جائیں تو آپ کو بتاؤں کہ قرآن پاک ہی وہ کتابِ ہدایت ہے جس کی وساطت سے انسانوں کو زندگی گزارنے کے لیے احکام کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان کو بتا دیا گیا ہے کہ ان کے حق میں کون سا کام مفید ہے اور کون سا مضرت رساں۔ گویا اِس کلامِ برحق (قرآن مجید) کی صورت میں ان کو ہدایت کا مکمل سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے انسانوں کی ہدایت یا اُن کے مسائل کے ادراک کے لیے اللہ پاک کو انسانی قالب میں آنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

آپ کا سوال اِس طرح ہے کہ

"کیا اللہ پاک انسانی قالب اختیار کر سکتے ہیں؟"

میرا جواب ہے کہ ہاں وہ ذات ایسا کر سکتی ہے مگر جب وہ انسان کا روپ اپنائے گا تو اِس صورت میں وہ خدا نہیں رہے گا اس لیے کہ انسان تو فنا ہو جانے والی مخلوق ہے جبکہ اللہ پاک حیی قیوم ہے جو ازل سے ابد تک باقی رہے گا۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر کوئی واحد ہستی ایک ہی وقت میں فانی اور لافانی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر انسانوں کے ساتھ ضرورتیں اور حاجات لگی ہوئی ہیں جیسا کہ ان کو اکل وشرب کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ پاک کا ارشاد پاک ہے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ (الانعام: 14)

"کہو اللہ کو چھوڑ کر میں کسی اور کو اپنا سر پرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے، جو روزی دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔"

کھانے پینے اور رزق کی حاجت تمام انسانوں کے ساتھ لگی ہوئی ہے لیکن کیا اللہ پاک کو بھی اِن چیزوں کی ضرورت ہے۔ قطعاً نہیں۔ انسان کو آرام کرنے، سونے اور نیند کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن پاک میں آتا ہے کہ:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

(البقرہ: 255)

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔"

دوسری طرف انسان تو سوتا بھی ہے اور آرام بھی کرتا ہے، اُسے تھکاوٹ بھی ہو جاتی ہے اور اونگھ بھی آتی ہے۔ اس کے ساتھ کھانے پینے کی حاجتیں وابستہ ہیں جب آپ اللہ کے لیے انسانی قالب اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں یا پھر اُسے مافوق الفطرت قرار دیتے ہیں تو گویا آپ دہریئے اور مذہب بیزار شخص کے ہاتھ میں وہ لاٹھی دے دیتے ہیں جس سے وہ آپ کی پٹائی کر سکتا ہے۔ اس لیے اللہ پاک کو مافوق الفطرت کہنا درست رویہ نہیں بلکہ وہ ذات تو عین فطری ہے اور وہ کسی صورت انسانی قالب اختیار نہیں کر سکتی۔

اس وضاحت سے امید ہے آپ نے اپنا مطلوبہ جواب پالیا ہوگا۔

سوال: میں کرسچین ہوں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ انھیں آسمان پر اٹھالیا گیا تھا لیکن مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے قدرت خداوندی کے معجزے کے طور پر پیدا ہوئے تھے۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مقامِ الوہیت پر فائز نہیں بھی ہیں تو اس صورت میں بھی وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل و برتر ہیں۔ تو پھر آپ اسلامی تعلیمات کے ساتھ سیدنا مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا ابلاغ کیوں نہیں کرتے؟

جواب: ایک کرسچین بھائی نے نہایت اچھا سوال کیا ہے؟ سوال اگرچہ اہم ہے لیکن اس نوع کے سوالات عام طور پر عیسائی مشنریوں اور مذہبی پادریوں کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں۔ مجھے ان بھائی کے بارے میں جنھوں نے سوال دریافت کیا ہے علم نہیں کہ وہ مشنری ہیں یا نہیں لیکن میرا سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ اس نوع کے سوالات اکثر انھی لوگوں کی جانب سے کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چند باتیں کی ہیں مثلاً یہ کہ آپ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا یا پھر یہ کہ ان کی ولادت بغیر باپ کے معجزانہ طور پر ہوئی تھی جبکہ دوسری جانب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تو آسمان کی طرف اٹھایا گیا اور نہ ہی ان کی ولادت بغیر باپ کے معجزانہ انداز میں ہوئی۔ بلکہ ان کے ماں اور باپ دونوں تھے۔ اس نوع کی باتیں کرنے کے بعد پھر ان کا سوال ہوتا ہے کہ بتاؤ اس صورت میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں سے افضل و برتر کون ہے۔ ان کی باتوں سے ظاہری طور پر یوں لگنے لگتا ہے کہ جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام افضل ہوں۔ بعض اوقات یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نام کے ساتھ قرآن مجید میں 25 مرتبہ ذکر آیا ہے جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر نام کے ساتھ صرف پانچ مرتبہ ہوا ہے تو اس صورت میں دونوں میں سے افضل و برتر کون ہوا؟ اس طرح کی گفتگو سن کر ہم متاثر ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ اس صورت میں تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہی افضل دکھائی دیتے ہیں۔

حضرات محترم! میرے اس عزیز بھائی کی خواہش ہے کہ میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بات کروں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ پوری کائنات میں اسلام ہی تنہا وہ غیر عیسائی

مذہب ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت و پیغمبری پر ایمان رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو مانا جائے۔ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باپ کے بغیر معجزانہ ولادت پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں جبکہ آج کل کے بہت سارے عیسائی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اللہ پاک کے حکم سے مُردوں کو زندگی دے دیا کرتے تھے اور اپنے خالق کی مرضی سے اندھوں کو بینائی عطا کر دیا کرتے تھے۔ جبکہ ان کے بارے میں الوہیت کے عقیدے سے ہم مسلمانوں کو ہرگز اتفاق نہیں ہے۔ مسلمان سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہرگز خیال نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔

اب میں آپ کے اِس سوال کی طرف آتا ہوں کہ قرآن میں آتا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان کی جانب اٹھالیا گیا تھا اور دوسری جانب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں فرمایا گیا تو اس صورت میں دونوں پیغمبروں میں سے افضل و برتر کون ہے؟

سیدنا مسیح علیہ السلام کی بابت قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ (النسآء: 171)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا۔''

اِس آیت مبارکہ میں عیسائیوں اور نصاریٰ کو مبالغہ آرائی سے ممانعت کی گئی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح کی مبالغہ آرائی اور غلو سے ان کو روکا گیا ہے۔ مذاہب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک جانب یہودی تھے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے ہی منکر تھے اور ان کو کاذب (معاذ اللہ) قرار دے رہے تھے۔ دوسری جانب عیسائیوں نے انھیں مرتبۂ الوہیت پر فائز کر دیا۔ گویا دونوں جانب انتہا پسندی اور غلو کا غلبہ تھا۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف اور صرف ایک ہی ہے۔ رفع سیدنا مسیح علیہ السلام کا مقصد ایک غلط فہمی کا ازالہ تھا، ان کا دوسری مرتبہ آنا بحیثیت رسول کے نہیں ہوگا اور وہ نئی تعلیمات لے کر بطور پیغمبر مبعوث ہو کر تشریف نہیں لائیں گے اس لیے کہ دین کا اتمام و اکمال تو رب کائنات نے فرما دیا ہے جیسا کہ سورۃ المائدہ میں پروردگار عالم کا ارشادِ برحق ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: 3)

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

مسلمانوں کا اس بات پر کامل اعتقاد ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے دوبارہ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے لیکن آپ کی یہ آمد ثانی بطور نئے نبی کے نہیں ہوگی اور نہ ہی آپ کوئی نیا دین یا شریعت لائیں گے بلکہ خود ان کی طرف سے ارشاد ہوگا:

''یا باری تعالیٰ! تو گواہ ہے کہ میں نے اِن لوگوں کو کبھی اپنی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، میں نے انھیں کبھی نہیں کہا کہ مجھے خدا کا بیٹا سمجھیں۔''

دوسرا سوال ان کی بغیر باپ کے معجزانہ ولادت کے ضمن میں ہے، اگر تو آپ کو اِس لیے خدائی کے مرتبے پر آپ لوگ فائز کرتے ہیں کہ ان کی پیدائش باپ کے بغیر ہوئی تھی تو اِس صورت کے متعلق قرآن مجید ان الفاظ میں وضاحت کرتا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (آل عمران: 59)

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔''

اب آپ خود فرمائیں کہ کیا سیدنا آدم علیہ السلام کا کوئی باپ تھا۔ جواب ہوگا کہ نہیں بلکہ اُن کی تو ماں بھی نہیں تھی اور باپ بھی نہیں تھا۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دینے کی یہی بنیاد ہے تو اُن سے زیادہ استحقاق تو سیدنا آدم علیہ السلام کا بنتا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ بلکہ انجیل میں تو ایک اور

مافوق الفطرت اور غیر معمولی انسان KING Malchisedec کا ذکر بھی ملتا ہے جس کی نہ تو کوئی ابتدا تھی نہ خاتمہ۔

رہا آپ کا یہ کہنا کہ قرآن میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا ذکر مبارک 25 مرتبہ ہوا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ محض پانچ بار تو اس کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ یہودیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کئی الزامات عائد کر رکھے تھے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ بہر حال نہیں تھا اس لیے آپؐ کے ضمن میں قرآن مجید کو بار بار اعتراضات کے جوابات دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ آپ ؐ تو نزولِ قرآن کے وقت اسی جگہ موجود تھے جہاں قرآن کریم نازل ہوتا تھا یعنی سرزمینِ حجاز میں۔ جو شخص ہر وقت آپ کے ساتھ ہو، آپ کے سامنے موجود رہے اس کو بار بار مخاطب کرنے یا اس کو نام لے کر بلانے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ غیر موجود شخص یا اپنے کسی غیر حاضر دوست کا ذکر آپ بار بار نام لے کر ہی کریں گے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں چونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف نہیں رکھتے تھے اسی لیے ہر بار ان کا ذکر نام لے کر کیا گیا ہے۔ اور پھر اس بات کو کوئی فضیلت کا معیار تو نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اگر اسی کو کسوٹی بنا لیا جائے تو پھر سیدنا موسیٰ کلیم اللہ کا تذکرہ تو نام کے ساتھ 132 بار کیا گیا ہے تو کیا یہ مان لیا جائے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام دونوں سے بلند مرتبت تھے بلکہ بار بار نام کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ سامنے نہیں تھے، موجود نہیں تھے اس لیے ان کا ذکر نام لے کر کرنا ہر مرتبہ ضروری ٹھہرا۔

مجھے امید ہے آپ نے اپنے سوال کا جواب پا لیا ہوگا۔

سوال: میں اس بات کی وضاحت چاہوں گی کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے کہ ماں کے پیٹ میں جنس کے لحاظ سے بچہ، لڑکا ہے یا لڑکی، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ذات باری کے علاوہ کوئی بھی علم نہیں رکھتا جبکہ عصر رواں میں ایسے ایسے آلات کی دریافت ہو چکی ہے جن سے ماں کے پیٹ میں بچے کی صنف کا پتہ چل سکتا ہے اس سلسلے میں آپ کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: میری محترم بہن نے ایک نہایت ایک سوال کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا سوال ہے کہ قرآنی تعلیمات کی رُو سے اللہ کریم کے سوا کوئی اِس بات سے باخبر نہیں ہوتا کہ ماں کے پیٹ میں بننے والے بچے کی صنف کیا ہے۔ مجھے اِن کی اِس

بات سے اتفاق ہے کہ آج کئی ایسے آلات اور Test منظر عام پر آچکے ہیں جن کے استعمال سے بچے کی صنف کا پتہ چلایا جاسکتا ہے تو کیا اسے غلطی قرار دیا جائے؟

عزیز بہن نے جس آیت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ قرآن مجید کی سورہ لقمان کی ایک آیت مبارکہ ہے، اس آیت کریمہ میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○

(لقمٰن: 34)

''اُس گھڑی کا (قیامت) علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

جیسا کہ آپ نے اِس آیت کریمہ کا ترجمہ اور مفہوم ملاحظہ فرمایا، اس آیت کریمہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ اِن پانچ چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو علم نہیں ہوتا۔ لیکن جو آپ نے بچے کی صنف کی بات اٹھائی ہے تو یہ محض فریب نفس ہے اور اس غلط فہمی کا سبب قرآن مجید کے بعض تراجم ہیں اور ان میں بھی بالخصوص اردو زبان میں ہونے والے کچھ تراجم ایسے ہیں جو اس غلط فہمی کا موجب بن جاتے ہیں، اس آیت کریمہ کا ترجمہ بعض مترجمین نے یہ کیا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا کہ بچے کی جنس کیا ہے؟ جبکہ اِس آیت پاک میں تو جنس یا صنف کا مذکور ہی نہیں۔ بلکہ قرآن حکیم کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اللہ پاک کے علاوہ کوئی اس بات سے باخبر نہیں کہ رحم مادر میں کیا ہے؟ یہاں قرآن کے پیش نظر بچے کی جنس یا صنف نہیں بلکہ وہ تو بچے کی شخصیت اور کردار کی بابت بات کر رہا ہے کہ کیا وہ بچا سعید ہوگا یا شقی، ایمان والا ہوگا یا بے ایمان ہوگا۔ سماج اور انسانیت کے لیے اس کا کردار کیسا ہوگا کیا وہ ڈاکٹر بنے گا، انجینئر بنے گا یا کچھ اور؟ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سائنس کی بے شمار ترقیات اور علم طب کے نشو و ارتقاء اور نئے نئے آلات سامنے آجانے کے باوصف بھی ان چیزوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے میں آپ پر واضح

کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہ محض تراجم کی وجہ سے پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی ہے۔ اس سلسلے میں آپ ڈکشنری سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ایسی ایسی ڈکشنریاں ہیں جن کو غیر مسلموں نے مدوّن و مرتب کیا ہے۔ ان میں سے ایک معروف ڈکشنری LANE LEXICON بھی ہے۔ اس سے استفادہ کر کے آپ خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ ان آیات میں جنس (GENDER) کا ذکر سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔

پھر اس آیت کریمہ میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ یہ بات بھی کسی کو معلوم نہیں سوائے پروردگار عالم کے کہ قیامت کب قائم ہوگی۔ دنیا میں بہت سے پیش گوئیوں کے ماہرین اور منجم حضرات بھی ہیں جو طرح طرح کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے قیامت کے بارے میں بھی پیش گوئی کی۔ جیسا کہ نومبر 1992ء کے ہندی اخبار Times of India میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کوریا کے کسی گرجا گھر میں اعلان کیا گیا ہے کہ نومبر 1992ء میں دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس پیشین گوئی کے بعد اس چرچ سے وابستہ افراد متعلقہ تاریخ کو اس گرجا گھر میں اکٹھے ہوئے لیکن پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور دنیا آج بھی حسب سابق قائم اور موجود ہے اور جن لوگوں نے قیامت کی پیش گوئی کی تھی وہ لوگوں کی رقم اڑا کر اڑنچھو ہو گئے۔

بارش بھی اسی نوع کا ایک قدرتی مظہر ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ محکمہ موسمیات کے پاس موجود آلات کی بنا پر اب محکمہ موسمیات بارش سے پہلے اس کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ اور یہ بات آپ کے علم میں ہوگی ہی کہ اس نوع کی پیش گوئیاں کس حد تک سچ ثابت ہوتی ہیں اور خاص کر انڈیا میں تو یہ صورتحال نہایت ابتر ہے۔

یہاں بعض بھائیوں کو سوال اٹھانے کا موقع مل سکتا ہے کہ امریکہ وغیرہ ترقی یافتہ ممالک میں کی جانے والی پیشین گوئیاں درست ہوتی ہیں۔ ہم ان بھائیوں کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیتے ہیں۔ فرض کریں کہ امریکہ یا دیگر کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں یہ پیشین گوئیاں اور اطلاعات صحیح ہوتی ہیں لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ محکمہ موسمیات والے بارش کی پیش گوئی کس طرح کرتے ہیں؟ اس پیشین گوئی کے لیے سب سے پہلے تو بادلوں کے موجود ہونے کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ پھر ہوا کا رخ دیکھتے ہیں اور یہ کوئی غیر معمولی بات یا معرکے کا کام نہیں ہے کیوں کہ درحقیقت بارش تو بادلوں میں موجود ہوتی ہے صرف اس کے برسنے کا تخمینہ لگا کر اطلاع دینا ہوتی ہے جیسا کہ مثلاً ایک طالب علم ہے جس نے امتحان دینا ہو اور امتحان کے بعد اس کا رزلٹ ایک مہینے تک آنا ہو۔ اگر وہ ممتحن جس نے اس امتحان

میں پیپر مارکنگ کی ہے تین ہفتے بعد پیش گوئی کرے کہ فلاں طالب اوّل پوزیشن حاصل کرے گا تو اس پیش گوئی میں کون سی نرالی یا غیر معمولی بات مضمر ہے کیونکہ پیپر مارکنگ کی وجہ سے اس کو معلومات تو پیشتر ہی مہیا ہو چکی ہیں اور یہی معلومات دیگر لوگوں کو مزید ایک ہفتے بعد فراہم ہو پائیں گی۔

مزا تو تب آئے کہ محکمہ موسمیات کسی خاص خطے میں بادلوں کی موجودگی کا اطمینان کیے بغیر اعلان کرے کہ کہ 200 سال بعد اس خطے میں بارش ہوگی یا نہیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ دنیا کے کسی ملک کا محکمہ موسمیات بھی اِس نوع کی پیشین گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ وہ دوسو سال کے بارے میں اعلان کرے کہ دنیا کے کس علاقے میں کب اور کس قدر بارش ہوگی۔ کوئی بھی محکمہ موسمیات ایسا نہیں کر سکے گا۔

آیت کے آخر میں موت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آج دنیا میں بعض لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ خودکشی کرنے والا اِس بات کی اِطلاع دے سکتا ہے کہ وہ کب اور کہاں مرے گا لیکن ہمیں معلوم ہے کہ دنیا میں اکثر خودکشی کرنے والے اپنے اِس سلبی منصوبے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دنیا میں کتنی تعداد میں لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد نہایت معمولی اور ناقابلِ ذکر ہوتی ہے۔ اور پھر اکثر لوگ اپنے اِس کام میں ناکام بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ زہر خوردنی کرتے ہیں لیکن کسی کو مطلع بھی کر دیتے ہیں کہ انہوں نے زہر کھا رکھا ہے۔ لوگ انھیں ڈاکٹر کے پاس یا شفا خانے لے جاتے ہیں اور یوں ان کی جان بچ جاتی ہے۔

آپ کہیں کسی بلند مقام سے جست لگا کر خودکشی کرنا چاہ رہے ہیں تو بھی لازمی نہیں کہ آپ مر ہی جائیں گے کیونکہ اللہ اپنی قدرت سے کوئی سبب پیدا کر کے آپ کو پھر بھی بچا سکتا ہے۔ اور آپ کا خودکشی کر کے مرنا کون سا آپ کے اپنے اختیار سے ہے۔ اللہ کی مشیئت غالب آتی ہے تو آپ کی موت واقع ہوتی ہے۔

اور اس آیت کریمہ کے سب سے آخر میں کہا گیا ہے کہ کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ کیا کمائی کرے گا اور کتنا کمالے گا۔ اس ضمن میں آپ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ میری کمائی 2000 روپے ہوگی یعنی میری ماہانہ انکم دو ہزار روپے ہوتی ہے تو کیا اِس صورت میں قرآن کا قول نعوذ باللہ غلط قرار پائے گا؟

تو میرا جواب ہے کہ ہرگز نہیں اور وہ اس لیے کہ قرآن نے آپ کی دنیاوی معیشت کے

متعلق بات نہیں کی بلکہ یہاں اِس آیت کریمہ میں تکسب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کا مفہوم اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال وافعال ہوتے ہیں۔ اس لیے نیک اور پسندیدہ اعمال اگر آپ کر بھی لیتے ہیں تو آپ کو قطعاً علم نہیں ہوسکتا کہ آپ نے اس کے بدلے کتنا ثواب کمایا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی گناہ یا اللہ پاک کی نافرمانی کا کوئی فعل آپ سے سرزد ہوگیا ہے تو اس کے متعلق بھی آپ کو کچھ معلوم نہیں ہوسکتا کہ آپ کو کس قدر سزا دی جائے گی۔ ان تمام امور اور معاملات کا حساب کتاب اللہ رب العزت کے پاس ہی ہے۔ میری اِن وضاحتوں سے امید کرتا ہوں کہ آپ کا اطمینان ہوگیا ہوگا۔

سوال: ہندو مؤلف ارون شوری نے اسلام کے خلاف بے شمار کتابیں اور مقالات تحریر کیے ہیں اور وہ اِسلام کے خلاف مسلسل لکھتا رہتا ہے تو آپ اسے عوامی مباحثے کا چیلنج کس لیے نہیں دیتے؟

جواب: سوال میں کہا گیا ہے کہ ارون شوری نے اسلام کے خلاف کتابیں، مقالات، اور مضامین لکھے ہیں آپ اس کو مناظرے یا مباحثے کا چیلنج کیوں نہیں دیتے۔ تو اِس ضمن میں عرض ہے کہ میں اس کی بعض تحریریں پڑھ چکا ہوں۔ اس نے اپنے تحریری مضامین اور کتابوں میں زیادہ تر دو نکات کو ہدف بنایا ہے۔ ایک تو وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے لیے برابری کے حقوق نہیں ہیں دوسرے وہ اِسلام کو ایک دہشت گرد مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسلام ایک ظالمانہ اور بے رحم قدروں کا حامل مذہب ہے اور اس کے ساتھ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا ہے۔ جس طرح ایک بھائی نے کہا تھا کہ خدا ریاضی نہیں جانتا۔ اس کی تمام تحریروں کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کی بیشتر باتیں سیاق وسباق سے ہٹ کر ہیں، جن میں غلط تراجم اور غلط حوالہ جات سے اپنی باتوں کو تقویت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارون شوری کی تمام باتوں کا میں جواب دے سکتا ہوں بلکہ اکثر دیتا رہتا ہوں۔

حال ہی میں اس نے ممبئی سے ایک نئی کتاب بعنوان: "Worlds of Fatwas, Sharial in Action" شائع کی ہے۔ اس کے سرورق پر قرآن مجید کی سورۃ الفتح کی حسب ذیل آیت کریمہ دی گئی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: 29)

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔''

اس کتاب میں بھی اس نے وہی حربہ استعمال کیا ہے کہ سیاق وسباق سے جدا کر کے ایک آیت پیش کر دی ہے اور اس سے یہ تاثر دینا چاہا کہ مسلمان ظالم لوگ ہیں جو کہ غیر مسلموں کے لیے بے رحمانہ روّیہ رکھتے ہیں۔ اگر اس آیت کو اس کے صحیح تناظر اور حقیقی پس منظر میں رکھ کر پڑھنا چاہیں تو اس مضمون کا آغاز آیت نمبر 25 سے ہو رہا ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ وہ کفار و مشرکین جنھوں نے مسلمانوں کو خانہ کعبہ یعنی بیت الحرام میں جانے سے روکا تھا اور قربانی ادا کرنے میں ان کے لیے رکاوٹ بنے تھے، ان کے لیے مسلمان سخت روّیہ رکھتے ہیں۔ گویا یہاں ان ظالم و جابر مشرکین مکہ کا تذکرہ ہو رہا ہے جنھوں نے نبی کریمؐ اور اصحاب رسولؓ کو ان کا مقدس ترین مذہبی فریضہ ادا کرنے سے روکا تھا اگر آج کل کوئی شخص کسی مسیحی مذہب کے پیروکار کو ویٹی کن شہر میں داخل ہونے سے روکنا چاہے تو عیسائی اس روکنے والے کے فعل کی تحسین کریں گے یا مذمت؟ اسی طرح فرض کریں کسی ہندو کو بنارس کے مذہبی مقامات میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تو کیا اس روکنے والے کے عمل کی تحسین کی جائے گی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ فطری سی بات ہے کہ اس غیر فطری طرز عمل کو ناپسندیدگی سے دیکھا جائے گا۔ یہی صورت حال یہاں اس آیت مبارکہ میں بیان کی گئی ہے۔ اگر اس آیت کو اس کے سیاق وسباق میں رکھ کر پڑھا جائے تو اسی نوع کی بات ہو رہی ہے کہ وہ کفار اور مشرکین جنھوں نے مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں داخل ہو کر بیت الحرام میں جانے سے روکا ہے اور ان کو

ایک مذہبی عبادت کرنے میں مزاحم ہوئے ہیں تو ایسے بے انصاف لوگوں کے حق میں مسلمانوں کو سخت ہونا چاہیے جبکہ آپس میں اُن کا طرز عمل نرمی، مودّت اور محبت کا ہونا چاہیے۔

پھر ارون شوری اپنی اِسی کتاب کے صفحات 571، 572 پر اپنی منتخب کردہ اور پسندیدہ آیت کا حوالہ دیتا ہے، یہ آیت مبارکہ سورۃ توبہ کی آیت نمبر 5 ہے اور اسی کو وہ بار بار دہراتا ہے، سورۂ توبہ کی یہ آیت مبارکہ حسب ذیل ہے:

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(التوبة:5)

”پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

یہاں بھی ارون شوری نے وہی حرکت کی ہے کہ بات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی گذشتہ واقعے کی طرح بات کی ابتدا سورۂ کی شروع والی آیت سے ہورہی ہے اور ان کفار مکہ کا ذکر ہورہا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر امن کا معاہدہ کیا تھا پھر من مانی کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اس معاہدہ کو ختم کردیا۔ مسلمانوں سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اس لیے یہاں مبینہ طور پر انھیں متنبہ کردیا گیا کہ یا تو چار مہینوں کی مہلت میں معاملات کو درست کرلو بصورتِ دیگر جنگ اور تصادم کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اور

مسلمانوں کو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ دورانِ جنگ ان بدعہدوں کو جہاں کہیں پاؤ ٹھکانے لگا دو۔

اس صورتحال کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ فرض کریں ویت نام اور امریکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے اور امریکی صدر اپنی افواج کو حکم دیتا ہے کہ جنگ کے دوران ویت نامیوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور اسی بات کو اگر میں آپ کے سامنے اِس صورت میں پیش کروں کہ:

''امریکی صدر کا حکم ہے کہ ویت نامیوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔''

تو اِس صورت میں یقینی بات ہے کہ امریکی صدر ہم سب کو قصاب ہی دکھائی دے گا جبکہ دورانِ جنگ یا لڑائی کے پس منظر میں کوئی بھی صاحب اقتدار یا فوجی جرنیل یہی حکم دے گا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں اور اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دو، اسی طرح وہ ان کے حوصلوں اور عزائم کو بلند رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد ارون شوری پانچویں آیت کے بعد ساتویں اور آٹھویں آیت پر جا پہنچتا ہے اور درمیان سے آیت نمبر 6 کو اڑا دیتا ہے۔ سوچیے کہ وہ آخر ایسا کیوں کرتا ہے؟

وہ اِس آیت کو جان بوجھ کر بدنیتی سے درمیان سے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے کیوں کہ اِس آیت کریمہ میں اس کی باتوں کا جواب موجود ہے۔ اس آیت کریمہ میں بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی تم لوگوں سے پناہ طلب کرتا ہے تو اس کو پناہ دی جائے۔ اس کے بعد پناہ لینے والے شخص کو اپنی حفاظت میں محفوظ جگہ تک پہنچا دو۔ اگر وہ اِسلام کا اقرار نہیں کرتے اور کافر ہی رہتے ہیں تو بھی جس مشرک کو پناہ دی گئی ہے اس کو امن کی جگہ تک پہنچانا ضروری ہے۔

آج دنیا کے کس ملک، کس مذہب، کس نظریے، کس عقیدے کا جرنیل اپنی سپاہ کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ اگر دشمن پناہ طلب کرے تو اس کو محفوظ مقام تک پہنچا کر بھی ضرور آؤ۔ صرف معافی اور درگزر کی بابت ہی نہیں کہا جا رہا بلکہ مقامِ امن و سلامتی تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔

میں اس مقام پر پوچھ سکتا ہوں کہ عصرِ حاضر میں کون سا جرنیل اور کون سی فوج اس نوع کا

حکم دے سکتی ہیں لیکن قرآن یہی کچھ فرما رہا ہے۔

ارون شوری کو مسلمانوں سے اور ان کے مذہب سے عداوت ونفرت ہے اور اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مسلمانوں کو ظالم اور اسلام کو بے انصاف اور دہشت گرد مذہب ثابت کرنے کے لیے سیاق وسباق سے کاٹ کر اسی طرح حوالے دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح اس کو ''حقوقِ خواتین'' کے موضوع سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ یہاں بھی بطور حوالہ وہ قرآن مجید سے آیات پیش کرتا ہے یہ وہی آیات ہیں جو تسلیمہ نسرین جیسے مصنفین اپنی غیر وقیع اور یک طرفہ کتابوں میں دیتے ہیں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں ارون شوری سے کھلے عام مباحثہ یا مناظرہ کیوں نہیں کرتا تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ایک مرتبہ میں نے تسلیمہ نسرین کے حوالے سے ہونے والے ایک مباحثے میں شرکت کی تھی۔ یہ مباحثہ ''ممبئی یونین آف جرنلسٹس'' نے منعقد کروایا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس مباحثے کی وڈیو ریکارڈنگ بھی مجھے دی جائے لیکن اس سے انکار کر دیا گیا جبکہ اس مباحثے کا موضوع تھا:

''کیا مذہبی انتہا پسندی آزادیٔ اظہار رائے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔''

گویا عنوان تو اظہار خیال کی آزادی رکھا گیا جبکہ ایک شریک مباحثہ کو مباحثے کو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیسی منافقانہ روش اپنائی جاتی ہے۔ میں نے ان کو پیشکش بھی کی کہ آپ بھی اس ریکارڈنگ کی نقل (Copy) رکھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ریکارڈنگ کی اجازت پر تیار نہیں تھے، تاہم بڑی رد و کد کے بعد اس مباحثے کو ریکارڈ کرنے کی اجازت مجھے ملی اور پھر دیکھیں کہ کیا کیا گیا؟

اللہ پاک کے فضل وکرم اور عنایتِ خاص سے اِس مباحثے میں مَیں نمایاں طور پر کامیاب رہا۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ اِسلام کو قربانی کا بکرا بنایا جائے، وہ خود مجھے بھی قربانی کا بکرا بنانے پر

کمر بستہ تھے لیکن اللہ پاک کی رحمت سے مباحثے میں میں کامیاب ٹھہرا۔ یہ محض اللہ پاک کا فضل و کرم تھا میری کسی خوبی یا قابلیت کو اس میں مطلق دخل نہیں۔ اس زبردست کامیاب مباحثے پر اس طرح بھی بے انصافی کا رویہ اختیار کیا گیا کہ پریس کے کسی بھی اخبار نے اس کی خبر شائع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

عیسائیوں کی جانب سے اس مناظرے میں فادر پریرا نے حصہ لیا تھا۔ ہندوؤں کے نمائندے ڈاکٹر ویدویاس تھے، مسلمانوں کی وکالت پر میں مامور تھا۔ اسی طرح تسلیمہ نسرین کی کتاب کا مراٹھی زبان میں ترجمہ کرنے والے بھارتی دانش ور اشوک صاحب بھی موجود تھے، آپ خود سوچیں کہ اگر اس مباحثے کی ریکارڈنگ نہ کی جاتی تو پریس نے تو اس کی خبر لگانا بھی روا نہیں رکھا تھا تو پھر اس صورت میں لوگوں کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ کوئی مناظرہ یا مباحثہ ہوا ہے۔ جبکہ ریکارڈنگ کی وجہ سے اس مباحثے کو ہندوستان اور ممبئی میں ہی نہیں بلکہ پورے اقصائے عالم میں لاکھوں لوگوں نے ملاحظہ کیا ہے۔

ایک کیسٹ میں ارون شوری کے اٹھائے گئے سوالات کے جوابات بھی ریکارڈنگ شدہ موجود ہیں۔ یہ کیسٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں میرا خطاب ہے جبکہ دوسرے حصے میں سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں ان سوالوں کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بالعموم ارون شوری کیا کرتا ہے۔

رہی یہ بات کہ ارون شوری کے ساتھ مناظرہ کیا جائے تو آپ ہی بتائیں کہ کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے اور اس کے ساتھ مناظرہ کیا جائے۔ یقیناً وہ اس قابل نہیں ہے۔ پھر بھی میری جانب سے صلائے عام ہے اور میں اس کے ساتھ ہر جگہ، ہر وقت کسی بھی موضوع پر مناظرہ کرنے پر تیار ہوں، وہ اس پر تیار ہو تو میں آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہوں گا اور اس کے ساتھ مناظرہ بھی ضرور کروں گا لیکن چند شرائط کے ساتھ اور وہ شرائط یہ ہیں:

☆ یہ مناظرہ برسرِ عام ہوگا۔

☆ سب لوگوں کے سامنے کھلے ماحول میں ہوگا۔

☆ کسی بند کمرے یا ہال میں نہیں ہوگا۔

☆ اور آخری شرط یہ ہوگی کہ اس کی براہ راست ریکارڈنگ بھی کی جائے گی۔

میں آپ حضرات کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔

والسلام

قرآن اور جدید سائنس
قابل مطابقت نا قابل مطابقت
ڈاکٹر ذاکر نائیک

باب اول

تعارف

کرہ ارض پر نسل انسانی کے آغاز سے اب تک ہمیشہ انسان یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ فطری نظام کا طریقہ کار کیا ہے۔ سلسلہ ہائے تخلیق و مخلوق میں مقام انسانی کیا ہے نیز زندگی کا اپنا کیا مقصد ہے اور اس کو کس طرح گزارنا چاہیے۔ صدیوں پر محیط صداقت کی یہ تلاش لاتعداد تہذیبوں کے عروج وزوال کو دیکھ چکی ہے۔ منظم مذاہب نے تشکیل زندگی انسانی کے ساتھ ساتھ تاریخ کی روانی کا تعین بھی کیا ہے۔

بعض مذاہب کی بنیاد ان تحریری نسخوں و کتب پر قائم ہے جن کی بابت ان کے پیروکار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ الہامی ہیں۔ جبکہ دیگر بعض مذہب انسانی فکر و تجربات پر منحصر ہیں۔

قرآن الکریم اسلامی عقائد کا مرکزی ستون، ایسی کتاب ہے جس کو مسلمان کاملاً خدائی یا الہامی نازل شدہ کتاب تسلیم کرتے ہیں جو تا قیامت نوع انسانی کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے۔ چونکہ قرآن کریم کا پیغام ہر عہد و قرن کے تقاضے پورا کرتا ہے لہٰذا اسے ہر عہد کے مطابق ہونا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعتاً قرآن کریم اس معیار پر پورا اترتا ہے؟

مختصر کتاب ہذا میں مسلمانوں کے اس عقیدے کا معروضی تجزیہ کیا جائے گا جو قرآن کریم کے الہامی ہونے کے بارے میں ہے اور خصوصی طور پر اس کا مستند سائنسی دریافتوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا۔

تاریخ عالم میں ایسا ایک دور بھی گذرا ہے جس میں معجزات یا معجزات تصور کیئے جانے والے واقعات کو انسان کی سمجھ بوجھ، دلیل اور منطق پر ترجیح دی جاتی تھی۔ جبکہ معجزہ کی تمام تعریف بھی یہ ہے کہ کوئی ایسا مشاہدہ جو عمومی حیات انسانی کے برعکس ہو اور جس کی عقلی توضیح انسان نہ کر سکے۔

البتہ کسی بھی شے کو معجزہ ماننے سے قبل بہت محتاط رہنا چاہیے۔ مثال کے طور پر 1993ء میں "ٹائمز آف انڈیا" (بمبئی) کی ایک خبر میں "بابا پائلٹ" نامی سادھو نے دعویٰ کیا کہ وہ پانی سے بھرے ہوئے ایک ٹینک میں مسلسل تین دن رات ڈوبا رہا ہے۔ جب رپورٹروں نے اُس ٹینک کی

تہہ کا جائزہ لینا چاہا جس کے اندر ''معجزاتی کارنامہ'' دکھایا گیا تھا تو نہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس نے صحافیوں سے کہا کہ کسی شخص کو رحم مادر کا تجزیہ کرنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً ''سادھوجی'' کچھ چھپانا چاہتے تھے وہ اس دعویٰ سے محض شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ عہد جدید کا کوئی بھی آدمی جو ذرا سا بھی عقلیت پسند ہو وہ ایسے کسی نام نہاد ''معجزے'' کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اگر یہ مبنی در دروغ اور بے بنیاد معجزے خدائی جانب سے تسلیم کر لیے جائیں تو پھر ہمیں دنیا کے ان تمام معروف جادوگر حضرات کو جن کی شہرت ہی ان کے شعبدوں اور بصری دھوکوں کی وجہ سے ہے، خدا کے حقیقی نمائندوں کو ماننا پڑے گا۔

ایسی ایک کتاب جس کے الہامی ہونے کا دعوے کیا جائے تو صرف اسی سبب سے اس کو ایک معجزہ بھی قرار دیا جاسکا ہے۔ اس دعوے کی ہر عہد میں اسی عہد کے عقلی معیارات کے مطابق سہل طریقہ سے تصدیق ممکن ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے جس میں ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ بات خود تمام معجزات سے عظیم تر معجزہ ہے جسے بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے نازل کیا۔ چنانچہ ہم اس عقیدے کی صحت کا عقلی معیار دیکھتے ہیں۔

قرآن کریم کی دعوتِ مبارزہ:

عہد قدیم سے انسانی تہذیبوں میں ادب و شاعری کا مقام انسان کی بیانی قوت اور تخلیقی صلاحیتوں کے اہم وسیلہ میں سرفہرست رہا ہے۔ تاریخ عالم میں ادب و شاعری کو ایسے اعلیٰ مقامات تفویض کرنے کے ادوار بھی گذرے ہیں جیسا کہ آج سائنس و ٹیکنالوجی کو حاصل ہے۔

تمام غیر مسلم ماہرین لسانیات بھی اس بات پر متفق ہیں کہ عربی ادب میں اعلیٰ ترین نمونہ قرآن کریم ہے، یعنی اس کرۂ ارض پر عربی لٹریچر کی بہترین از بہترین مثال صرف قرآن کریم ہے۔ انسانوں کو قرآن کا چیلنج ہے کہ وہ قرآنی آیات کے برابر کچھ بنا کر لائیں یعنی۔

﴿ وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۲، آیت ۲۳ تا ۲۴ سورۃ البقرۃ)

''اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندہ پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے''

قرآن کریم واشگاف الفاظ میں قرآن کریم میں موجود سورتوں جیسی کوئی ایک سورت بنانے کا چیلنج کرتا ہے یہ چیلنج قرآن پاک میں جابجا موجود ہے۔ فقط ایک ایسی سورۃ بنانے کا چیلنج جو اپنے حسن کلام و بیان اور وسیع المعنی اور عمیق فکر میں قرآن کریم کے ہم پلہ ہو سکے ایسا چیلنج ہے جس کا آج تک کوئی جواب نہ دے سکا۔

البتہ عہد جدید میں ہر عقلیت پسند شخص کسی ایسے مذہبی صحیفے کو تسلیم نہیں کرے گا جو بہترین ادبی وشاعرانہ طرز کے باوجود زمین کو چپٹی کہتا ہو۔ کیونکہ ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جہاں انسانی عقلیت، منطق اور سائنس بنیادی مقام کی حامل ہے۔ کئی حضرات ایسے بھی ہیں جو قرآن کریم کے الہامی ہونے کے لیے اس کی غیر معمولی اور اعلیٰ وارفع ادبی زبان کو کافی قرار نہیں دیں گے۔ ضروری ہے کہ ایسی ہر کتاب جو الہامی ہونے کا دعوے رکھتی ہو اسے اپنے ہی دلائل اور مضبوط منطقی استدلال کی بنیاد پر قابل قبول ہونا چاہیے۔

نوبل انعام یافتہ سائنسدان اور معروف ماہر طبیعات البرٹ آئن اسٹائن کہتا ہے۔

''مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر مذہب نابینا ہے۔''

چنانچہ قرآن پاک کا جائزہ لیتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کیا جدید سائنس اور قرآن پاک میں باہمی تطبیق ہے یا عدم تطبیق ہے؟

یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن کریم کتاب سائنس نہیں بلکہ نشانیوں (آیات) کی کتاب ہے۔ قرآن کریم میں چھ ہزار سے زیادہ (آیات) نشانیاں موجود ہیں جن میں سے ایک ہزار سے زیادہ جدید سائنسی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہمیں علم ہے کہ سائنسی حقائق میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور بعض دفعہ بالکل برعکس نتیجہ نکالا جاتا ہے لیکن کتاب ہذا میں صرف اور صرف ثابت شدہ سائنسی حقائق پر بحث کی گئی ہے اور ان مفروضات یا بے ثبوت معاملات پر بحث نہیں کی گئی ہے۔

باب دوم

فلکیات

تخلیق کائنات، عظیم الجثہ دھماکہ:

ماہرین فلکیات کائنات کی تشکیل کے بارے میں جو نظریہ پیش کرتے ہیں وہ وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جس کو عمومی طور پر عظیم الجثہ دھماکہ یا (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ عظیم دھماکہ کے ثبوت میں کئی دہائیوں سے جمع ہونے والے مشاہدات و تجربات پیش کیئے جاتے ہیں جو ان کے پاس موجود ہیں۔

دھماکہ الجثہ کے نظریہ کے مطابق آغاز میں یہ تمام کائنات ایک کمیت کی شکل میں تھی۔ پھر ایک عظیم دھماکہ ہوا جس سے نتیجہ میں کہکشاؤں کا ظہور ہوا۔ بعد ازاں کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج، چاند وغیرہ کی صورت میں آئیں۔ کائنات کی ابتداء اس قدر منفرد اور عجیب تھی کہ" اچانک اس کے وجود میں آنے کا احتمال خارج از امکان تھا۔

قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں ابتدائے کائنات کے متعلق بتایا گیا ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۱ آیت ۳۰، سورۃ الانبیاء)

"اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان و زمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔"

مذکورہ آیت قرآنی اور دھماکہ الجثہ کے مابین حیرت انگیز مماثلت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب جو آج سے 1400 سال پہلے عرب کے صحرا میں اتاری گئی ہوئی، اپنے اندر ایسی غیر معمولی سائنسی حقیقت سمیٹے ہوئے ہو؟

کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے، ابتدائی گیسی کمیت:

اس امر پر سائنسدان متفق ہیں کہ کائنات میں کہکشائیں بننے سے قبل، کائنات کا سارا مادہ ایک ابتدائی گیسی حالت میں تھا، مطلب وسیع و عریض بادلوں کی شکل میں جس کے لیے گیس سے زیادہ موزوں لفظ ''دھواں'' ہے۔ درج ذیل قرآنی آیت میں کائنات کی ایسی ہی حالت کا ذکر ''دخان'' یعنی دھوئیں کا لفظ استعمال کر کے کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَ ھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ﴾ (القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۱۱)

پھر چڑھا آسمان کو اور وہ دھواں ہو رہا تھا پھر کہا اس کو اور زمین کو آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے وہ بولے ہم آئے خوشی سے۔

ایک بار پھر، یہ حقیقت بھی ''بگ بینگ'' کی عین مطابقت میں ہے جس کے بارے میں حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے پہلے کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ اگر اُس دور میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا تو پھر اس علم کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

زمین کی بیضوی ساخت:

زمانہ قدیم میں زمین کو چپٹا مانا جاتا تھا جس کے سبب انسان دور دراز کے سفر سے بھی خائف تھا کہ مبادا زمین کے کناروں سے گر نہ پڑے۔ سر فرانس ڈریک نے 1597ء عیسوی میں بحری راستے سے زمین کے گرد چکر لگا کر اسے عملاً گول ثابت کیا۔

اسی نکتہ کے حوالہ سے درج ذیل قرآنی آیت ملاحظہ فرمائیں جو دن رات کے آنے جانے سے متعلق ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۱، آیت ۲۹)

تو نے نہیں دیکھا اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔''

واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے بتدریج دن میں بدلنے اور دن کے بتدریج رات میں بدلنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب زمین کی ساخت کسی گولے جیسی یعنی بیضوی ہو۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو دن کی رات میں یا رات کی دن میں تبدیلی بالکل اچانک ہوتی۔ ذیل میں ایک اور آیت مبارک ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی زمین کی کروی ساخت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۵)

"بنائے آسمان اور زمین ٹھیک لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر۔"

یہاں استعمال کیے گئے عربی لفظ "کوّر" کا مطلب ہے کسی ایک چیز کو دوسری پر موافق کرنا یا کے چکر کے ذریعے باندھنا دن ایسا صرف اسی وقت ممکن ہے جب زمین کی ساخت بیضوی ہو۔ زمین کسی گیند کی طرح بالکل ہی گول نہیں بلکہ "ارضی بیوضی ہے یعنی بمقام قطبین پچکی ہوئی ہے۔

درج ذیل آیت مبارک میں زمین کی ساخت کی وضاحت کی گئی ہے۔

﴿وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۰)

"اور پھر زمین کو اس نے بچھایا۔"

یہاں عربی عبارت "دَحٰهَا" استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب ہے "شتر مرغ کا انڈا" شتر مرغ کے انڈے کی شکل، زمین کی بیضوی ساخت ہی سے مشابہ ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں زمین کی ساخت بالکل ٹھیک بیان کی گئی ہے، حالانکہ نزول قرآن پاک کے وقت عام فکر یہی تھی کہ زمین چپٹی ہے۔

چاندنی منعکس شدہ نور:

دورِ قدیم میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ چاند کی اپنی روشنی ہے۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند کی روشنی، منعکس شدہ ہے۔ یہ حقیقت آج سے چودہ سو سال پہلے، قرآن پاک کی آیت مبارکہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

﴿تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ (القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۶۱)

''بڑی برکت ہے اس کی جس نے بنائے آسمان میں بُرج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند اجالا کرنے والا۔''

قرآن پاک میں سورج کے لیے عربی لفظ ''شمس'' استعمال ہوا ہے تاہم اس کو ''سراج'' بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے مشعل جب کہ بعض مواقع پر اسے ''وہاج'' بھی جلتا ہوا چراغ بھی بیان کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ''روشن عظمت'' مذکورہ تینوں وضاحتیں سورج کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ اس کے اندر دھماکوں کے زبردست عمل ہر وقت جاری رہنے کی وجہ سے شدید حرارت اور روشنی خارج ہوتی رہتی ہے۔

چاند کے لیے قرآن پاک میں عربی لفظ ''قمر'' استعمال کیا گیا ہے اور اسے بطور ''منیر'' بیان کیا گیا ہے ایک ایسا وجود جو ''نور'' دیتا ہو۔ یعنی منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔ ایک بار پھر، قرآن پاک کی پیش کردہ وضاحت چاند کی اصلی نوعیت سے مکمل مطابقت رکھتی ہے کیونکہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کرتا ہے، اور ہمیں چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے، قرآن کریم میں ایک مرتبہ بھی چاند کے لیے سراج، وہاج یا چراغ جیسے الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور نہیں ہی سورج کو نور یا منیر کہا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں سورج اور چاند کی روشنی کے درمیان بہت واضح فرق رکھا گیا ہے جو قرآن پاک میں آیات مبارکہ کے مطالعے سے واضح طور پر نظر آتا ہے۔

درج ذیل آیات میں سورج اور چاند کی روشنی کا فرق دیکھا جا سکتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾

(القرآن: سورۃ ۱۰، آیت ۵، سورۃ یونس)

''وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمکدار اور چاند کو چاندنی دی۔''

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾

(القرآن: سورۃ ۷۱، آیات ۱۵ تا ۱۶ سورۃ نوح)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات آسمان تہہ پر تہہ اور رکھا چاند کو ان میں اجالا اور رکھا سورج کو چراغ جلتا ہوا۔''

ان آیات مبارکہ کے مطالعے سے ثابت ہوا ہے کہ قرآن کریم اور جدید سائنس کے درمیان دھوپ اور چاندنی کی ماہیت کے بارے میں مکمل مطابقت موجود ہے۔

سورج زیر گردش ہے:

طویل مدت تک یورپی فلسفیوں اور سائنس دانوں کی فکر یہ رہی کہ زمین، کائنات کے مرکز میں ساکن کھڑی ہے اور سورج سمیت، کائنات کی تمام چیزیں اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ یہ نظریہ جس کے لیے نظریہ ارض مرکزی کا نام استعمال ہوا ہے بطلیموس کے دور یعنی، دوسری صدی قبل از مسیح تا سولہویں صدی عیسوی تک سب سے زیادہ مقبول و مسلم رہا۔ 1512ء میں نکولس کوپرنیکس نے سیاروں کی حرکت کا سورج مرکزی نظریہ پیش کیا، جس میں سورج کو نظامِ شمسی کے مرکز میں ساکن قرار دیا اور تمام سیارے اس کے گرد گردش کرتے قرار دیئے گئے۔ 1609ء میں ایک جرمن سائنسدان جوہانس کیپلر کی ''آسٹرولومیانوا،، کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں کیپلر نے ثابت کیا کہ نظام شمسی کے سیارے بیضوی مداروں میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ نیز یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سیارے اپنے اپنے محوروں پر غیر مستقل قسم کی رفتار سے گھومتے ہیں۔ اس علم کی بدولت یورپی سائنسدانوں کے لیے نظام شمسی کے کئی ایک نظاموں کی درست وضاحت ممکن ہوگئی اور رات اور دن کے تسلسل کو ترتیب دی گئی۔ ایسی دریافتوں کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ سورج ساکن ہے اور زمین کی طرح اپنے محور پر گھومتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اسی مغالطہ آرائی کا پرچار کیا گیا تھا۔ اب ذرا قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمائیے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ (سورة۲۱، آیت۳۳)

اور وہ وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند سب اپنے ہی گھر میں پھرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں عربی لفظ ''یَسْبَحُوْنَ'' استعمال کیا گیا ہے۔ جو کہ ''سبحا'' سے ماخوذ ہے، جس کے ساتھ ایک ایسی حرکت کا نظریہ وابستہ ہے جو کسی جسم کے حرکت میں آنے سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر آپ یہ لفظ زمین پر کسی شخص کے لیے استعمال کریں گے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ

لڑھک رہا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مطلب کہ وہ شخص بھاگ رہا ہے یا چل رہا ہے۔ اگر یہ لفظ پانی میں کسی شخص کے لیے استعمال کیا جائے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوگی کہ وہ سطح آب پر تیر رہا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص پانی میں تیراکی کر رہا ہے۔

اسی طرح جب لفظ "یُسَبِّح" کسی آسمانی وجود کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ تو اس کا مطلب فقط یہی نہیں ہوگا کہ وہ وجود خلا میں حرکت کر رہا ہے، بلکہ اس کا پورا مطلب کوئی ایسا وجود ہوگا جو خلا میں حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محور پر گردش کر رہا ہے۔ اسکولوں کی بیشتر نصابی کتابوں میں یہ حقیقت لکھی گئی ہے کہ سورج اپنے محور پر گردش بھی کر رہا ہے جس کی تصدیق کسی ایسے مشاہداتی ساز و سامان کی مدد سے آسانی سے کی جا سکتی ہے جو سورج کا عکس کسی میز جتنی بڑی جگہ پر پھیلا کر دکھا سکے، اور نابینا پن کے خطرے کے بغیر سورج کے عکس کا مشاہدہ کیا جا سکے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ سورج کی سطح پر دھبے ہیں جو اپنا ایک چکر تقریباً پچیس دن میں مکمل کر لیتے ہیں۔ یعنی سورج کو اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً پچیس دن لگ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں سورج تقریباً 240 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے خلا میں محو سفر ہے۔ اس رفتار سے یہ تقریباً بیس کروڑ سال میں ہماری کہکشاں کے مرکز کے گرد اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾

(القرآن۔ سورۃ ۳۶، آیت ۴۰ سورۃ یٰسین)

"نہ سورج سے ہو کہ پکڑ لے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن سے اور ہر کوئی ایک چکر میں تیرتے ہیں۔"

اس آیت میں ایک ایسی بنیادی اور اہم حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جسے جدید فلکیات نے قدرے حال ہی میں دریافت کیا ہے، یعنی چاند اور سورج کے انفرادی مداروں کی موجودگی جن میں متحرک رہتے ہوئے وہ سفر کرتے ہیں۔

ایسا ساکن مقام جدید فلکیاتی ٹیکنالوجی کے ذریعہ درست طور پر شناخت کیا جا چکا ہے جس کی طرف سورج بشمول نظام شمسی اپیکس رواں ہے اس کو شمسی کہا جاتا ہے۔ نظام شمسی مجموعی طور پر خلا میں ہرکولیس نامی ستاروں کے مجمع میں واقع ایک مقام کی طرف رواں ہے جس کا تعین کیا جا چکا ہے۔

چاند کی اپنے محور پر گردش کی رفتار اور زمین کے گرد گردش کی رفتار یکساں ہے چاند کی محوری

گردش کا دورانیہ تقریباً 29.5 دن ہے۔

قرآن پاک کی آیات مبارکہ میں سائنسی حقائق کی درستگی پر حیران ہونا لازم ہے کیا ہمارے ذہنوں میں یہ سوال نہیں اُٹھتا، ''قرآن میں پیش کیے گئے علم کا ماخذ کیا تھا؟''

سورج گل ہو جائے گا:

سورج کی روشنی ایک کیمیائی عمل کی وجہ سے ہے جو سورج کی سطح پر پانچ ارب سال سے جاری ہے۔ مستقبل میں کبھی یہ عمل رک جائے گا، اور تب سورج مکمل طور پر گل ہو جائے گا جس کی وجہ سے زمین پر زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سورج کے وجود کی بے ثباتی کے بارے میں قرآن پاک فرماتا ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۸ سورۃ یاسین)

''اور سورج چلا جاتا ہے اپنے ٹھہرے ہوئے راستے پر یہ باندھا ہے اس زبردست باخبر نے۔''

یہاں عربی لفظ ''مستقر'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے پہلے سے متعین کیا ہوا یعنی اس آیت میں اللہ تعالیٰ سورج کا پہلے سے طے شدہ ایک مقام کی طرف جانے سے متعلق بیان کرتا ہے، جو کہ ایک طے شدہ وقت کے مطابق کیا جائے گا یعنی سورج گل ہو جائے گا۔

ستاروں کے مابین کا مادہ:

ماضی میں منظم فلکیاتی نظاموں سے باہر کی خلا کو کلی طور پر ''خالی خلا'' تصور کیا جاتا تھا پھر ماہرین فلکی طبیعیات نے اسی خالی خلا میں مادے کے پل دریافت کیے، مادے کے ان ''پلوں'' کو مراکز کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر آئن شدہ گیس پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں مثبت چارج والے آئن اور آزاد الیکٹرونوں کی یکساں تعداد ہوتی ہے۔ مادے کی تین تسلیم شدہ کیفیات ٹھوس، مائع اور گیس کو چھوڑ کر پلازما کو بسا اوقات مادے کی ''چوتھی حالت'' بھی کہا جاتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ میں قرآن پاک بین انجمی مادے (انٹر اسٹیلر میٹریل) کی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَ

یّام ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۹ الفرقان)

"جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دن میں۔"

بطور قیاس بھی کسی کے لیے یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ بین انجمی کہکشانی مادے کی موجودگی آج سے 1400 سال پہلے ہمارے علم میں تھی۔

وسیع ہوتی ہوئی کائنات:

1925 عیسوی میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے اس امر کی مشاہداتی شہادت فراہم کی کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات وسیع ہو رہی ہے۔ کائنات کا پھیلاؤ یہ بات آج مسلمہ سائنسی حقائق میں شامل ہے ملاحظہ کریں۔

قرآن کریم میں کائنات کی ماہیت کے حوالے سے کیا ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۱، آیت ۴۷)

"اور بنایا ہم نے آسمان ہاتھ کے بل سے اور ہم کو سب مقدور ہے۔"

عربی لفظ وسعون کا درست ترجمہ "اسے وسعت دے رہے ہیں۔" ہے جو مسلسل پھیلتی ہوئی کائنات کی طرف اشارہ ہے۔

دورِ جدید کا نامور ماہر فلکی طبیعات اسٹیفین ہاکنگ اپنی کتاب "اے بریف ہسٹری آف ٹائم میں رقمطراز ہے۔"

"یہ دریافت کہ کائنات پھیل رہی ہے، بیسویں صدی کے عظیم علمی وفکری انقلابات میں سے ایک ہے" سوچیں قرآن پاک نے کائنات کے وسیع ہونے کو اس وقت بیان فرمادیا ہے جب انسان نے دوربین بھی ایجاد نہیں کی تھی! اس کے باوجود، معترضین یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں فلکیاتی حقائق کا موجود ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں، کیونکہ عرب اس علم میں کافی ماہر تھے۔ فلکیات میں عربوں کی مہارت کی بات درست ہے لیکن وہ فراموش کرتے ہیں کہ فلکیات میں عربوں کے عروج سے بھی بہت پہلے قرآن پاک کا نازل ہو چکا تھا۔ نیز بہت سے سائنسی حقائق، مثلاً دھماکہ الجثہ سے کائنات کی تشکیل سے تو عرب اُس وقت بھی ناواقف تھے۔ قرآن پاک میں بیان کردہ سائنسی حقائق کسی بھی طرح سے علم فلکیات میں عربوں کی معلومات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ عرب تھے جنہوں نے قرآن میں بیان کی گئی فلکیاتی معلومات سے استفادہ کیا۔

باب سوم

طبیعیات

ایٹم قابل تقسیم ہے:

قدیم عہد میں ''نظریہ ایٹم'' کے عنوان سے ایک مشہور سوچ کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ نظریہ یونانیوں نے خصوصاً دیموقریطس نامی ایک یونانی فلسفی نے پیش کیا تھا، جو آج سے 23 سو سال پہلے گزرا تھا۔ دیموقریطس اور اس کے بعد اس کے ہم خیال لوگوں کا تصور تھا کہ مادے کی اکائی ایٹم ہے۔ قدیم عرب بھی اسی تصور کو تسلیم کیا کرتے تھے۔ عربی لفظ ''ذرہ'' کا عمومی مفہوم وہی ہوا کرتا تھا جو یونانیوں کے یہاں ایٹم کا تھا۔ جدید تاریخ میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ایٹم کی تقسیم ممکن ہے۔ ایٹم کے قابل تقسیم ہونے کا تصور بیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت ہے۔ چودہ صدیاں پہلے خود عربوں کے لیے بھی یہ تصور نہایت غیر معمولی ہوتا۔ جن کے نزدیک ''ذرہ'' وہ آخری حد تھی جس کے بعد اور تقسیم ناممکن تھی۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن پاک نے واضح طور پر اس حد کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۴، آیت ۳)

''اور کہنے لگے منکر نہ آئے گی ہم پر قیامت، تو کہہ کیوں نہیں، قسم ہے میرے رب کی البتہ آئے گی تم پر اس عالم الغیب کی، غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے

بڑی جو نہیں ہے کھلی کتاب میں۔"

مندرجہ بالا آیت مبارکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے پوشیدہ اور ظاہر چیز سے باخبر ہونے کے بارے میں دلیل ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، چاہے وہ ایٹم سے چھوٹی یا بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ تو واضح ہوا کہ قرآن میں درج ہے کہ ایٹم سے مختصر اشیاء بھی وجود رکھتی ہے ایک ایسی حقیقت جو جدید سائنس نے کچھ عرصہ قبل ہی دریافت کی۔

باب چھارم

آبیات

پانی کا چکر (آبی چکر):

"آبی چکر" کو پہلے پہل 1580 عیسوی میں برنارڈ پیلیسی نامی ایک شخص نے پیش کیا تھا۔ جس نے بتایا کہ سمندروں سے کس طرح پانی کی تبخیر ہوتی ہے اور کس طرح وہ سرد ہو کر بادلوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر یہ بادل خشکی پر آگے کی طرف بڑھتے ہیں اونچا ہوتے ہیں، جن میں پانی کی تکثیف ہوتی ہے اور بارش برستی ہے۔ یہ پانی جھیلوں، جھرنوں، ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں بہتا ہوا واپس سمندر میں چلا جاتا ہے اس طرح پانی کا یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ ساتویں صدی قبل از مسیح میں ملٹس شہر کے تھیلو نامی یونانی فلسفی کو یقین تھا کہ سطح سمندر پر باریک باریک آبی قطروں کی پھوار پیدا ہوتی ہے نیز ہوا اس چھڑکاؤ کو اُٹھا لیتی ہے اور خشکی کے دور دراز علاقوں پر لے جا کر برسا دیتی ہے۔ یہی بارش ہوتی ہے۔

پرانے وقتوں میں لوگ یہ نہیں جانتے کہ زیر زمین پانی کا ماخذ کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہوا کی زبردست قوت کے زیر اثر سمندر کا پانی براعظموں (خشکی) میں اندرونی حصوں تک ایک خفیہ راستے یا "عظیم تاریکی" (Greet Abyss) سے آتا ہے، سمندر سے ملے اس تصوراتی راستہ کو افلاطون کے زمانے سے "تارتارس" کہا جاتا تھا، حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے مفکر، ڈیسکارٹس نے بھی انہی خیالات سے اتفاق کیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تک ارسطو کا نظریہ ہی زیادہ معروف تھا جس کے مطابق، پہاڑوں کے بیچ غاروں میں پانی کی تکثیف ہوتی اور وہ چشموں کا باعث بننے والی زیر زمین جھیلیں بناتا ہے۔ آج معلوم ہو چکا ہے کہ بارش کا پانی زمین میں دراڑوں کے راستے رس رس کر زیر زمین پہنچتا ہے اور چشموں کا ماخذ بنتا ہے۔ اس آیات قرآنی میں وضاحت فرمائی گئی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۲۱)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔"

﴿يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۰، آیت ۲۴)

"آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد حیات بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل استعمال کرتے ہیں۔"

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۱۸)

"اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔"

کوئی دوسری کتاب، جو 1400 سال قدیم ہو، آبی چکر کی اتنی درست وضاحت بیان نہیں کرتی۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۶، آیت ۱۱)

"قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔"

بادلوں کو بار آور (Impregnate) کرتی ہوائیں:

﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۵، آیت ۲۲)

''اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں۔''

یہاں عربی لفظ ''لواقح'' استعمال کیا گیا ہے، جو ''لاقح'' کی جمع ہے اور ''لاقحہ'' سے ماخوذ ہے، جس سے مراد ''بار آور'' کرنا یعنی ہوا، بادلوں کو نزدیک دھکیلتی ہے جس کی وجہ سے ان میں تکثیف کا عمل زیادہ ہوتا ہے اور بجلی چمکنے اور بارش ہونے لگتی ہے قرآن پاک کی آیات مبارک میں اس طرح فرمانِ خداوندی ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴، آیت ۴۳)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنادیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو کھینچتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو

آسمان میں پھیلاتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے
، جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و
خرم ہو جاتے ہیں۔''

آبیات (ہائیڈرولوجی) پر دستیاب، جدید معلومات بھی قرآنِ پاک میں بیان کردہ متعلقہ وضاحتوں کی پوری طرح توثیق کرتی ہیں۔ قرآن عظیم کی متعدد آیات مبارکہ میں آبی چکر کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

نیز سورة 0,68,56,11,90,50 اور 30:67 میں بھی آبیات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جدید معلومات آبیات درحقیقت قرآنی ارشادات کی تائید کے لیے کافی ہے۔

باب پنجم

ارضیات

میخوں کی مانند گڑے ہوئے پہاڑ:

علم الارضیات میں تہہ پڑنے یا قشرِ ارض میں تہہ پڑنے کے سبب پہاڑی سلسلوں کی تشکیل ہوئی، ہماری رہائش گاہ سطح زمین ٹھوس چھلکے کی مانند ہے جبکہ اندرونی پرتیں انتہائی گرم اور مائع ہیں جہاں زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ آج اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے کے پہاڑوں کے مضبوط کھڑے رہنے کا تعلق سطح زمین میں تہہ پڑنے سے ہے کیونکہ انہی تہوں نے پہاڑوں کی تشکیل اور مضبوط بنیادوں کو مواد فراہم کیا۔

بمطابق ماہرین ارضیات زمین کا نصف قطر تقریباً 6035 کلومیٹر ہے اور قشرِ ارض، جس پر ہم آباد ہیں، موٹائی 2 کلومیٹر سے لے کر 35 کلومیٹر تک ہے۔ چونکہ قشرِ ارض بہت پتلی ہے، لہٰذا اس کے ہلنے کا امکان بھی بہت قوی ہے، ایسے میں پہاڑ خیمے کی میخوں کی طرح امور سرانجام دیتے ہیں جو قشرِ ارض کو تھام لیتے ہیں اور اسے مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی بالکل ایسا ہی فرمان ہے۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾

(القرآن: سورۃ ۷۸، آیات ۶ تا ۷)

"کیا ہم نے نہیں بچھایا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔"

یہاں عربی لفظ "اوتاد" کے معنی بھی میخیں ہی نکلتا ہے، ویسی ہی میخیں جیسی کہ خیمے کو باندھے رکھنے کے لیے لگائی ہیں۔ ارضیاتی تہوں کی گہری پوشیدہ بنیادیں بھی یہی ہیں۔

ڈاکٹر فرینک پریس "زمین" نامی اس کتاب کے مصنفین میں سے ایک ہیں۔ جو دنیا بھر کی کئی جامعات میں ارضیات کی بنیادی حوالہ جاتی نصابی کتاب ڈاکٹر فرینک پریس 12 سال تک امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ رہے ہیں جبکہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے

زمانے میں صدارتی مشیر برائے سائنس بھی پہنچے ہیں اس کتاب میں وہ پہاڑوں کی وضاحت، کلہاڑی کے پھل جیسی شکل سے کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہاڑ بذاتِ خود ایک بڑے وجود کا چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں بہر گہرائی تک ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر فرینک پریس کے مطابق سطح زمین کی پائیداری اور قیام پذیری میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے، قرآن پاک واضح طور پر یہ فرماتا ہے کہ انہیں اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ زمین کو لرزتے رہنے سے بچائیں:

﴿وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

قرآن کریم کے ارشادات جدید ارضیاتی علوم سے مکمل طابقت رکھتے ہیں۔

پہاڑوں کو مضبوطی سے گاڑا گیا ہے:

قشر ارض کئی ٹھوس ٹکڑوں، یعنی ''پلیٹوں'' میں ٹوٹی ہوئی ہے جن کی اوسط موٹائی تقریباً 100 کلو میٹر ہے۔ یہ پلیٹیں، جزوی طور پر پگھلے ہوئے سیال کے اوپر تیر رہی ہیں جس کو (Aesthenosphere) کہا جاتا ہے۔ پہاڑ عموماً پلیٹوں کی بیرونی طرف پائے جاتے ہیں۔ سطح زمین، سمندر کے نیچے 5 کلو میٹر موٹی ہے، جب کہ خشکی پر اس کی اوسط موٹائی 35 کلو میٹر تک ہے لیکن پہاڑی سلسلوں میں سطح زمین کی موٹائی 80 کلو میٹر تک ہے۔ یہ ہیں ایسی مضبوط بنیادیں جن پر پہاڑ ایستادہ ہیں۔ پہاڑوں کی مضبوط بنیادوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۲)

''اور پہاڑوں کو قائم کر دیا۔''

اسی طرح کا پیغام سورۃ 88، آیت 19 میں بھی دیا گیا ہے۔ پس، یہ ثابت ہوا کہ قرآن کریم میں پہاڑوں کے بارے میں دی گئی معلومات کلی طور پر جدید ارضیاتی دریافتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔

باب ششم

بحریات

شیریں اور نمکین آبیان کے مابین پردہ:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۵، آیت ۱۹ تا ۲۰)

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

ان آیات کے عربی متن میں لفظ ''برزخ'' استعمال ہوا جس کا مطلب رکاوٹ یا تقسیم ہے ۔تاہم اسی تسلسل میں ایک عربی لفظ ''مرج'' بھی استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ''وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور آپس میں ضم ہو جاتے ہیں'' بنتا ہے۔ ابتدائی عدد کے مفسرین قرآن کے لیے ایسی وضاحت مشکل تھی کہ پانی کے دو مختلف وجود سے متعلق دو متضاد آمیزش سے کیا مراد ہے۔ مطلب یہ کہ دو قسم کے پانی کے ملاپ کے باوجود ان کے درمیان پردہ بھی ہو۔ جدید سائنس نے بتایا کہ جس جگہ دو مختلف سمندر آپس میں ملتے ہیں، وہاں وہاں ان کے درمیان ''پردہ'' بھی ہوتی ہے، دو بحیروں کو تقسیم کرنے والی روک یہ ہے کہ ان میں سے درجہ حرارت نمکیات اور کثافت ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ (پرنسپلو آف اوشیوگرافی، ڈیوس، صفحہ 92 تا 93)

ماہرین بحریات مذکورہ آیات مبارکہ کی بہتر وضاحت کر سکتے ہیں۔ دو بحیروں کے درمیان پانی ہی کی ایک باریک اور غیر مرئی پردہ قائم ہوتا ہے جس سے گزر کر ایک بحیرہ کا پانی دوسرے میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک بحیرہ کا پانی،

دوسرے بحیرہ میں شامل ہوتا ہے تو وہ اپنی انفرادی خصوصیات کھو دیتا ہے اور دوسرے کے

پانی کے ساتھ ہم جنس آمیزش ہو جاتا ہے اس طرح یہ پردہ کسی عارضی ہم آمیزی والے علاقے کا کام کرتا ہے، جو دونوں بحیروں کے مابین واقع ہوتا ہے۔ یہ درج ذیل آیت قرآنی میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۷، آیت ۶۱)

''اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔''

ایسا واقعہ متعدد مقامات پر ہوتا ہے جن میں جبل الطر کے علاقے میں بحیرۂ روم اور بحیرا وقیانوس کے ملاپ کا مقام قابل ذکر ہے اسی طرح کیپ پوائنٹ اور کیپ پینسولا جنوبی افریقہ میں بھی ایک سفید پٹی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں جہاں بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوتا ہے۔

مگر جب قرآن پاک تازہ اور کھارے پانی کے درمیان پردے کا تذکرہ کرتا ہے تو اس پردے کو ایک ''ممنوعہ علاقے'' کے طور پر بتاتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۳)

''اور وہی جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

جدید سائنس کے مطابق دریا کے دہانوں پر جہاں تازہ (میٹھا) اور نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں اس کی کیفیت اُن مقامات سے قدرے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندروں کے نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں یہ دریافت ہوا ہے کہ دہانوں میں تازہ پانی کو کھاری پانی سے جو چیز جدا کرتی ہے

وہ ''پکنو کلائن زون'' ہے جس کی کثافت میں اضافہ و کمی ہوتی رہتی ہے۔ جو مختلف پرتوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہے۔ (اوشنو گرافی، از گروس صفحہ 242) پردہ کے اس پانی میں نمک کا تناسب (شوریت) تازہ پانی اور کھاری پانی، دونوں ہی سے مختلف ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنو گرافی، صفحہ 244 انٹروڈکٹری اوشنو گرافی، صفحہ 300 تا 301) اس مظہر کا مشاہدہ مصر میں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں دریائے نیل، بحیرۂ روم میں گرتا ہے۔

قرآن پاک میں بیان کیے گئے ہیں ان سائنسی مظاہر کی تصدیق ''ڈاکٹر ولیم ہے'' جو کولوراڈو یونیورسٹی امریکہ کے مشہور ماہر بحریات اور علوم ارضی کے پروفیسر نے بھی کی ہے۔

سمندر کی گہرائی میں تاریکی:

عالمی طور پر تسلیم شدہ ماہر بحری ارضیات و سابقہ پروفیسر شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ سے درج ذیل قرآنی آیت پر تبصرہ کرنے کے لیے کیا گیا:

﴿اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴ آیت ۴۰)

''یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس کے اوپر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ اللہ جسے نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔''

پروفیسر راؤ نے بتایا کہ سائنس دان صرف حال ہی میں جدید آلات کی مدد سے یہ تصدیق کر سکے ہیں کہ سمندر کی گہرائیوں میں تاریکی ہوتی ہے۔ یہ انسان کے بس میں نہیں کہ وہ 20 یا 30 میٹر سے زیادہ گہرائی میں اضافی ساز و سامان اور آلات سے لیس ہوئے بغیر غوطہ لگا سکے۔ نیز، انسانی جسم میں اتنی قوت مدافعت نہیں کہ 200 میٹر سے زیادہ گہرائی میں پڑنے والے آبی دباؤ کا سامنا کر کے زندہ رہ سکے۔ یہ آیتِ مبارک تمام سمندروں کی طرف اشارہ نہیں کرتی کیونکہ ہر سمندر تہہ در تہہ تاریکی کا حامل نہیں ہے لیکن یہ آیتِ مبارکہ بطور خاص گہرے سمندروں کی جانب اشارہ

کرتی ہے جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ''وسیع اور گہرے سمندر کی تاریکی'' کا حوالہ دیا گیا ہے، گہرے سمندر کی یہ تہہ در تہہ تاریکی دو اسباب کا نتیجہ ہے۔

اوّل:

عام روشنی کی ایک شعاع سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ سات رنگ بالترتیب، بنفشی، کاسنی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی، سرخ ہیں۔ روشنی کی شعاع جب پانی میں داخل ہوتی ہے تو انعکاس کے عمل سے گزرتی ہے بالائی 10 سے 15 میٹر کے پانی میں لال رنگ جذب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غوطہ خور پانی میں 25 میٹر کی گہرائی میں زخمی ہو جائے تو وہ اپنے خون میں سرخی نہیں دیکھ پائے گا کیونکہ لال رنگ کی روشنی اتنی گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ اسی طرح 30 سے 50 میٹر تک کی گہرائی آتے آتے مالٹائی روشنی بھی مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہے۔ زرد روشنی 50 سے 110 میٹر تک، نیلی روشنی 200 میٹر سے کچھ زیادہ تک جب کہ کاسنی اور بنفشی روشنی اس سے بھی کچھ زیادہ گہرائی تک پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہیں، رنگوں کے غائب ہونے کی اس ترتیب کے سبب سمندر بھی مرحلہ وار تاریک ہوتا چلا جاتا ہے، یعنی اندھیرے کا ظہور بھی روشنی کی تہہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ 1000 میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں مکمل اندھیرا ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنز از: ایلڈر اور پرنیٹا صفحہ 27)

دوم:

دھوپ کی شعاعیں بادلوں میں جذب ہوتی ہیں۔ جو نتیجتاً روشنی کی شعاعوں کو ادھر اُدھر بکھیرتے ہیں، جس کی وجہ سے بادلوں کے نیچے تاریکی کی ایک (تہہ) بن جاتی ہے۔ یہ تاریکی کی پہلی تہہ ہے جب روشنی کی شعاعیں سمندر کی سطح سے ٹکراتی ہیں تو وہ لہروں کی سطح سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہیں اور جگمگاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایسی لہریں جو روشنی کو منعکس کرتی ہیں تاریکی کا سبب بنتی ہیں۔ غیر منعکس شدہ روشنی، سمندر کی گہرائیوں میں چلی جاتی ہے، لہٰذا سمندر کے دو حصے ہیں سطح کی انفرادی علامت نور اور گرمی ہیں، جب کہ اندھیرا سمندری گہرائیوں کی خاصیت ہے علاوہ ازیں گہرے سمندر اور سطح سمندر کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی شے لہریں ہیں۔

داخلی لہریں گہرے پانیوں کا احاطہ کرتی ہیں کیونکہ گہرے پانیوں کی کثافت اپنے اوپر موجود پانیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اندرونی پانی میں اندھیرا ہوا ہے سمندر کی اتنی گہرائی میں مچھلیاں بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ان کے جسم روشنی کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔“

یعنی ایسی لہروں کے اوپر مزید اقسام کی لہریں ہیں، جو سمندر کی سطح پر پائی جاتی ہیں۔ اسی تسلسل میں یہ آیت مبارکہ فرماتی ہے۔” پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں مطلب تاریکیاں ہیں جو اوپر تلے مسلسل ہیں۔ مزید وضاحت کی گئی، یہ بادل وہ مسلسل پردے ہیں جو مختلف سطحوں پر روشنی کے مختلف رنگ جذب کرتے ہوئے اندھیرے میں اضافہ کرتے ہیں۔

پروفیسر درگاراؤ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ ”1400 سال پہلے کوئی عام انسان اس مشاہدے کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا یہ معلومات یقیناً کسی مافوق الفطرت ذریعے سے آئی ہیں۔“

﴿وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ السَّمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۴)

”اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اس کے لیئے جد اور سسرال اور تیرا رب سب کچھ کر سکتا ہے۔“

یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ چودہ سو سال قبل کوئی انسان یہ اندازہ لگا سکے کہ ہر جاندار شئے کا ماخذ پانی ہی ہے؟ خصوصاً عرب کے اس صحراؤں کا رہائشی جہاں پانی تقریباً ناپید ہو کس طرح ایسا اندازہ قائم کر سکتا تھا؟

باب ہفتم

نباتیات

پودوں میں نر اور مادہ کی اصناف:

گو کہ جدید نباتیات نے یہ دریافت کیا ہے کہ پودوں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ متعدد پودے یک صنفی بھی ہوتے ہیں جن میں ہر دو جنس کی خصوصیات مرکوز ہوتی ہیں لیکن قدیم عہد میں انسان کو پودوں میں جانوروں کی طرح کے اصناف کا علم نہیں تھا۔ البتہ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى﴾ (القرآن، سورۃ 20، آیت 53)

''اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے طرح طرح کی سبزی۔''

پھلوں میں نر اور مادہ کا فرق:

﴿وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۳، آیت ۳)

''اور میوے کے رکھے اس میں جوڑے دو دو قسم۔''

اعلیٰ درجے کے پودوں (Superior Plants) میں نسل خیزی کی آخری پیداوار اُن کے پھل (Fruits) ہوتے ہیں۔ پھل سے پہلے پھول کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں نر اور مادہ اعضاء (Organs) یعنی اسٹیمنز (Stamens) اور اوویولز (Ovules) ہوتے ہیں جب کوئی زردانہ (Pollen) کسی پھول تک پہنچتا ہے، تبھی وہ پھول ''بارآور'' ہو کر پھل میں بدلنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھل پک جاتا ہے اور اگلی نسل کو جنم دینے والے بیج سے بھرپور ہوتا ہے۔

تمام پھل اس امر کے شاہد ہیں کہ نر اور مادہ کی اصناف پودوں میں موجود ہے۔ ایسی صداقت جس کو قرآن پاک عرصہ دراز قبل بیان کر چکا ہے۔

پودوں کی بعض اقسام میں غیر زرخیز پھولوں سے بھی پھل پیدا ہو سکتے ہیں جو پارتھینو کارپک فروٹ کہلاتے ہیں جن میں کیلا، انناس، انجیر، نارنگی، اور انگور وغیرہ کی اقسام شامل ہیں۔ ان پودوں میں بھی بہت واضح جنسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

ہر شے کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے:

﴿وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾

(القرآن، سورۃ ۵۱، آیت ۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔''

اس آیت میں ''ہر چیز'' کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ انسانوں، جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی بار والے الیکٹرونوں اور مثبت بار والے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

﴿سُبْحٰنَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۶)

''پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا اُن اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر شے جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہے لازماً ان میں ایسی اشیاء بھی شامل ہیں جن کے متعلق آج کا انسان لاعلم ہے اور ممکنہ طور پر مستقبل میں یہ اشیاء دریافت ہو جائیں۔

باب ہشتم

حیوانیات

جانوروں اور پرندوں کا معاشرتی ماحول:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴾ (القرآن، سورۃ 6، آیت 38)

"زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔"

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جانور اور پرندے بھی آبادیوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ یعنی اُن میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور امور سرانجام دیتے ہیں۔

پرندوں کی پرواز:

﴿اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ١٦، آیت ٧٩)

"کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں۔ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں

ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

ایک اور آیت مبارکہ میں پرندوں پر کچھ اس انداز سے بات کی گئی ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ﴾

(القرآن: سورۃ ۶۷، آیت ۱۹)

"یہ لوگ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

عربی لفظ "امسک" کے لغوی معنی کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا، روکنا، تھامنا، یا کسی کی کمر پکڑ لینا" ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں "یُمْسِکُھُن" سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے، ان آیات میں باور کیا گیا ہے کہ پرندوں کے طرزِ عمل کا مکمل انحصار اُنہی قوانین پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ جدید سائنسی علوم سے ثابت ہو چکا ہے کہ بعض پرندوں میں پرواز کی بے مثل اور بے عیب صلاحیت کا تعلق اس وسیع اور مجموعی منصوبہ بندی سے ہے جو اُن کی حرکات و سکنات سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً ہزاروں میل دور تک نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی جینیاتی رموز میں اُن کے سفر کی تمام تر تفصیلات و جزئیات موجود ہوتی ہیں، جو ان پرندوں کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ نہایت کم عمری میں بھی لمبے سفر کے کسی تجربے کے بغیر، کسی رہنما کے بغیر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیں اور پیچیدہ راستوں سے پرواز کرتے چلے جائیں۔ بات صرف سفر کی یک طرفہ تکمیل ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ وہ ایک مخصوص تاریخ پر اپنے عارضی مسکن سے پرواز کرتے ہیں اور ہزاروں میل واپسی کا سفر کر کے ایک بار پھر اپنے گھر نسلوں تک بالکل ٹھیک جا پہنچتے ہیں۔

پروفیسر ہیمبر گر نے اپنی کتاب "پاور اینڈ فریجیلٹی" میں "مٹن برڈ" نامی ایک پرندے کا ذکر کیا ہے، جو بحرالکاہل کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والا یہ پرندہ (چوبیس ہزار) کلومیٹر کا فاصلہ 8 کی شکل میں چکر لگا کر طے کرتا ہے۔ یہ اپنا سفر چھ ماہ میں پورا کرتا ہے اور ما م ابتداء تک زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی تاخیر سے واپس پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کسی سفر کے لیے نہایت پیچیدہ معلومات کا ہونا ضروری ہے جو اس پرندے کے اعصابی خلیات میں محفوظ ہونی چاہئیں۔ یعنی ایک باضابطہ "پروگرام" کی شکل میں پرندے کے جسم میں موجود اور ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہے۔ اگر

پرندے میں کوئی پروگرام ہے تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے تشکیل دینے والا بھی یقینی طور پر وجود رکھتا ہے۔

شہد کی مکھی اور اس کا ہنر:

﴿وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیات ۶۸ تا ۶۹)

''اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹہنیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

وان فرش نے شہد کی مکھیوں کے طرزِ عمل اور ان میں رابطہ وابلاغ (کمیونی کیشن) کی تحقیق پر 1973ء کا نوبل انعام حاصل کیا۔ شہد کی کسی مکھی کو جب کوئی نیا باغ یا پھول دکھائی دیتا ہے تو وہ اپنے چھتے میں واپس جاتی ہے اور اپنی ساتھی شہد کی مکھیوں کو اُس مقام کی ٹھیک ٹھیک سمت اور وہاں پہنچانے والے راستے کے مفصل نقشے سے آگاہ کرتی ہے۔ شہد کی مکھی، پیغام رسانی کا یہ کام خاص طرح کی جسمانی حرکات سے لیتی ہے جنہیں ''شہد کی مکھی کا رقص'' (Bee Dance) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عام معنوں والا رقص نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہد کی ''کارکن مکھیوں'' (Worker Bees) کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ پھول کس سمت ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں کس انداز سے پرواز کرنا ہوگی۔ تاہم شہد کی مکھی کے بارے میں یہ تمام معلومات ماڈرن فوٹو گرافی و مشکل شواہد سے حاصل ہوئی ہیں۔

مگر دیکھیں مذکورہ بالا آیت مقدس میں قرآن الکریم نے کتنی تیزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے شہد کی مکھی کو خاص ہنر عطا کرنے کا ذکر کیا ہے، جس سے بھرپور ہو کر وہ خدا تعالیٰ کے

بتائے ہوئے راستے کو تلاش کر لیتی ہے۔

مزید قابلِ غور امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں شہد کی مکھی کے لیے جو صنف استعمال کی گئی ہے، وہ مادہ کی ہے (یعنی، فاسلکی اور کلی) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غذا کی تلاش میں نکلنے والی شہد کی مکھی ''مادہ'' ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر سپاہی یا کارکن شہد کی مکھی بھی مادہ ہی ہوتی ہے۔

دلچسپی امر یہ ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے ''ہنری دی فورتھ'' میں بعض کردار شہد کی مکھیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ مکھیاں سپاہی ہوتی ہیں اور اُن کا ایک بادشاہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ شہد کی کارکن مکھیاں ''نر'' ہوتی ہیں اور وہ شہید کی ''بادشاہ مکھی'' کو جوابدہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ شہد کی کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں اور وہ شہد کی بادشاہ مکھی کو نہیں بلکہ ''ملکہ مکھی'' کو اپنی رپورٹ پیش کرتی ہیں۔ اس بارے میں کیا کہا جائے کہ گذشتہ 300 سالوں میں جدید تحقیق کے سبب یہ سب کچھ دریافت ہو سکا ہے۔

مکڑی کا جال غیر پائیدار خانہ:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۹، آیت ۴۱)

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔''

مکڑی کے جالے کو نازک اور کمزور کے طور پر بیان کرنے کے علاوہ، قرآن پاک نے قرآن کریم نے مکڑی کے جال کو باریک اور کمزور قرار دیتے ہوئے مکڑی کے گھریلو تعلقات کو بھی غیر پائیدار قرار دیا ہے جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ اکثر مکڑی اپنے نر کو ختم کر دیتی ہے، اور اس کی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی اور سے مانگتے ہیں۔

چونٹیوں کا طریقہ زندگی اور باہمی گفتگو:

﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ

فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۷، آیات ۱۷ تا ۱۸)

''سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے، اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔''

ممکن ہے کہ زمانہ ماضی میں بعض عناصر نے قرآن کریم میں مذکورہ بالا چیونٹیوں کے مکالمے پر تنقید کرتے ہوئے اسے صرف کہانیوں کی کتابوں کی تحریر ہی قرار دیا ہو لیکن حالیہ دور میں چیونٹیوں کے طرز زندگی و باہمی گفتگو اور مشکل معلومات کے تبادلے کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ جو عصر حاضر سے قبل کے انسانوں کو حاصل نہ تھیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ وہ جانور یا وہ حشرات (کیڑے مکوڑے) جن کا طرز حیات انسانی معاشرت سے غیر معمولی مماثلت رکھتا ہے، وہ چیونٹیاں ہی ہیں۔ اس کی تصدیق چیونٹیوں کے بارے میں درج ذیل حالیہ دریافتوں سے بھی ہوتی ہے

- ✫ چیونٹیاں بھی اپنے مردوں کو اس طرح دفناتی ہیں۔ جیسے انسان دفناتے ہیں۔
- ✫ چیونٹیوں میں کارکنان کی تقسیم کا پیچیدہ نظام موجود ہے جس میں منتظم، سپروائزر، فورمین اور کارکن وغیرہ شامل ہیں۔
- ✫ کبھی وہ آپس میں ملتی ہیں اور بات چیت کرتی ہیں۔
- ✫ ان میں باہمی تبادلہ خیال کا ترقی یافتہ نظام موجود ہے۔
- ✫ ان کی آبادیوں میں باقاعدہ ''مارکیٹیں'' ہوتی ہیں جہاں وہ اشیاء کا تبادلہ کرتی ہیں۔
- ✫ یخ سردی میں لمبے عرصے تک زیر زمین رہنے کے لیے وہ اناج کے دانوں کا ذخیرہ بھی کرتی ہیں۔ اور اگر کسی دانے سے پودا بننے لگے تو وہ فوراً اس کی جڑیں کاٹ دیتی ہیں۔

جیسے انہیں یہ پتا ہو کہ اگر وہ اس دانے کو یونہی چھوڑ دیں گی تو وہ بڑھنا اور پکنا شروع کر دے گا۔ اگر ان کا محفوظ کیا ہوا اناج کسی بھی وجہ سے مثلاً بارش سے تر ہو جائے تو وہ اسے اپنے بل سے باہر لے جاتی ہیں اور دھوپ میں خشک کرتی ہیں جب اناج خشک ہو جاتا ہے تب وہ اسے بل میں واپس لے جاتی ہیں۔ یعنی یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ علم ہو کہ نمی کی وجہ سے اناج کے دانے سے جڑیں نکل پڑیں گی جو دانے کو قابل خوراک نہیں چھوڑیں گی۔

باب نہم

طب

شہد حیات انسانی کے لیے شفا:

شہد کی مکھی پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور اسے اپنے جسم میں ہی شہد میں تبدیل کرتی ہے۔ اس شہد کو وہ اپنے چھتے میں تشکیل شدہ خانوں میں ذخیرہ کرتی ہے۔ صرف چند صدیوں قبل ہی انسان کو یہ معلوم ہو سکا کہ شہد اصل میں شہد کی مکھی کے پیٹ سے نکلتا ہے، مگر اس حقیقت کو قران کریم 1400 سال پہلے درج ذیل آیت مقدس میں بیان کر دی تھی۔

﴿ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۹)

''ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس، اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہ اس مکھی کے (پیٹ کے) اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

علاوہ ازیں حال ہی میں شہد میں شفا بخش خصوصیات دریافت ہوئی ہیں اور یہ ہلکے درجے کے کام بھی کرتا ہے۔ دوسری زخم مندمل کرنے کے امور بھی سرانجام دیتا ہے، جنگ عظیم دوئم میں روسیوں نے بھی اپنے زخمی فوجیوں کے زخم مندمل کرنے کے لیے شہد کا استعمال کیا تھا۔ شہد کی خاصیت یہ ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا ہے اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے۔ شہد کی

کثافت کے باعث کوئی پھپھوندی یا جراثیم، زخم میں پروان نہیں چڑھ سکتی۔

ایک عیسائی راہبہ سسٹر کیرول نامی نے برطانوی شفا خانوں میں سینے اور الزائیمر کے عارضوں میں مبتلا بائیس نا قابل علاج مریضوں کا علاج پروپولس نامی شہد کی مکھیوں سے پیدا ہونے والے مادے سے کیا۔ وہ اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف سربند کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پودے سے ہونے والی الرجی میں مبتلا ہو جائے تو اسی پودے سے حاصل شدہ شہد اس شخص کو دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ الرجی کے خلاف مدافعت پیدا کر لے۔ شہد وٹامن کے اور فرکٹوز سے بھی بھرپور ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں شہد کی تشکیل اور خصوصیات کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں اس کوئی سو سالوں بعد انسان نے اپنے مشاہدے و تجربے سے دریافت کیا۔

باب دہم

علم العملیات الصفاء

دورانِ خون اور دودھ:

دورانِ خون کی توضیح کرنے والے پہلے مسلمان سائنسدان ابن النفیس سے 600 سال قبل اور مغرب میں اس دریافت کو متعارف کرانے والے ولیم ہاروے سے ایک ہزار سال قبل قرآن کریم نازل کیا گیا تھا۔ تقریباً 13 سو سال قبل یہ حقیقت منظر عام پر آئی تھی کہ آنتوں کے اندر ایسا کیا کچھ ہوتا ہے جو نظام ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعے دیگر جسمانی اعضاء کی نشو و نما کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ، جو دودھ کے اجزاء کے ماخذ کی وضاحت کرتی ہے، اس تصور کی عین مطابقت میں ہے۔

مذکورہ بالا تصور کے حوالے سے آیت قرآنی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا اہم ہے کہ آنتوں میں کیمیائی تعاملات (Reactions) واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ آنتوں ہی سے ہضم کردہ غذا سے اخذ کیے ہوئے مادے ایک پیچیدہ نظام سے گزر کر دورانِ خون میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ (مادے) جگر سے ہو کر گزرتے ہیں جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے۔ خون ان اجزا (مادوں) کو تمام اعضا تک پہنچاتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والے (چھاتیوں کے) غدود بھی شامل ہیں۔

عام الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنتوں میں موجود غذا کے بعض مادے آنتوں کی دیوار سے سرایت کرتے ہوئے خون کی شریانوں میں داخل ہو جاتے ہیں، اور پھر خون کے راستے یہ دورانِ خون کے ذریعے کئی اعضاء تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ عملیاتی تصور مکمل طور پر ہماری گرفت میں آ جائے گا، اگر ہم قرآن پاک کی درج ذیل آیات مقدس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۶)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۲۱)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو۔''

چودہ صدیوں سال قبل، قرآن پاک کی فراہم کردہ یہ وضاحت جو گائے میں دودھ کے پیدا ہونے کے حوالے سے ہے، حیرت انگیز طور پر جدید فعلیات سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہے جس نے اس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

باب یازدھم

علم الجنینیات

مسلمان تحقیق کی جستجو میں:

مسلمان محققین کے ایک گروہ نے یمن کے مشہور محقق شیخ عبدالمجید الزندانی کی سربراہی میں جنینیات (ایمبریالوجی) اور دیگر (سائنسی) علوم کے بارے میں قرآن پاک اور مستند احادیث سے معلومات جمع کیں اور انہیں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پھر وہ قرآن کریم کے ایک مشورے پر عمل پیرا ہوئے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۴۳)

"اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔"

جب قرآن پاک اور مستند احادیث مبارکہ سے جنینیات کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات کو یکجا کر کے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تو انہیں پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا جو یونیورسٹی آف ٹورنٹو (کینیڈا) میں ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ اور جنینیات کے پروفیسر ہیں اور جنینیات کے حوالے سے مقتدر اور معتبر ترین شخصیت بھی مانے جاتے ہیں۔ ان سے پیش کیے گئے علمی مواد کے بارے میں رائے طلب کی گئی۔ محتاط مطالعے کے بعد ڈاکٹر کیتھ مور نے جنینیات کے متعلق آیات قرآنی اور مستند احادیث میں بیان کردہ تقریباً تمام معلومات کو جدید سائنسی دریافتوں

کی عین مطابقت میں قرار دیا اور کہا کہ جدید جنینیات سے ان کا بھرپور اتفاق ہے اور وہ کسی بھی طرح جدید جنینیات سے اختلاف نہیں کرتے۔ انہوں نے اضافہ کیا کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کی سائنسی درستگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ آیات سائنسی مطابقت میں صحیح ہیں یا غلط، کیونکہ خود انہیں ان آیات میں دی گئی معلومات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کے متعلق جنینیات کے جدید مطالعات اور مقالہ جات تک میں بھی کچھ موجود نہ تھا۔ ایسی ہی ایک آیت مبارکہ درج ذیل ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o﴾ (القرآن: سورۃ ۹۶، آیات ۱ تا ۲)

''پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

یہاں عربی لفظ 'علق'' کا ایک مطلب تو خون کا لوتھڑا ہے، جب کہ دوسرا مطلب کوئی ایسی شئے ہے جو'' چمٹ'' جاتی ہو، یعنی جونک جیسی کوئی شے ہو۔ ڈاکٹر کیتھ مور کو علم نہیں تھا کہ حمل کے ابتدائی مرحلوں میں جنین (ایمبریو) کی شکل جونک جیسی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے انہوں نے نہایت طاقتور اور حساس آلات کی مدد سے جنین کے ابتدائی مراحل کا بہت احتیاط سے مطالعہ کیا اور پھر ان تصاویر کا موازنہ جونک کے خاکے سے کیا۔ وہ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت دیکھ کر حیران ہو گئے، اسی طرح انہوں نے جنینیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جو قرآن پاک سے تھیں اور جن سے وہ قبل ازیں واقف نہیں تھے۔

ڈاکٹر کیتھ مور نے جنینیاتی معلومات سے متعلق قرآن و حدیث سے حاصل شدہ مواد پر تقریباً 80 سوالوں کے جوابات دیے، قرآن و حدیث میں جنینیات کے حوالے سے موجود علم صرف جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ ہی نہ تھا بلکہ ڈاکٹر کیتھ مور نے اعتراف کیا کہ اگر تین عشرے قبل ان سے یہی سب سوالات کیے جاتے تو سائنسی معلومات کی عدم موجودگی کے باعث وہ ان میں سے آدھے سوالوں کے جوابات بالکل بھی نہیں دے سکتے تھے۔

1981ء میں دمام میں منعقدہ ساتویں طبی کانفرنس کے دوران ڈاکٹر مور نے بتایا'' میرے لیے نہایت خوشی کا مقام ہے کہ میں نے قرآن میں انسان کی نشوونما سے متعلق پیش کردہ نکات کی وضاحت کرنے میں مدد کی۔ اب مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ ساری معلومات محمد (ﷺ) تک

اللہ نے ہی ارسال کی ہیں کیونکہ کم و بیش یہ سارا علم کئی صدیوں بعد ہی دریافت کیا گیا تھا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) بلا شبہ اللہ کے رسول ہی تھے۔"

قبل ازیں ڈاکٹر کیتھ مور ایک کتاب "دی ڈیویلپنگ ہیومین" لکھ چکے تھے۔قرآن پاک سے نئی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے 1982ء میں اسی کتاب کا تیسرا ایڈیشن مرتب کیا۔اس ایڈیشن کو عالمی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس نے بہترین طبی کتاب کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ جو دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد میڈیکل کی تعلیم کے پہلے سال میں اک نصابی کتاب کے طور پر بھی پڑھائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر جو سمپسن، بیلر کالج آف میڈیسن، ہیوسٹن (امریکہ) میں شعبہ حمل و زچگی کے سربراہ ہیں۔ان کا کہنا ہے "یہ احادیث، محمد (ﷺ) کی کہی ہوئی باتیں، کسی بھی طرح مصنف کے زمانے میں دستیاب سائنسی معلومات کی بنیاد پر پیش نہیں کی جا سکتی تھیں، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ جینیات اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ مذہب اس طرح سے سائنس کی رہنمائی کر سکتا ہے کہ روایتی سائنسی اندازِ نظر میں کچھ الہامی انکشافات بھی شامل کرتا چلا جائے۔ قرآن میں ایسے بیانات موجود ہیں جن کی تائید کئی سو سال بعد ہوئی۔ جس سے اس امر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں دیا گیا علم واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہے۔"

ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے مابین سے نکلنے والا قطرہ:

﴿فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝﴾

(القرآن: سورۃ ۸۶، آیات ۵ تا ۷)

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

مختلف مراحل جنینین میں مردانہ و زنانہ تولیدی اعضاء یعنی فوطے اور بیضہ دانی گردوں کے پاس سے ریڑھ کی ہڈی اور گیارہویں بارہویں پسلیوں کے درمیان سے ظہور پذیر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ کچھ نیچے اتر کر، زنانہ تولیدی غدود یعنی بیضہ دانیاں پیڑو میں رک جاتے ہیں جب کہ مردانہ اعضائے تولید خصیہ دانی تک پہنچتے ہیں۔حتیٰ کہ بلوغت میں بھی جب

کہ تولیدی غدود کے نیچے اترنے کا عمل رک چکا ہوتا ہے ان غدود میں بڑی شریان کے ذریعے خون کی رسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ لمفی نکاس اور خون کا وریدی بہاؤ بھی اس طرف رواں ہوتا ہے۔

نطفہ مائع کا معمولی سا قطرہ:

قرآن کریم میں کم از کم گیارہ مرتبہ کہا گیا ہے کہ انسان کو ''نطفہ'' سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا مطلب مائع کی نہایت معمولی مقدار یا پیالہ خالی ہو جانے کے بعد اس میں بچ جانے والا مائع ہے۔ یہ بات قرآن شریف کی کئی آیات مبارکہ میں وارد ہوئی ہے جن میں سورۃ ۲۲ آیت ۵ اور سورۃ ۲۳، آیت ۱۳ شامل ہیں سائنس نے حال ہی میں دریافت کیا۔ کہ بیضے میں حمل ٹھہرانے کے لیے اوسطاً تیس لاکھ خلیات نطفہ (Sperms) میں سے صرف ایک کافی ہے۔ یعنی خارج ہونے والے نطفے کی مقدار کا تیس لاکھواں حصہ یا 0،00003 فیصد مقدار ہی (حمل ٹھہرانے) کے لیے کافی ہوتی ہے۔

''سُلٰلَة'' جوہرِ مائع:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۲، آیت ۸)

''پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔''

عربی لفظ سُلٰلَةٌ سے مراد کسی مائع کا بہترین حصہ، خلاصہ یا جوہر ہے۔ اب ہم جان چکے ہیں زنانہ بیضے کی بارآوری کے لیے مرد سے خارج ہونے والے لاکھ کروڑوں خلیاتِ نطفہ میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں سے اسی ایک خلیہ نطفہ کو قرآنِ پاک نے ''سُلٰلة'' کہا ہے۔ اب ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ عورت میں پیدا شدہ ہزاروں بیضوں (Ovam) میں سے صرف ایک ہی بارآور ہوتا ہے۔ ان ہزاروں بیضوں میں سے اسی ایک بیضے کے لیے (جو بارآور ہوتا ہے) قرآنِ پاک نے ''سُلٰلة'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا ایک اور مفہوم کسی مائع سے (کسی چیز کا) بڑی احتیاط سے اخراج بھی ہے۔ اس مائع سے مراد زنانہ اور مردانہ، دونوں طرح کے تولیدی مائعات بھی ہیں جن میں صنفی تخم (Gametes) موجود ہوتے ہیں۔ بارآوری کے مرحلے کے دوران نطفہ خلیہ اور بیضہ دونوں ہی اپنے اپنے ماحول سے بہ احتیاط جدا ہوتے ہیں۔

نطفۃِ امشاج ...... باہم ملے ہوئے مائعات:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

عربی لفظ "نطفۃ امشاج" سے مراد ملاپ شدہ مائعات" ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ملے ہوئے مائعات سے مراد عورت یا مرد کے ایجنٹ یا مائعات ہیں مردانہ اور زنانہ صنفی تخم کے باہم ملاپ کے بعد بننے والا جفتہ بھی آغاز میں نطفہ ہی ہوتا ہے (ہم آمیز مائعات سے ایک اور مطلب وہ مائع بھی ممکن ہے جس میں خلیاتِ نطفہ تیر رہے ہوتے ہیں۔ یہ مائع کئی طرح کی جسمانی رطوبتوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے جو کئی جسمانی غدود سے خروج ہوتی ہیں۔

لہٰذا، "نطفۃِ امشاج" یعنی آپس میں ملاپ شدہ مائعات کے ذریعے مردانہ وزنانہ تولیدی مائع اور اس کے اردگرد مائعات کے کچھ حصے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

جنس کا تعین:

مکمل جنین کی جنس کا تعین خلوی نطفے سے ہوتا ہے نہ کی بیضہ سے۔ مطلب یہ کہ رحم مادر میں ٹھہرنے والے حمل سے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی اس کا انحصار کروموسوم کے 23ویں جوڑے میں XX,XY کروموسومز کی موجودگی سے ہوتا ہے آغاز میں جنس کا تعین بار آوری کے موقع ہی پر ہو جاتا ہے اور اس کا انحصار خلوی نطفے کے صنفی کروموسوم پر ہوتا ہے جو بیضے کو بار آور کرتا ہے۔ اگر بیضے کو زرخیز کرنے والے نطفے میں X صنفی کروموسوم ہے تو ٹھہرنے والے حمل سے لڑکی پیدا ہوگی۔ اس کے برعکس نطفے میں صنفی کروموسوم Y ہے تو حمل کے نتیجے میں لڑکا پیدا ہوگا۔

﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ ﴾ (القرآن: سورۃ ۵۳، آیات ۴۵ تا ۴۶)

"اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔"

یہاں عربی لفظ نطفہ سے مراد تو مائع کی نہایت قلیل مقدار ہے جب کہ "تمنی" کا مطلب شدت سے ہونے والا اخراج یا پودے کی طرح بوئی گئی کوئی شے ہے۔ لہٰذا نطفہ بطور خاص (Sprum) ہی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ شدت سے خارج ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی o ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی o فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی﴾

(القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳۷، ۳۹)

"کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔"

ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں ایک بار پھر یہ بتایا گیا ہے کہ نہایت قلیل مقدار (قطرے) پر مشتمل مادۂ تولید (جس کے لیے یہاں "نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ" کے الفاظ استعمال ہوئے رحم مادر میں بچے کی جنس کے تعین کا ذمہ دار ہے۔ برصغیر میں یہ افسوسناک رواج ہے کہ عام طور پر ساس کو پوتوں کا ارمان ہوتا ہے۔ اگر بہو کے ہاں لڑکوں کے بجائے لڑکیاں ہو رہی ہوں تو وہ انہیں "اولادِ نرینہ" پیدا نہ کر سکنے پر طعنے دیتی ہیں۔ اگر انہیں صرف یہی پتا چل جاتا کہ اولاد کی جنس کے تعین میں عورت کے بیضے کا کوئی کردار نہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری مردانہ نطفے پر عائد ہوتی ہے۔ تو وہ اپنی بہوؤں کے بجائے اپنے بیٹوں کو طعنے دیں۔ قرآنِ پاک اور جدید سائنس دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ بچے کی جنس کے تعین میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے، عورت اس میں بے قصور ہے۔

تین تاریک پردوں کی حفاظت میں رکھا گیا بطن:

﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۶)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ اور وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو۔''

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور، قرآنِ پاک میں تاریکی کے تین پردوں کے تذکرے کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

(الف) شکمِ مادر کا پردہ۔

(ب) رحمِ مادر کا پردہ۔

(ج) غلافِ جنین اور اس کے گرد لپٹی ہوئی جھلی۔

جنینی (ایمبریانک) مراحل:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۳، آیات ۱۲ تا ۱۴)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا

کاریگر۔"

ان آیات مقدسہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو مائع کی نہایت قلیل مقدار سے تخلیق کیا گیا ہے جسے سکون والی جگہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جو وہاں مضبوطی سے چمٹا رہتا ہے۔ اور اسی کے لیے قرآن کریم میں "قرارِ مکین" کی عبارت وارد ہوئی ہے۔ رحم مادر کے پچھلے حصے کو ریڑھ کی ہڈی اور پشت کے پٹھوں کی بدولت کافی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ جینز کو مزید تحفظ جنینی تھیلی فراہم کرتی ہے جو جنینی مائع سے بھرپور ہوتی ہے۔ گویا کہ رحم مادر ایک ایسی "جائے قرار" ہے جسے بخوبی فراہم کیا گیا ہے۔

مذکورہ قلیل مائع "علقۃ" کی شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک ایسی شکل میں جو حامل ہو "چمٹ جانے" کی صلاحیت کا۔ اس سے مراد جونک جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ یہ توضیحات سائنسی اعتبار سے قابل قبول ہیں، کیونکہ بالکل شروع کے مراحل میں جنین واقعتاً رحم مادر کی دیوار سے چمٹ جاتا ہے جب کہ اس کی ظاہری حالت بھی کسی جونک سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کا طرزِ عمل بھی جونک ہی جیسا ہوتا ہے، کیونکہ یہ آنول نال کے راستے اپنی ماں کے جسم سے خون حاصل کرتا ہے۔

علقۃ کا تیسرا مطلب "خون کا لوتھڑا" ہے۔ اس "علقۃ" والے مرحلے میں جو حمل ٹھہرنے کے تیسرے اور چوتھے ہفتے پر محیط ہوتا ہے، بند رگوں کے اندر خون جمنے لگتا ہے۔ لہٰذا جنین کی شکل صرف جونک جیسی ہی نہیں رہتی بلکہ وہ خون کے لوتھڑے جیسا بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اب قرآن پاک کی فراہم کردہ معلومات، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد سائنس کی حاصل کردہ جدید معلومات کا موازنہ کرتے ہیں۔

1677 میں ہیم اور لیون ہاک وہ دو اولین سائنسدان تھے، جنہوں نے خردبین سے انسانی خلیات نطفہ کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے مطابق نطفے کے ہر خلیے میں ایک چھوٹا سا انسان موجود ہوتا ہے جو رحم مادر میں پروان چڑھتا ہے اور ایک نوزائیدہ بچے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریے کو "پرفوریشن تھیوری" بھی کہا جاتا تھا۔ بعدازاں جب سائنس والوں نے یہ دریافت کیا کہ (عورت کا) بیضہ، نطفے کے خلیے سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے تو مشہور ماہر ڈی گراف سمیت کئی سائنس والوں نے یہ سمجھا کہ بیضے کے اندر ہی انسانی وجود نہایت چھوٹی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کے طویل عرصے بعد، اٹھارہویں صدی عیسوی میں ماپئیشس نامی سائنسدان نے اس نظریے کی تشہیر کرنا شروع کی کہ کوئی بچہ اپنے ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ وراثت ہوتا ہے۔

علقۃ تبدیل ہوتا ہے اور "مضغۃ" کی شکل میں آتا ہے، جس کا مطلب ہے ایسی کوئی چیز

جسے چبایا گیا ہو اور کوئی ایسی چیز ہو جو (لیس دار) اور حقیر ہو یعنی جسے چیونگم کی طرح منہ میں رکھا جا سکتا ہو۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے صحیح ہیں۔ پروفیسر کیتھ مور نے پلاسٹوسین کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ابتدائی مرحلے والے جنین کی شکل دی اور دانتوں سے چبا کر ''مضغہ'' میں تبدیل کیا۔ پھر انہوں نے اس مضغہ کی ساخت کا موازنہ ابتدائی جنین کی تصاویر سے کیا۔ اس پر موجود، دانتوں کے نشانات انسانی مضغہ پر پڑنے ریڑھ کی ہڈی کی ابتدائی شکل سے مشابہہ تھے دوسرے مرحلے میں یہ مضغہ تبدیل ہو کر ہڈیوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ان ہڈیوں کے گرد کا غلاف ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے ایک نئی مخلوق کی شکل دیتا ہے۔

پروفیسر مارشل جونس جو فلاڈلفیا میں واقع تھومس جیفرسن یونیورسٹی میں اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ اور ڈینیئل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں اس نے جنینیات کے حوالے سے آیات قرآنی پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ متعدد جنینی مرحلوں کو بیان کرنے والی قرآنی آیات کسی بھی طرح سے ہو سکتیں ،اور ممکن ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس بہت ہی طاقتور خردبین موجود ہو جب انہیں یہ یاد دلایا گیا کہ قرآن پاک کا نزول 1400 سال پہلے ہوا تھا اور دنیا کی اولین خردبین بھی حضرت محمد (ﷺ) کے سینکڑوں سال بعد ایجاد ہوئی تھی ،تو پروفیسر جونس مسکرائے اور اعتراف کیا کہ ایجاد ہونے والی اولین خردبین بھی دس گنا سے زیادہ بڑی شبیہ دکھا نہیں سکتی تھی اور اس کی مدد سے واضح منظر بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: ''سر دست مجھے اس تصور میں کوئی تنازعہ دکھائی نہیں دیتا کہ جب محمد (ﷺ) نے قرآن پاک کی آیات پڑھیں تو اس وقت یقیناً کوئی (الہامی) قوت بھی ساتھ میں کارفرما تھی۔''

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جنینی نشوونما کے مراحل کی وہ درجہ بندی جو آج رائج العالم ہے سمجھ میں آسانی سے آنے والی نہیں ہے کیونکہ اس میں ہر مرحلے کو ایک عدد کے ذریعے شناخت کیا گیا ہے۔ دوسری جانب قرآن پاک نے جنینی مراحل کی جو تقسیم بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد جداگانہ اور بہ آسانی شناخت ہونے کے قابل ساختوں پر ہے۔ ایسے مراحل جن سے کوئی جنین ترتیب وار انداز میں گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ساختیں قبل از ولادت نشوونما کے مختلف مراحل کی علمبرداری کرتی ہیں اور ایسی سائنسی وضاحتیں فراہم کرتی ہیں جو نہایت عمدہ اور قابل فہم ہونے کے علاوہ عملی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ رحم مادر میں انسانی جنین کی نشوونما کے مختلف مراحل درج ذیل آیات مبارکہ میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ

○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ○ ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳۷ تا ۳۹)

"کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔"

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ○ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۲، آیات ۷ تا ۸)

"جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔"

جزوی مکمل و جزوی نامکمل جنین:

مضغہ کے مرحلے پر جنین کو درمیان سے کاٹنے اور اس کے اندرونی حصوں کا مطالعہ کرنے سے واضح طور پر نظر آئے گا کہ بیشتر اندرونی اعضاء پوری طرح بن چکے ہیں جب کہ بقیہ اعضا زیر تکمیل پروفیسر جونس کا کہنا ہے کہ اگر ہم پورے جنین کو ایک مکمل وجود کے طور پر بیان کریں تو ہم فقط ایسے حصے کی بات کر رہے ہوں گے جو پہلے سے مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگر ہم اسے نامکمل وجود کہیں تو پھر ہم جنین کے ان حصوں کا ذکر کر رہے ہوں گے جو تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس موقع پر جنین کو کیا کہنا چاہیے: مکمل وجود یا نامکمل وجود؟ جنینی نشوونما کے اس مرحلے کی جو وضاحت قرآن پاک نے ہمیں دی ہے، اس سے بہتر کوئی اور توضیح ممکن نہیں۔ قرآن پاک اس مرحلے کو "نیم مکمل اور نیم نامکمل" قرار دیتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ فرمائیے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۲ آیت ۵)

”لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔“

سائنسی تناظر میں معلوم ہوتا ہے کہ جنینی افزائش کے شروع کے مراحل میں کچھ خلیات جدا گانہ وجود اختیار کر لیتے ہیں جبکہ باقی کی جداگانہ حیثیت نہیں ہوتی گویا کچھ اعضا تشکیل شدہ اور کچھ زیر تشکیل ہوتے ہیں۔

حس سماعت و بینائی:

رحم مادر میں نشو و نما پانے والے انسانی وجود میں سب سے پہلے سماعت کی حس پیدا ہوتی ہے۔ 24 ہفتوں بعد کا پختہ جنین آوازیں سن سکتا ہے بعد ازاں حمل کے 28 ویں ہفتے تک حس بینائی پیدا ہوتی ہے اور پردۂ چشم روشنی کے لیے حساس ہو جاتا ہے۔ ان مراحل کو قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ الْاَ فْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۲ آیت ۹)

”پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔“

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا﴾ (القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲)

”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔“

﴿وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۷۸)

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں دیکھنے اور سننے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔“

قرآن کریم کی آیات مقدسہ میں حس سماعت کا ذکر حسِ بینائی سے قبل آیا ہے گویا قرآن مجید کی توضیحات جدید جنینیاتی دریافتوں سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہے۔

باب دوازدھم

عمومی سائنس

نشاناتِ انگشت:

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ○﴾ (القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳ تا ۴)

"کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔"

کفار اور ملحدین کا یہ اعتراض ہے کہ مرجانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد جب کسی شخص کی ہڈیاں تک خاک کا پیوند ہو جاتی ہیں، تو قیامت کے روز اُس کے جسم کا ایک ایک ذرہ دوبارہ یکجا ہو کر پہلے والی (زندہ) حالت میں کس طرح واپس آ سکتا ہے نیز اگر ایسا ہو بھی گیا تو روزِ محشر اس شخص کی ٹھیک ٹھیک شناخت کس طرح ہو گی؟ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں اسی اعتراض کا بہت واضح جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ صرف اسی پر قدرت نہیں رکھتا کہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو واپس اکٹھا کر دے۔ بلکہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ ہماری انگلیوں کی پور تک کو دوبارہ سے پہلے والی حالت میں ٹھیک ٹھیک طور پر لے آئے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ پاک انسانوں کی انفرادی شناخت کی بات کر رہا ہے تو "انگلیوں کی پوروں" کا خصوصیت سے تذکرہ کیوں کر رہا ہے؟ سر فرانسس گالٹ کی تحقیق کے بعد 1880 میں نشاناتِ انگشت کو شناخت کے سائنسی طریقے کا درجہ حاصل ہوا۔ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی سے بھی دو افراد کی انگلیوں کے نشانات کا نمونہ بالکل ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں افراد کا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں مجرموں کی شناخت کے لیے ان کے فنگر پرنٹس ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔

کوئی بتائے کہ آج سے 1400 سال پہلے کسی کو نشانات انگشت کی انفرادیت کے بارے میں علم تھا؟ یقیناً یہ علم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

جلد میں حسِ درد:

کبھی دماغ کو محسوسات اور درد وغیرہ کا ماخذ سمجھا جاتا تھا لیکن حال کی دریافتوں نے بتایا ہے کہ درد کو محسوس کرنے والے ماخذ یا خلیئے جلد میں ہوتے ہیں جن کی عدم موجودگی سے انسان درد محسوس نہیں کر سکتا۔

کوئی ڈاکٹر کسی مریض میں جلنے کے باعث پڑنے والے زخموں کا معائنہ کرتا ہے تو وہ جلنے کی (شدت) معلوم کرنے کے لیے سوئی چبھو کر دیکھتا ہے۔ اگر سوئی چبھنے سے متاثرہ شخص کو درد محسوس ہوتا ہے تو ڈاکٹر کو اس پر خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلنے کا زخم صرف بیرونی حد تک ہے اور درد محسوس کرنے والے خلیات بچ گئے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر متاثرہ شخص کو سوئی چبھنے پر درد محسوس نہ ہو تو تشویشناک امر مانا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ جلنے سے بننے والے زخم کی گہرائی زیادہ ہے اور درد کے خلیات بھی مردہ ہو چکے ہیں۔

درج ذیل آیت مقدس میں قرآن پاک نے خاصے واضح الفاظ میں درد کے خلیوں کی موجودگی کے بارے میں بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِـيْمًا ﴾

(القرآن: سورۃ ۴، آیت ۵۶)

”جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔“

تھائی لینڈ کی چیانگ مائی یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تیگاتات تیجاسن نے درد کے خلیات پر تحقیق میں کافی وقت گزارا ہے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ

قرآنِ پاک نے 1400 سال پہلے اس سائنسی حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا، تاہم جب انہوں نے مذکورہ آیتِ قرآنی کے ترجمے کی باقاعدہ تصدیق کر لی تو وہ قرآن پاک کی سائنسی درستگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں منعقدہ آٹھویں سعودی طبی کانفرنس جس کا موضوع قرآنِ پاک اور سنت میں سائنسی نشانیاں تھا کے موقع پر انہوں نے بھرے مجمع میں فخر کے ساتھ کہا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه محمد الرسول اللّٰه۔

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں''

اور وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

باب سیزدھم

اختتامیہ

قرآن کریم میں سائنسی حقائق کو اتفاقیہ قرار دینا انسانی عقل سلیم اور درست سائنسی زاویے کے برخلاف ہوگا۔ دراصل قرآنی آیات مقدسہ قرآن پاک کی سائنسی درستگی کا واشگاف اعلان ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۚ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ (القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔“

قرآن پاک تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کریں۔

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (القرآن: سورۃ ۳، آیت ۱۹۰)

”زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔“

قرآن پاک میں موجود سائنسی شواہد واشگاف انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ یہ واقعی

الہامی ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو اس قدر اہم اور درست سائنسی حقائق پر مبنی کوئی کتاب لکھ سکتا۔

تاہم قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ''نشانیوں'' (Signs) کی کتاب ہے جو انسان کو اس کے وجود کی غرض و مقاصد کا احساس کرنے اور فطرت سے مطابقت اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ کائنات کے مالک کا کلام جو کائنات کا خالق مالک اور چلانے والا ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی جو تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام نے کی۔ وہ پیغام قرآن کریم میں ہے۔

قرآن اور جدید سائنس کے موضوع پر کثیر تفصیلی علمی مواد تحریر کیا گیا ہے اور اس میدان میں تحقیق ہر وقت جاری ہے۔ انشاء اللہ یہ تحقیق بھی بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کے کلام سے نزدیک لانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس مختصر کتاب میں قرآن پاک کے پیش کردہ صرف چند سائنسی حقائق اکٹھے کیے گئے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

پروفیسر تیجاسان نے قرآن پاک میں بیان کی گئی صرف ایک سائنسی نشانی کی مضبوطی کے باعث اسلام قبول کیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو دس اور بعض کو 100 سائنسی نشانیوں کی ضرورت ہو، تاکہ وہ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کر سکیں، کچھ لوگ شاید ایسے ہوں جو ہزار نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود بھی سچائی کو تسلیم کرنا نہ چاہتے ہوں۔ قرآن پاک نے ایسی تنگ نظری کی درج ذیل آیت مقدسہ میں مذمت فرمائی ہے:

﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۲، آیت ۱۸)

''بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔''

قرآن پاک انفرادی زندگی اور اجتماعی معاشرت، سب کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔ شکر خدا کا قرآن پاک ہمیں زندگی گزارنے کا وہ طریقہ بتاتا ہے جو ان تمام نظریات سے بدتر ہے جو جدید انسان نے محض اپنی کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایجاد کیے ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خالق سے بہتر کوئی اور رہنمائی کر سکے؟ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر جستجو کو قبول فرمائے۔ ہم پر رحم فرماتے ہوئے ہمیں سیدھا راستہ دکھائے۔ (آمین)

خطبات ذاکر نائیک

ڈاکٹر ذاکر نائیک کے شہرۂ آفاق مناظرے
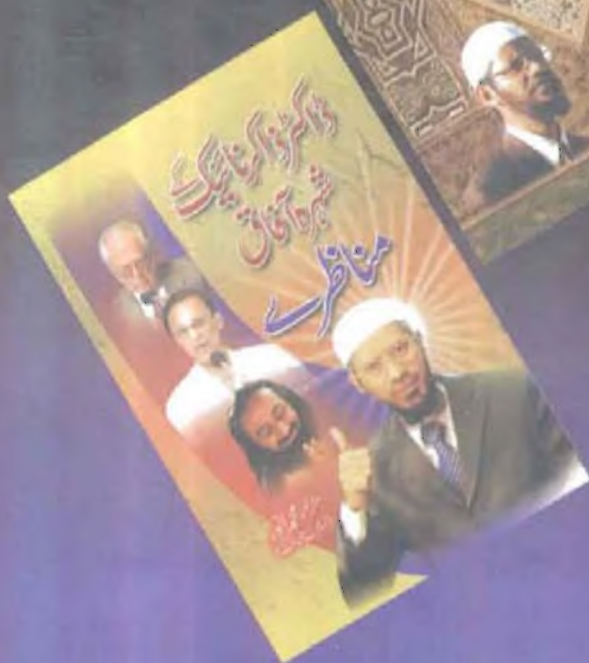
اسلامک ریسرچ

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ

0333-4380927